مُطالعۂ

مکاتیبِ اقبالؒ

ڈاکٹر محمد امین اندرابی

تابش پبلی کیشنز سرینگر کشمیر

مُطالعۂ

مکاتیبِ اقبال

ڈاکٹر محمد امین اندرابی

تابش پبلی کیشنز سری نگر

جملہ حقوق محفوظ

بارِ اوّل ـــــ دسمبر ۱۹۹۱ء

تعداد ـــــ چھ سو

قیمت ـــــ ۱۸۰ روپے

خطّاط ـــــ قاضی محمد حسین

مطبع ـــــ شالیمار آرٹ پریس سرینگر

ناشر ـــــ سیّد مجتبیٰ علی احمد اندرابی

تابش پبلی کیشنز، اندرابی وِلا نزدِ ڈاکخانہ راجباغ
سرینگر کشمیر

اِنتساب

اپنے مرحوم و مغفور والدِ ماجد کے نام:

یاد سے تیری دلِ دردآشنا معمور ہے

اور

اپنی والدہ محترمہ کے نام:

اگر سیاہ دلم داغِ لالہ زارِ تو ام
وگر کشادہ جبینم، گُلِ بہارِ تو ام

فہرست

• پیش لفظ	۷
• اردو میں خطوط کی روایت	۱۳
• اقبال کی شخصیت کے سلسلے میں خطوط کی اہمیت	۶۲
• کلامِ اقبال ــــ خطوط کی روشنی میں	۱۱۲
• فکرِ اقبال ــــ خطوط کی روشنی میں	۱۳۷
• اقبال کے چند مخصوص مکتوب الیہم	۲۵۲
• مکاتیبِ اقبال کا اسلوب	۳۱۷
• ضمیمے	
ا ــــ نو دریافت خطوط	۳۳۳
ب ــــ کتبِ اقبال	۳۶۲
• کتابیات	۳۶۸

پیش لفظ

اقبال کی شاعری پر اب تک بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اُن کی فکر، اُن کے فلسفے اور اُن کے مختلف نظریات و تصورات کے بارے میں بالعموم ان کی شاعری ہی کے حوالے سے بات کی گئی ہے اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا اس لئے کہ اقبال بنیادی طور پر شاعر تھے اور اپنے نظریات و خیالات کے اظہار کے لیے انہوں نے شاعری ہی کا وسیلہ اختیار کیا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے نثری تحریرات کا ایک خاصا اہم اور وقیع ذخیرہ بھی یادگار چھوڑا ہے جس کی طرف ابھی تک مناسب توجہ نہیں ہوئی ہے۔ ان نثری تحریروں میں تقریباً تیرہ سو مکاتیب کا ذخیرہ اپنی کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے بہت ہی اہم ہے۔ مکاتیب کا یہ ذخیرہ اقبال کی شخصیت، اُن کے فن اور اُن کی فکر کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے مطالعے سے جہاں اقبال کی شخصیت کے کئی گوشے تابناک ہوجاتے ہیں، وہاں یہ مطالعہ ان کے کلام اور افکار کی کئی گتھیوں کو بھی سلجھا دیتا ہے۔ اقبال نے سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں اپنے دل و دماغ کی سرگذشت قلمبند کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور اس سرگذشت کو وہ اپنے کلام اور فکر کی تفہیم کے لیے نہایت ضروری سمجھتے تھے لیکن کئی اور قابلِ قدر منصوبوں کی طرح اقبال کا یہ منصوبہ کبھی ارادے کی حدوں سے آگے نہ بڑھ پایا۔ تاہم دیکھا جائے تو یہی بہت حد تک ان

کے مکاتیب سے پوری ہو جاتی ہے۔

زیرِ نظر مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں چند نمائندہ شاعروں اور ادیبوں کے خطوط کے حوالے سے اردو زبان میں مکتوب نگاری کی روایت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں اردو خطوط نویسی کی تاریخ بیان کرنا مقصد نہیں تھا، البتہ اردو کے مکاتیبی ادب کا ایک مختصر جائزہ لینا مقصود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے مکاتیب سے قصداً اغماض برتا گیا ہے کہ ان سے مکاتیب کی وہ روایت جس کی بنیاد غالب کے ہاتھوں پڑی تھی، آگے نہیں بڑھتی۔

دوسرے باب میں اقبال کی شخصیت کے وہ نقوش اور ان کی زندگی کے وہ واقعات ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے جو مکاتیب کا مطالعہ کئے بغیر یا تو دھندلے ہی رہتے یا پھر بالکل ہی آنکھوں سے اوجھل رہتے۔ یہاں البتہ اس بات کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ ان خطوط کے باوجود بھی حیاتِ اقبال سے متعلق وہ مسائل جو ہنوز تحقیق طلب ہیں، حل نہیں ہوتے۔ اسی باب میں اقبال کے ان خطوط کا جائزہ بھی لیا گیا ہے جو انہوں نے عطیہ بیگم فیضی اور مس ایما ویگیناسٹ کے نام لکھے ہیں۔ ان خطوط کے مطالعے میں قیاسی گھوڑے دوڑانے سے پرہیز کرتے ہوئے ان خطوط کی زبان اور لب و لہجے اور اقبال کی مجموعی شخصیت کے تناظر میں متوازن بات کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"کلامِ اقبال ــ خطوط کی روشنی میں"۔ یہ اس مقالے کے تیسرے باب کا عنوان ہے اور اس میں ایسے مکاتیب کو زیرِ بحث لایا گیا ہے جن میں اقبال نے اپنی تخلیقی کاوشوں کے بارے میں کچھ لکھا ہے یا پھر جن میں اقبال نے اپنے شعری نصب العین کی وضاحت کی ہے۔ ان خطوط کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ ان سے نہ صرف اقبال کی شاعری اور شاعری سے متعلق ان کے نظریئے کے کچھ اہم پہلو سامنے آتے ہیں بلکہ ان میں بعض اوقات کہیں واضح طور پر اور کہیں بین السطور کلامِ اقبال کی تفہیم کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ اس باب میں خطوط کی مدد سے اقبال کے تنقیدی نظریات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے اور اپنے دور کے ادبی اور تنقیدی نظریات کے بارے میں ان کے رویے سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اقبال کے کلام پر ان کی زندگی میں جو اعتراضات کئے گئے، انہوں نے ہمیشہ ان کے جواب مضامین کی صورت میں دیئے۔ تاہم

جہاں تک اسرار و رموز کا تعلق ہے ان کے بارے میں خاص طور پر جو اعتراضات سید سلیمان ندوی نے کئے اُن کا جواب اقبال نے سید صاحب کے نام اپنے خطوط میں دیا ہے۔ اس باب میں ان خطوط کی نشاندہی کی گئی ہے۔

فکرِ اقبال سے متعلق چوتھا باب اس مقالے کا طویل ترین باب ہے۔ اس باب میں فکرِ اقبال کے مختلف پہلوؤں سے مکاتیب کی روشنی میں بحث کی گئی ہے تاہم یہاں اس بات کی صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ بعض مسائل کے متعلق خطوط میں محض اشارے ملتے ہیں اور ان کی توضیح و تعبیر کے سلسلے میں ان کی شاعری اور ان کی دیگر نثری تحریروں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس باب میں اقبال کی مذہبی فکر اور سیاسی فکر کے ذیلی عنوانات خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔

پانچواں باب اقبال کے چند مخصوص مکتوب الیہم سے متعلق ہے۔ ان مکتوب الیہم کے نام لکھے گئے خطوط اپنی کیفیت اور کمیت، دونوں لحاظ سے خاصے اہم اور قابلِ توجہ ہیں۔

چھٹا اور آخری باب مکاتیبِ اقبال کے اسلوب سے متعلق ہے۔ گو خالص اسلوب کے لحاظ سے اقبال کے مکاتیب کی اہمیت غالب، شبلی، مولانا ابوالکلام آزاد یا رشید احمد صدیقی کے خطوں کے برابر نہیں تاہم اس باب میں ان کے خطوط کے اسلوب کا وہ رنگ نمایاں کیا گیا ہے جو اُن خطوط کی ایک بنیادی خصوصیت ہے اور وہ یہ کہ ان میں مدعا کا بے تکلف اظہار ہے۔ ان کے خطوط کا اسلوب سیدھا سادا، متین اور بے تکلف اسلوب ہے۔ اس اسلوب میں سنجیدگی اور استدلالی قوت پائی جاتی ہے۔ ان خطوط کی اہمیت اسلوب میں نہیں بلکہ ان میں پیش کئے گئے خیالات کی عظمت میں مضمر ہے۔ بایں ہمہ مولانا گرامی اور مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے علاوہ سید سلیمان ندوی اور نیاز الدین خان کے نام بعض خطوط میں اسلوب کی جو شادابی اور توانائی ملتی ہے، اُسے اُبھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مقالے کے آخر میں دو ضمیمے دیئے گئے ہیں۔ پہلا ضمیمہ نو دریافت خطوط کے عنوان سے دیا گیا ہے اس میں اقبال کے وہ ۳۴ خط شامل ہیں جو ابھی تک کسی مجموعے کی صورت میں شایع نہیں ہوئے ہیں۔ دوسرے ضمیمے میں اُن کتابوں اور رسایل کی فہرست دی گئی ہے جن کا ذکر کسی نہ کسی وجہ سے مکاتیب

میں آیا ہے۔

مقالے کے آخر میں جو کتابیات دی گئی ہے ان میں سے بیشتر کتابیں وہ ہیں جن سے میں نے براہِ راست اقتباسات دیئے ہیں۔ بہت سی کتابیں ایسی بھی ہیں جنھیں اس مقالے کی تیاری کے دوران میں، میں نے پڑھا اور اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔

یہ مقالہ آٹھ سال قبل ۱۹۸۳ء میں استاذ الاساتذہ محترم پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں لکھا گیا ہے۔ اس دوران میں بہت سے دوستوں اور بزرگوں نے اسے شایع کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ خاص طور پر میرے شفیق بزرگ اور برصغیر کے مقتدر ماہر اقبالیات محترم پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے کئی مرتبہ اس کی ترغیب بھی دی لیکن میں چاہتا تھا کہ اشاعت سے پہلے اس پر نظر ثانی کروں لیکن خواہش کے باوجود طبیعت اس پر مائل نہ ہو سکی اور پھر کچھ اس طرح کے علایق میں گرفتار رہا کہ اس کی فرصت بھی نصیب نہ ہوئی۔ چنانچہ مقالہ اسی صورت میں شایع ہو رہا ہے جس صورت میں اسے کشمیر یونیورسٹی میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کے لیے پیش کیا گیا تھا۔

میں محترم پروفیسر آل احمد سرور کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی نگرانی میں مجھ سے یہ کام کرایا۔ ان کے بے پایاں لطف و عنایات کا شکریہ ادا کرنا نہ ممکن ہے اور نہ آسان۔ ان کی صحبت میں گزرے ہوئے چند برس ایک متاعِ گراں بہا کی صورت میں ہمیشہ میرے ذہن میں تازہ رہیں گے۔

اس مقالے کی تیاری کے دوران میں مجھے مرحوم ڈاکٹر سید عالم خوندمیری اور پروفیسر مسعود حسین خان کی قربت اور ہم نشینی کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ دونوں حضرات اس زمانے میں یکے بعد دیگرے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں وزیٹنگ پروفیسروں کی حیثیت سے رہے اور اپنے فیوض سے یہاں کے طالبانِ علم کو بہرہ ور کرتے رہے۔

ڈاکٹر نصرت اندرابی کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ اس کی طبعِ نازک شکر و امتنان کی ثقالت کی متحمل نہیں ہو سکتی، تاہم اس حقیقت کے اعتراف میں تو کوئی مضائقہ نہیں کہ میری الجھی ہوئی اور بے ہنگم زندگی میں اگر کوئی سلیقہ ہے تو یہ اسی کے لطف و

محبت کے طفیل ہے۔ وہ ہر لحاظ سے میری نصف بہتر ہے اور میرے ہر کام میں شریک غالب۔

محمد امین اندرابی

سرینگر کشمیر
۵ ستمبر ۱۹۹۱ء

اُردو میں خطوط کی روایت

غالبؔ، حالیؔ، شبلیؔ، مہدی افادی اور ابوالکلام آزاد کے حوالے سے

اُردو میں مکتوب نویسی کی ابتدا انیسویں صدی میں ہوئی اور جس طرح اردو کے مصنفین نے ادب اور شاعری کی مختلف اصناف میں فارسی زبان و ادب کا سہارا لیا، اسی طرح مکتوب نویسی میں بھی انہوں نے فارسی مکاتیب کی ہی پیروی کی۔ فارسی زبان میں اس وقت تک مکاتیبی ادب کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا اور مکاتیب کے کئی مجموعے شائع ہو چکے تھے۔ ان مجموعوں میں سرکاری رقعات کے علاوہ صوفیوں، عالموں اور دوسرے لوگوں کے بہت سے نجی خطوط بھی شامل تھے، تاہم نجی خطوط کا انداز بھی وہی ہے جو سرکاری رقعات کا تھا، جو غالباً اس وجہ سے عام ہو گیا تھا کہ مکتبوں اور مدرسوں میں مکاتیب کے جو نمونے شاملِ نصاب تھے وہ عام طور پر سرکاری مکاتیب ہی تھے۔ اور اس طرح سے وہ ساری خوبیاں اور خامیاں جو سرکاری رقعات میں پائی جاتی تھیں، وہ نجی خطوط میں بھی در آئیں۔ مثلاً سرکاری مکاتیب میں رکھ رکھاؤ اور حفظ مراتب کا خاص خیال رکھا جاتا تھا چناں چہ نجی مکاتیب میں ان باتوں کا التزام ضروری سمجھا جاتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ سرکاری خط و کتابت محض ضرورت پر قائم تھی اور اکثر خط کا نفس مضمون نہایت مختصر ہوتا تھا، تاہم شاہی کاتب یا محرر دلچسپی پیدا کرنے کے لیے داد قابلیت دیتے تھے اور اس طرح خطوط ادبی جوہر دکھانے کے جولانگاہ بن گئے۔ اور ان میں وہ ساری باتیں پیدا ہو گئیں جو اس وقت کے ادب کی جان تھیں۔ اس طرح مکاتیب میں بھی تشبیہ و استعارہ کا

استعمال ہونے لگا اور عبارت مقفیٰ اور مسجع ہوگئی۔ القاب و آداب پر بھی اثر پڑا۔ سرکاری رقعات میں جس طرح مختلف مراتب اور مدارج رکھنے والوں کے لیے الگ الگ القاب و آداب مقرر تھے اسی طرح نجی خطوط میں بھی ہر رشتہ دار اور ہر حیثیت کے ملنے والے کے لیے جدا جدا القاب مقرر ہوئے۔ رقعات ابوالفضل، رقعات عالمگیری، انشاء خلیفہ، انشاء مادھو رام، بہار عجم وغیرہ فارسی مکاتیب کے وہ مجموعے ہیں جو ہندوستان میں تیار ہوئے اور جو عرصہ تک ہندوستان کی درسی کتابوں میں شامل رہے اور جب تک ہندوستان میں فارسی خطوط لکھے جاتے تھے ان کا رنگ صاف جھلکتا رہا اور جب اردو کا رواج ہوا تو اردو خطوط میں بھی انہی کی تقلید ہوئی۔

اس تقلید اور پیروی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشکل پسندی جو فارسی مکاتیب کی امتیازی خصوصیت تھی اردو مکتوب نگاری کا بھی جزو بن گئی۔ صنائع و بدائع کی کثرت، مقفیٰ و مسجع عبارتوں کی بہتات، تشبیہوں اور استعاروں کی بھرمار اور آداب و القاب کی طوالت یہ ساری باتیں من و عن فارسی سے اردو میں منتقل ہوگئیں۔ چنانچہ اردو مکاتیب کے ابتدائی مجموعے، انشاء خرد افروز، مکتوبات احمدی و محمدی، رقعات عنایت علی، انشاء سرور وغیرہ میں اسی انداز کے خطوط ملتے ہیں۔ خود غالب کے زمانے میں جس نے اردو کے مکاتیبی ادب کی دنیا میں انقلاب پیدا کیا، اسی قسم کے خطوط لکھے جاتے تھے۔ غلام امام شہید اور غلام غوث بے خبر جو نہ صرف یہ کہ غالب کے ہم عصر تھے بلکہ ان کے قریبی دوستوں میں تھے، ان کے خطوں میں بھی یہی اسلوب نظر آتا ہے اور بقول پروفیسر خورشید الاسلام "یہ مکاتیب نہیں ہیں معمات ہیں"۔ مولوی غلام امام شہید کے ایک مکتوب سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:-

"مجموعہ انشاء شیریں زبانی، دیباچہ کتاب سخن معانی زاد حشمتہ، عام التشریح مراتب اشتیاق و آرزومندی کے تعزیت کے مضمون سے آنسو بھی بہاتا ہے اور کچھ خوشی میں آ کر مبارکباد کا مضمون بھی زبان پر لاتا ہے۔ زمانہ میں خوشی و غم دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور دنیا میں دھوپ چھاؤں کی طرح شادی کے

ہاتھ میں ماتم کا ہاتھ ہے..... تقدیر نے صبح کو اگر لباس سفید خوشی کا پہنایا تو شام کے واسطے جامۂ سیاہ ماتمی بنایا۔ حاصل یہ کہ آپ کے والد ماجد نے عین عید کے دن انتقال فرمایا۔ گویا اسی گردش لیل و نہار نے خزاں و بہار کا تماشا دکھایا.....

اور اس غم نے جتنا رلایا تھا۔ آپ کی شادی نے اتنا ہی ہنسایا۔ اس افسوس میں آسمان جو ماتمی لباس پہنے نظر آیا تو شفق کی سرخی نے وہی خوشی کا رنگ بھی دکھایا۔ رنج میں دو ہتڑ جو پہلے منہ پر مارا، تو پھر خوشی میں وہی دونوں ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگی کہ خدا اس مرحوم کو جنت نصیب کرے اور آپ سلامت رہیں۔ اور یہ شادی مبارک ہو۔ بندہ بھی ادائے رسم فاتحہ خوانی و شرکت محفل شادمانی کے واسطے ضرور حاضر ہوگا۔ زیادہ سلام"

اس خط سے بہت سے جملے چھوڑ دیئے گئے، لیکن اس کے باوجود بھی نفس مطلب میں فرق نہیں آتا، یہی اس دور کے خطوط کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ اس خط میں مکتوب الیہ کی شادی پر اظہار مسرت کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس کے والد کے فوت ہو جانے پر تعزیت کا اظہار کیا گیا ہے لیکن نہ تعزیت کے اظہار میں خلوص ہے اور نہ ہی مسرت کے اظہار میں۔ دونوں طرح کے جذبات کا اظہار طول کلام، عبارت کی رنگینی، قافیہ پیمائی اور تشبیہ و استعارہ کی فراوانی کی نذر ہو کے رہ گیا ہے۔

غالب کے زمانہ میں پڑھے لکھے لوگ فارسی ہی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ خود غالب بھی ساری عمر فارسی ہی میں لکھتے رہے۔ اردو میں خط لکھنا انہوں نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں شروع کیا۔ مولانا حالی نے یادگار غالب میں ۱۸۵۰ء کو اردو خط و کتابت کا آغاز قرار دیا ہے رہا یہ سوال کہ غالب فارسی کی بجائے اردو میں خط لکھنے کی طرف کیوں مائل ہوئے اس ضمن میں حالی نے خود غالب کے ایک خط کا حوالہ دیکر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ فارسی خطوط میں غالب کو بہت کاوش کرنا پڑتی تھی، آخر میں جب تصنیف و تالیف کا بار بھی ان پر پڑا، تو انہوں نے مجبوراً فارسی چھوڑ کر اردو میں خط لکھے لیکن اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ غالب کا خلاق ذہن تنگنائے غزل کا پہلے ہی سے شاکی تھا اور وہ اپنے بیان میں وسعت کا طالب تھا، چنانچہ اس نے اپنے اظہار اور

انکشاف کے لیے مختلف پیرائے اختیار کیے۔ فارسی میں ان کے علم وفضل اور اردو میں ان کے تخلیقی جوہر کی نمود ہوئی اور غالب کا ادبی کردار ان سب کے امتزاج سے ملتا ہے اور اس کردار کی پہچان کے لیے محض ان کی شاعری کا مطالعہ ہی کافی نہ ہوگا بلکہ ان کی نثر کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا۔ غالب کی شخصیت بڑی پیچیدہ، تہہ دار اور پہلو دار ہے اور اس کے علاوہ غالب ایک ایسے دور کی علامت بھی ہیں "جس میں اندھیرے اور اجالے ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے اور یاس کی پرچھائیاں دور کی پرچھائیوں کو پے بہ پے کاٹ رہی تھیں"[1] غرض اس شکست وریخت کے دور میں جس میں شکست کا عمل ریخت کے مقابلے میں بہت زیادہ تیز تھا، غالب کے عظیم ذہن نے مثبت اثرات قبول کیے۔ اور متضاد اور متصادم فضا میں بھی اپنے تخلیقی جوہر کی آبیاری کی۔ اس متضاد اور متصادم فضا کی جھلکیاں ان کی شاعری میں مبہم اور ان کے خطوط میں مبرہن نظر آتی ہیں۔ یہی بات ان کے خطوط کو لازوال بنا دیتی ہے اور اسی میں ان کی دل کشی کا راز بھی ہے۔ ان خطوط میں "وہ آباد خرابے ہیں جس میں غالب نے زندگی کرنے کا ہنر سکھایا۔ یہاں ہمیں وہ دنیا ملتی ہے جہاں محض قرطاس وقلم کاتب و مکتوب الیہ صرف مطلب اور احوال دیگر نہیں ہے۔ یہاں زندگی کی ہماہمی اور اس کے مرگ آسا نالے ہیں۔ چلتے پھرتے لڑتے جھگڑتے ہنستے بولتے لوگ ہیں۔ رنگارنگ بزم آرائیاں اور بجھتی ہوئی شمعوں کے آنسو ہیں۔ دوستوں کی وفاداری اور دشمنوں کی دل آزاری ہے۔ مرنے کے اندیشے اور جینے کے حوصلے ہیں۔ پیار ومحبت کی باتیں اور گالی گلوچ کی سوغاتیں ہیں"[2] ایک اور خصوصیت ان خطوط کی یہ ہے کہ ان میں ہم اس غالب سے دوچار ہوتے ہیں "جو بقول کسے اپنے آدمی ہونے پر شرماتا نہیں"۔ اور زندگی کی ادنیٰ ترین حقیقتوں کو قبول کرنے سے ہچکچاتا نہیں حقیقت یہی ہے کہ اس قبولنے (ACCEPTANCE) میں ہی زندگی کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ اسی عرفان حیات نے غالب کو وہ DETACHMENT بھی عطا کی جو ایک بڑے فن کار کی پہچان ہوتی ہے اور جس سے اس کے یہاں نقش گری بھی ہے اور پردہ دری بھی۔ اس سلسلے میں غالب کا وہ خط بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے قربان علی بیگ سالک کو لکھا ہے جس میں غالب نے "اپنی تصویر کشی

لہ، [2] خلیل الرحمان اعظمی ۔ مضامین نو ۔ ص ۳۹ ، ۴۰

کچھ اس انداز سے کی ہے کہ تماشا اور تماشائی کا امتیاز مٹ گیا ہے"۔

"یہاں خدا سے بھی توقع نہیں، مخلوق کا کیا ذکر کچھ بن نہیں آتی آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے تو کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بہت بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرض خواہوں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا، ہم نے ازراہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ اور عرش نشین خطاب دیتے ہیں، چوں کہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا، سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آیئے نجم الدولہ بہادر۔ ایک قرض خواہ کا گریباں میں ہاتھ ایک قرض خواہ بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں اجی حضرت نواب صاحب، نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب! آپ سلجوقی و افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اکسو کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا بے غیرت کوٹھی سے شراب گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لے جاتا تھا، یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔[1]"

SELF - CONDEMNATION کی نفسیاتی تحلیل سے قطع نظر نثر کا یہ ٹکڑا محض اس لئے جاذب توجہ نہیں کہ اس میں غالب نے جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے، سادہ اور سلیس زبان استعمال کی ہے بلکہ اس میں جان اس لئے آئی ہے کہ اس میں غالب نے حرف و صوت کا وہ آہنگ پیدا کیا ہے جو بقول خلیل الرحمن اعظمی "حواس کی بیداری اور لہو کی گردش سے وجود میں آتا ہے"۔ اور جہاں یہ چیز نہ ہو الفاظ اپنی تمام تر سلاست، سادگی اور خوبصورتی کے بھی بے جان رہتے ہیں۔

غالب کی شخصیت کی پہچان ان سے ہی ممکن ہے۔ وہ شخصیت جو ان کی شاعری

---

[1] عکس غالب۔ ص ۴۹۔ ۵۰۔

میں ابھرتی ہے ان کی اصلی شخصیت کے ساتھ مماثلتوں کے باوجود بھی مختلف ہے اور ایسا ہونا ناگزیر بھی ہے اس لئے کہ نجی زندگی یا شخصیت کا اظہار شعری عمل کے دائرے سے خارج ہے اور ضروری نہیں کہ شخصیت کا جو تصور ان کی تخلیقات میں ابھرتا ہے وہ ان کی اصلی شخصیت سے ہم آہنگ ہوتی۔ ایس ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

"The poet has not a 'Personality' to express but a particular medium, which is only a medium and not a personality, in which impressions and experiences combine in peculiar and unexpected ways."

غرض یہ کہ شاعر شخصیت کے بجائے اس ذریعہ اظہار کا اظہار کرتا ہے جس میں تاثرات اور تجربات عجیب اور غیر متوقع طور پر باہم ترکیب پاتے ہیں۔ شاعر ادبی طور پر اپنی سوانح منظوم نہیں کرتا۔ بلکہ ایک پُرپیچ تخلیقی عمل کے تحت اپنی زندگی کے تاثرات اور تجربات کو ذات کے حوالے سے اور اُن کی باہمی تطبیق سے ایک نئی اور نادیدہ صورت عطا کرتا ہے اور اسی عمل کے نتیجے میں فن میں شخصیت کے خدوخال نمایاں ہوں گے جو لازمی طور پر فن کار کی اصلی شخصیت سے بعید ہوں گے۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ بعض شعراء مثلاً ورڈزورتھ، شیلی، بائرن، دستوفسکی اور میراجی ذاتی زندگی میں بعض قبیح عادات اور غیر اخلاقی افعال کے مرتکب ہوتے ہوئے بھی اپنی تخلیقات میں اعلیٰ تہذیبی اور رُوحانی قدروں کے علمبردار بن کر ابھرتے ہیں۔ غالب کا حال بھی ان سے مختلف نہیں۔ ان کی اصلی زندگی میں جوانی کی بے راہ رویاں، انگریز حکام کی خوشامدیں اور دروغ بیانیاں کسی بھی طرح ان کے کلام میں اُبھرنے والی شخصیت کی تابانی، سچائی اور عظمت کی نفی نہیں کرتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر فن کار بیک وقت دو طرح کی زندگیاں گزارتا ہے، ایک عام سی زندگی جس میں وہ عام لوگوں کی طرح ذاتی، معاشی اور سماجی حقیقتوں کا سامنا کرتا ہے اور اپنے لئے زندہ رہنے اور کسب معاش کے لیے جد و جہد کرتا ہے۔

دوسری زندگی وہ ہے جو تخلیق کے عمل کے نادر لمحوں میں گزارتا ہے۔ یہ وہ لمحے ہوتے ہیں جن میں تخلیق کی بھٹی میں اس کی زندگی کے تجربات کا سونا پگھل جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں فن کار کا وجود زرِ خالص کی طرح دمکتا ہے اور جاوداں ہو جاتا ہے۔ پہلی قسم کی شخصیت کی تلاش فن پاروں میں بے سُود ہوگی اور خطوط ہی وہ واحد ذریعہ ہیں جن کا مطالعہ اس شخصیت کو بے نقاب کرنے میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بات جس قدر غالبؔ پر صادق آتی ہے اتنی شدّت کے ساتھ غالباً اور کسی شاعر پر نہیں آتی۔ غالبؔ نے جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے اُردو میں مکتوب نگاری کی دُنیا میں ایک زبردست انقلاب پیدا کیا۔ اس بات کا انہیں خود بھی احساس تھا اور خط لکھنے کے اس نئے طرز کو خاص اپنی دولت سمجھتے تھے ایک خط میں میر مہدی کو لکھتے ہیں:

"میر مہدی جیتے رہو۔ آفرین صد ہزار آفرین۔ اُردو لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھ کو رشک آنے لگا۔ سُنو دلّی کے تمام مال و متاع اور زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ طرزِ عبارت خاص میری دولت تھی، سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بحل کیا۔ اللہ برکت دے۔"[۱]

مکتوب نگاری کی قدیم اور مروجہ روش سے غالبؔ نہ صرف غیر مطمئن تھے بل کہ جو لوگ غالبؔ سے اس طرح کے خطوط لکھنے کی توقع رکھتے تھے انہیں اپنے مخصوص انداز میں فہمائش بھی کرتے تھے۔ ایک خط میں میر مہدی سے قدیم روش نامہ نگاری کی یوں مذمت کرتے ہیں:

"تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو کرید اکرو۔ مسودے کو بار بار دیکھا کرو۔ پاؤ گے کیا یعنی تم کو وہی محمد شاہی روشیں پسند ہیں۔ یہاں خیریت ہے وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمہارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار میر سرفراز حسین کو دعا اور دعا کہنا اور ہاں حکیم میر اشرف علی

---

[۱] عکسِ غالبؔ۔ مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور۔ ص ۱۵۲۔

اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمہ سعادت مندی ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو۔ کیوں سچ کہیو! اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی؟ ہائے کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یُوں نہ لکھو وہ خط ہی نہیں، چاہِ بے آب ہے، ابرِ بے باراں ہے، خانۂ بے چراغ ہے، چراغِ بے نُور ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم زندہ ہو، تم جانتے ہو کہ ہم زندہ ہیں۔ امرِ ضروری کو لکھ دیا۔ زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا۔ اگر تمہاری خوشنودی اسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے تو بھائی ساڑھے تین سطریں ایسی بھی میں نے لکھ دی ہیں کیا نماز قضا نہیں پڑھتے؟ وہ مقبول نہیں ہوتی۔"[1]

پُر تکلف القاب و آداب لکھنے کے انداز پر جو اس زمانہ میں مکتوب نگاری کے آداب میں شامل تھا، غالبؔ نے نہایت دلچسپ پیرایہ میں طنز کیا ہے:۔

"کیوں کر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں۔ ہاں اتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے آپ کو دیوانہ سمجھتا ہوں۔ واہ کیا ہوشمندی ہے کہ قبلہ اربابِ ہوش کو خط لکھتا ہوں، نہ القاب، نہ آداب، نہ بندگی، نہ تسلیم؟ سُن غالبؔ۔ ہم تجھ سے کہتے ہیں کہ بہت مصاحب نہ بن۔ اے ایاز حد خود بشناس۔ مانا کہ تو نے کئی برس کے بعد نو بنیت کی غزل لکھی ہے اور آپ اپنے کلام پر وجد کر رہا ہے۔ یہ تحریر کی کیا روش ہے پہلے القاب لکھ، پھر بندگی عرض کر، پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خبر پوچھ پھر عنایت نامہ آنے کا شکرادا کر۔"

غالبؔ ایک غیر معمولی فن کار تھے لیکن وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ عظمت اور بڑھائی حاصل کرنے کے لیے پہلے معمولی آدمی کا منصب قبول کرنا پڑتا ہے۔ غالبؔ کے خطوط میں ہمیں ایک نارمل آدمی کے معمولات ملتے ہیں، میر مہدی مجروحؔ کو لکھتے ہیں:۔

"دھوپ میں بیٹھا ہوں، یُوسف خان اور لالہ مہر سنگھ بیٹھے ہیں، کھانا تیار ہے۔ خط

---

[1] عکسِ غالبؔ۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ ص ۱۸۵+

لکھ کر بند کر کے آدمی کو دوں گا اور گھر جاؤں گا۔ وہاں ایک دالان میں دھوپ آتی ہے اور اس میں بیٹھوں گا، ہاتھ منہ دھوؤں گا، ایک روٹی کا ٹکڑا سالن میں بھگو کر کھاؤں گا، بیسن سے ہاتھ دھوؤں گا، باہر آؤں گا، پھر اس کے بعد خدا جانے کون کون آئے گا، کیا صحبت ہو گی؟" [۱]

شہاب الدین ثاقب کو رام پور جاتے ہوئے دورانِ سفر لکھتے ہیں:۔

"چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا، گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا، میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا، دو شامی کباب اس میں ڈال دیئے۔ رات ہو گئی تھی، شراب پی لی، کباب کھائے، لڑکوں نے ادہر کی کھچڑی پکوائی، خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوایا۔ ترکاری نہ ڈلوائی۔ آج میں نے تمہارے والد کی نصیحت پر عمل کیا۔ چار بجے کے عمل ہاپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے بابوگڑھ کی سرائے میں آپہنچا ہوں، چارپائی بچھائی، اس پر بچھونا بچھا کر حقہ پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔" [۲]

مراسلت کو مکالمت کے درجے تک لے آنا غالب ہی کی اختراع ہے۔ اس خصوصیت میں بطورِ خاص بہت سے مکتوب نگاروں نے ان کی تقلید کی لیکن ان کی یہ کوششیں تقلید کی حد سے آگے نہ بڑھ سکیں اور غالب بہر حال غالب ہی رہے:۔

"اے میرن صاحب! السلام علیکم۔ حضرت آداب۔ کہو صاحب آج اجازت ہے، میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی۔ حضور میں کیا منع کرتا ہوں، مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں، پھر آپ کیوں تکلف کریں۔ نہیں میرن صاحب! اس خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہو رہا ہو گا، جواب لکھنا ضرور ہے، حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں۔ آپ سے خفا کیا ہوں گے۔ بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم

---

[۱]، [۲] عکس غالب۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ ص ۱۹۲ : ۴۷ - ۴۸

مجھے خط لکھنے سے باز کیوں رکھتے ہو۔ سبحان اللہ لے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں مہدی کو خط لکھوں، کیا عرض کروں سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے، میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں میری روانگی کے تین دن بعد آپ شوق سے لکھئے گا میاں مٹھو ہوش کی خبر لو۔ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی تمہاری باتوں میں آگیا اور آج تک اسے خط نہ لکھا۔ لاحول ولا قوۃ ....[1]

وہ خطوط جن میں غالب نے اپنے روز و شب کے معمولات، زندگی کی تلخ کامیوں حسرتوں ناآسودگیوں اور نارسائیوں کا ذکر کیا ہے، وہ نہ صرف یہ کہ غالب کی سوانح میں آب و رنگ پیدا کرتے ہیں بل کہ ان کے کلام کی تفہیم و تعبیر اور تفسیر کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔ غالب جب اپنی آفرینش، ارتقا اور انجام پر تفکر کرتے ہیں اور بعض لمحوں میں اپنے وجود کی آگہی کا کرب جھیلتے ہیں تو وہ کہہ اٹھتے ہیں :۔

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار　　سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل ناآشنا

یا پھر جب احساس نارسائی جو ہر زندہ اور حساس انسان کا مقدر ہے انہیں پریشان کرتا ہے تو وہ برملا اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ :۔

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اور شکست کی یہ آواز جب بار بار ان کا پیچھا کرتی ہے تو وہ جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ علائی کو لکھتے ہیں :۔

"مجھے اپنے ایمان کی قسم میں نے اپنی نظم و نثر کی داد باندازۂ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا۔ آپ ہی سمجھا، قلندری و آزادگی، ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے

---

[1] عکس غالب۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ ص ۱۷۶۔ ۱۷۷۔

مجھ میں بھر دیئے تھے بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا معہ سوت کی رسی کے لٹکاؤں اور پیادہ پا چل دوں کبھی شیراز جا نکلا۔ کبھی مصر جا ٹھہرا کبھی نجف میں جا پہنچا، نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں اگر تمام نہ ہو سکے تو نہ سہی جس شہر میں رہوں اور اس شہر میں تو کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔"

غالب کی شخصیت کی تفہیم کے سلسلے میں ان کے نفسیاتی محرکات پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے۔ ان کا ذہن جو بیک وقت کئی متضاد قوتوں کے ٹکراؤ کی آماجگاہ تھا مستقل طور پر داخلی کشمکش کا شکار رہا خاندانی وجاہت اور تخلیقی قوتوں کے احساس نے انہیں خودپسندی اور انانیت سے آشنا کیا اور یہ رجحان ان کی شخصیت کا ناگزیر حصہ بن گیا لیکن وقت کے سنگین ہاتھوں سے یہ احساس بار بار پامال ہوتا رہا یہاں تک کہ ان کی زندگی شکست آرزو کی ایک دل گداز داستان بن کے رہ گئی۔ منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

"میاں تم مشق سخن کر رہے ہو اور میں مشق فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت، شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا اور مسلمانوں میں کوئی نبی بنا تو کیا۔ دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا، گمنام جئے تو کیا، کچھ وجہ معاش ہو اور کچھ صحت جسمانی باقی سب وہم ہے۔ اے یار جانی ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اسی پائے پر ہوں۔ شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے۔ اور وجہ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گذر جاؤں۔ میں جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ کسی کو جواب مطابق سوال کے دیئے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے اس کو ویسا ہی برت رہا ہوں لیکن سب کو وہم جانتا ہوں۔ یہ دریا نہیں سراب ہے، ہستی نہیں پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور رہیں گے ان کو شہرت سے کیا حاصل

ہوا کہ ہم کو تم کو ہو گا۔"

خطوط غالب کا یہ تذکرہ میں پروفیسر خورشید الاسلام کی اس رائے پر ختم کرتا ہوں جو اختصار کے باوجود بڑی جامع اور متوازن ہے۔ مکاتیب غالب کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :۔

"غالب سے پہلے شاید لوگ زندگی کو دور سے دیکھنے کے عادی تھے۔ انہوں نے زندگی کو برت کے نہیں دیکھا تھا۔ غالب ذہنی طور پر اپنے پیشروؤں سے کہیں زیادہ بیدار تھے وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے وجدان اور فکر کو سمویا۔ ان سے پہلے کی شاعری زیادہ تر احساسات کے اظہار پر مشتمل ہے۔ اس کا واحد سبب ان کا تشکک ہے، جس کی لے آخر عجمیت کے ساز میں گم ہو گئی۔ قطرے پر گہر ہونے تک جو کچھ گزری وہی ان کی شاعری اور خطوط کا موضوع ہے۔ اِن باتوں پر زور دینے سے میرا مطلب غالب کی بھرپور زندگی پر زور دینا ہے۔ غالب کی زندگی نہ تو خانوں میں بٹی ہوئی تھی اور نہ روایتی تھی انہوں نے فن کو زندگی پر فضیلت نہیں دی۔ اُن کی زندگی اُن کے فن کا وسیلہ بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ غالب جو کچھ اپنی روزمرہ زندگی میں نظر آتے ہیں وہی اپنے خطوط میں ہیں۔ اس باطنی صداقت کی بدولت اُردو شاعری اُن کے ہاتھوں میں پہنچ کر کچھ سے کچھ ہو گئی۔ ان کے مکاتیب زبان کے ارتقا میں نشان کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

حالی :۔ "خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بل کہ اکثر اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے اسی طرح ٹپک پڑتا ہے نہیں بل کہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے اور اگر وہ ایسا دل ہو جو سراسر درد سے لبریز ہو جس میں ہمدردیٔ بنی نوع انسان کوٹ کوٹ کر بھری ہو جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو تو بتاؤ اس دل کی تراوش کیسی ہو گی۔ اگر تم ایسے دل کی زیارت کرنا چاہتے ہو تو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل ان خطوں میں لپٹا ہوا ہے۔"[1]

---

[1] مقدمات عبدالحق۔ عبدالحق۔ ص ۳۶۹

'مکتوباتِ حالی' کے مقدمے میں ظاہر کی گئی عبدالحق کی اس رائے سے اختلاف کی گنجائش نہیں کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ حالی کا دل درد سے لبریز تھا اور اس میں بنی نوع انسان کی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور مکتوباتِ حالی کا ہر خط اس حقیقت پر دال ہے اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ حالی کی شخصیت اور کردار کے کئی اور روشن پہلوؤں میں ہمدردی اور دل سوزی کا پہلو کچھ زیادہ ہی نمایاں ہے۔ اپنے صاحبزادے کو لکھتے ہیں:۔

"میں تو فرائض کے بعد کوئی عبادت اور کوئی بھلائی اس کے برابر نہیں سمجھتا کہ اولاً اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ اور پھر تمام ابنائے جنس کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو بھلائی کی جائے۔"

حالی نے اپنی زندگی میں کچھ فرائض مقرر کئے تھے جن کی ادائیگی میں وہ تاخیر کو روا نہیں رکھتے تھے۔ چناں چہ خط لکھنا غالب کی طرح ان کا شغلہ نہیں بل کہ منجملہ انہی فرائض میں سے ایک فرض تھا اور اس فرض اور اخلاقی ذمہ داری سے جلد از جلد سبکدوش ہونے کی خاطر وہ افسوسناک بے تعلقی کے ساتھ خط لکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بے پناہ خلوص، دلسوزی، شفقت، ہمدردی، انکساری اور فروتنی کے ہوتے ہوئے بھی ان مکاتیب میں حسن، زندگی اور توانائی کے آثار ناپید ہیں۔ اس کے برعکس غالب کے خطوط حسن اور توانائی سے بھرپور ہیں جو خلوص اور شخصیت کے کھرے پن کے علاوہ اس ذوق وشوق کا نتیجہ بھی ہے جس ذوق وشوق سے وہ خط لکھتے تھے اس ذوق وشوق اور دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ وہ اپنا بیشتر وقت خطوں کے پڑھنے اور ان کا جواب لکھنے میں صرف کرتے تھے اور اگر پھر بھی وقت بچ رہتا تو لفافے بنانے لگتے۔ منشی نبی بخش کو لکھتے ہیں:۔

"اللہ اللہ! یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ خط سے خط لکھے گئے ہیں۔ مجھ کو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا تو لفافے بناؤں گا۔"

بایں ہمہ حالی کی شخصیت ان کے خطوط میں نمایاں ہے۔ اپنے بیشتر معصروں سے جس بات میں انہیں امتیازی حیثیت حاصل تھی وہ ان کی انکساری اور فروتنی ہے۔ اظہارِ ذات کا جذبہ ہر انسان میں

میں ہوتا ہے۔ فن کاروں اور ادیبوں میں یہ جذبہ کچھ زیادہ ہی شدید ہوتا ہے۔ ان کی تخلیقات بنیادی طور اسی جذبے کا مظہر ہوتے ہیں۔ تاہم حالی اس جذبے کو بے لگام چھوڑ دینے کے قائل نہیں۔ وہ اس جذبہ سے متاثر ہو کر نہ کبھی اپنے ہمعصروں کے مقام کو گراتے ہیں اور نہ اپنے ادبی مقام کو دوسروں پر فوقیت دیتے ہیں۔ شبلی اور حالی کی معاصرانہ چشمک کا ایک زمانے میں بڑا چرچا تھا۔ علی گڑھ تحریک سے مکمل طور پر اتفاق نہ رکھتے ہوئے بھی وہ علی گڑھ تحریک سے پوری طرح متعلق تھے اور سرسید کی ہر بات کو صحیح سمجھتے تھے۔ اسی لئے شبلی ان سے برہم تھے اور ان پر شدید تنقید کرتے تھے لیکن حالی اپنے خطوں میں ہر موقعہ پر شبلی کو اچھے ناموں سے یاد کرتے تھے اور جب کبھی شبلی کا ذکر کرتے ہیں تو نہایت عزت اور احترام کے ساتھ وہ شبلی کی علمیت، قابلیت اور صلاحیت کے دل سے معترف تھے۔ جب حیدرآباد میں شبلی کا تقرر مددگار معتمد امور مذہبی کے عہدے پر ہوا تو حالی نے مولوی عبدالحق کو لکھا:۔

"شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کا تقرر مددگار معتمد امور مذہبی کے عہدہ پر عزیزی غلام الثقلین کی تحریر سے معلوم ہو کر بے انتہا مسرت ہوئی۔ اگر آپ ان سے ملیں تو میری طرف سے بعد سلام و نیاز کے کہہ دیجئے گا کہ اگرچہ آپ کے علم و فضل و لیاقت کے مقابلہ میں یہ عہدہ چنداں امتیاز نہیں رکھتا مگر بہرحال لاہور کی خدمت سے جس پر مسٹر آرنلڈ آپ کو بلانا چاہتے تھے میرے نزدیک بہت بہتر ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ آپ کو تصنیف تالیف کا یہاں زیادہ موقعہ ملے گا اور آپ قوم کو زیادہ فائدہ پہنچا سکیں گے۔"[1]

انہی مولوی عبدالحق نے جب اُردو لٹریچر کے ہیروز کی فہرست بنائی اور ان کے ادبی کارناموں پر تنقیدی مضامین لکھنے کی تجویز پیش کی، اس فہرست میں اتفاق سے شبلی کا نام نہ تھا، اس پر حالی نے انہیں لکھا:۔

"جن لوگوں کو آپ نے اس غرض سے انتخاب کیا ہے کہ ان کے کلام پر کریٹیکل ایسے لکھے

---

[1] مکاتیب حالی۔ ص ۷۹

جائیں' ان میں سے ایک شخص کا نام ہونے سے اور ایک کا نہ ہونے سے نہایت تعجب ہوا۔ مولوی سید احمد میرے نہایت دوست ہیں اور اردو ڈکشنری لکھنے میں جو محنت اور استقلال انہوں نے دکھایا ہے اس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ ان کی ڈکشنری پر ۸۸ء میں ایک لمبا ریویو میں خود لکھ چکا ہوں۔ مگر ماڈرن اردو لٹریچر کا ہیرو میں ان کو نہیں کہہ سکتا۔ اس سے بھی زیادہ تعجب شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی کا نام چھوڑ دینے پر ہے۔ اس فروگذاشت کو سوا اس کے کہ آپ کو انتخاب کرتے وقت ان کا خیال نہ آیا ہو میں اور کسی بات پر محمول نہیں کر سکتا۔"[1]

انکسار اور فروتنی کے باوصف حالی اپنے ادبی مقام سے بے خبر نہیں تھے۔ امیر حبیب اللہ والی افغانستان جب ہندوستان کے دورے پر آئے تو علی گڑھ میں حالی کو بھی ان سے ملنے کا موقع ملا۔ اسی ملاقات کے دوران امیر حبیب اللہ نے حالی کی تصانیف کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی چناں چہ حالی ان کی خدمت میں اپنی کتابیں پیش کرنا چاہتے تھے' اس سلسلے میں ایک عزیز کو لکھتے ہیں:-

"میرا مطلب ان کتابوں کے بھیجنے سے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اول تو امیر صاحب نے میری تصنیفات کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی اس لئے ان کا بھیجنا ضرور ہے۔ دوسرے یہ بھی خیال ہے کہ اگر کوئی شخص مذکورہ بالا اصحاب میں سے امیر صاحب پر یہ بات ظاہر کر دے کہ ان کتابوں سے مسلمانان ہندوستان میں تعلیم اور ترقی کی بہت بڑی تحریک پیدا ہوئی ہے تو شاید امیر صاحب کو فارسی یا پشتو میں ان کتابوں کے ترجمہ کرانے کا خیال پیدا ہو جائے۔"

اسی ضمن میں ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

"اگرچہ میں عرضداشت میں مختصر طور پر ایک کتاب کا حال لکھوں گا۔ مگر جن صاحب کے توسط سے یہ کتابیں پیش ہوں گی ان کو بھی زبانی کتابوں کا حال اور جو اثر ان کا

---

[1] مکاتیب حالی ۔ ص ۱۲۱

ہندوستان کے مسلمانوں پر ہوا ہے بیان کرنا امیر صاحب کے سامنے ضرور ہوگا مصنف خود اپنی تصنیفات کی نسبت جو کچھ کہے وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ محسن الملک کو چوں کہ بہت سے ٹرسٹیوں کو انٹروڈیوس کرانا تھا اس لئے وہ میری نسبت اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکے کہ یہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے شاعر ہیں اور ہندوستان میں ان کا کوئی مثل نہیں ہے لیکن یہ نہیں کہا گیا کہ ایشیائی شاعری جو محض ایک بیکار چیز تھی اس کو مفید بنایا گیا ہے اور اس کے ذریعے سے ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کیا گیا ہے۔" [1]

حالی نے جو کام بھی کیا اس میں انہیں ذاتی منفعت کا خیال نہیں تھا انھوں نے نثر لکھی نظمیں کہیں مسدس لکھی جس نے پیغمبروں کا سا کام کیا قوم کے مفید لوگوں کا احترام کیا ہمعصروں سے محبت کی مگر کبھی کسی انعام کی خواہش نہیں کی۔ اقتدار کی خواہش جس سے شاید ہی ان کا کوئی ہمعصر بچا تھا حالی کو نام کی بھی نہ تھی تاہم اپنی تصنیفات سے لوگوں کی بے اعتنائی خاص کر ان لوگوں کی جن سے قدردانی کی توقع ہوتی تھی دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے تھے چناں چہ جب حیات جاوید شائع ہوئی اور اس کی پذیرائی متوقع طور پر نہیں ہوئی تو حالی نے حبیب الرحمٰن خان شیروانی کو لکھا:

"ڈیڑھ مہینے سے زیادہ عرصہ ہوچکا کہ حیات جاوید کی جلدیں تینوں قسم کی ڈیوٹی شاپ میں پہنچ گئیں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ نے ضرور منگوالی ہوں گی کیوں کہ اگر مصنف قابل وقعت نہ تھا تو ہیرو بلاشبہ ایسا تھا کہ اس کی بائیوگرافی دیکھنے کا خاص کر آپ جیسے لوگوں کو ضرور مشتاق ہونا چاہیئے تھا۔ مگر جہاں تک خیال کیا جاتا ہے مصنف کی بے وقعتی نے ہیرو کی بھی قدر گھٹا دی ہے۔ جن لوگوں سے یہ امید تھی کہ اس کتاب کے منگوانے میں ایک دوسرے پر سبقت کریں گے ان کی طرف سے سرد مہری کے سوا میں نے اب تک کچھ نہیں دیکھا۔ اگرچہ میں صدق دلی سے اقرار کرتا ہوں کہ میں نے باوجود اپنی

---

[1] مکاتیب حالی۔ ص ۱۱۷

ناقابلیت کے اس بارِ گراں کو اپنے ذمہ لے کر سرسید کے تمام اصحاب اور حواریوں کو ایک فرضِ کفایہ سے سبکدوش کیا ہے اور اس لئے میں اپنے زعم میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ سرسید کے احباب اگر اس تصنیف کو پسند نہ کریں گے تو اس کی اشاعت میں ضرور مدد دیں گے۔ مگر آج تک کسی نے اس کی بات بھی نہ پوچھی بلکہ بجائے امداد کے بعض اصحاب متوقع ہیں کہ ان کی خدمت میں ایک ایک کاپی ہدیتہً پیش کی جائے...

آپ یقین جانیے کہ میں اس زمانہ کی لٹریری ترقی کے آگے ایسے لوگوں کی تحریرات کو جو میری طرح محض اُردو فارسی کے مردِ میدان ہیں، لاشئے محض جانتا ہوں مگر مکڑی جو اپنا جالا پورنے میں منتہائے طاقت صرف کرتی ہے وہ اسی کو حریر و اطلس سے بھی زیادہ گراں قدر تصور کرتی ہے۔"

ایک دوست کی بیوی کے انتقال پر تعزیتی خط لکھتے ہیں اور دوسری شادی کے خیال سے کس مشفقانہ انداز میں باز رکھتے ہیں:۔

"اگرچہ یہ موقعہ نصیحت و پند کرنے کا نہیں ہے مگر میں اس مقام پر خاموش نہیں رہ سکتا خدا کے تمام کام حکمت اور مصلحت سے بھرے ہوتے ہیں۔ بہت سی باتوں کو ہم مکروہ جانتے ہیں مگر وہ ہمارے حق میں اکسیر کا حکم رکھتی ہیں۔ اتفاقات تقدیری سے جو آپ کو یہ آزادی حاصل ہو گئی ہے اس کی کچھ قدر کرنی چاہیئے اور اس سے کچھ کام لینا چاہیئے۔" [۱]

اس کے بعد سرسید احمد خان کی مثال پیش کرتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے بیوی کی وفات کے بعد اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کوشش کی اور قومی بہبود کے کاموں میں جُٹ گئے۔ اپنی اس نصیحت کو حق دوستی سے تعبیر کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں:۔

"میں نے اس نصیحت کے سوا جو اس خط میں لکھی ہے آپ کے ساتھ کبھی کوئی دوستی کا حق ادا نہیں کیا۔" [۲]

---

[۱]، [۲]۔ مکاتیب حالی۔ ص ۸۷۔ ۸۸

حالی نے شبلی کی طرح کبھی غالب کے طرزِ تحریر کی پیروی کی کوشش نہیں کی مگر وہ خطوں سے ملاقات کا لطف حاصل کرنے کے قائل ضرور تھے۔ ان کے کسی خط سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کاوش کے بعد لکھا گیا ہے بلکہ ان کے خط صحیح معنوں میں بے تکلفی اور بے ساختگی کا نمونہ ہیں چوں کہ بلند پایہ ادیب تھے لہٰذا کہیں کہیں ان کے قلم سے بڑے شگفتہ جملے بھی نکل جاتے ہیں۔ حیاتِ جاوید پر نواب محسن الملک نے تبصرہ کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"ان کا ارادہ ایسا ہی ہے جیسا ہر مسلمان حج کا ارادہ رکھتا ہے۔"

مولوی عبد الحق کے تبصرے کو پڑھ کر جو انہوں نے حیاتِ جاوید پر کیا تھا۔ انہیں لکھتے ہیں:۔

"حیاتِ جاوید پر آپ کا ریویو دیکھا جو کلمات بمقتضائے محبت تصنیف اور مصنف کے حق میں بے اختیار آپ کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ اگرچہ میں اپنے تئیں ان کا مستحق نہیں سمجھتا لیکن بہر حال آپ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض جانتا ہوں۔ یہ وہی فضیلت ہے جس کو اہلِ ایران یار فروشی کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور ہماری زبان میں پھڑک پھڑک کر بیچنا کہتے ہیں۔" [۱]

—— اپنے صاحبزادے کو ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"اب تم خاص کر میرے لئے جُوتا بنوانے کی فکر نہ کرنا ..... کیوں کہ ... ہر ایک جوتا پاؤں پر غالب آجاتا ہے۔ پاؤں جُوتے پر غالب نہیں آتا۔"

—— ایک خط میں اپنے بڑھاپے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ کوئی مہلک مرض سر دست لاحق نہیں ہے لیکن ۷۵-۷۶ برس کی عمر کا آدمی چراغِ سحری سے بھی زیادہ ناپائیدار ہوتا ہے۔ خدا کرے کہ آپ مع الخیر حسبِ وعدہ محرم کی تعطیل میں یہاں آجائیں اور اپنی ملاقات سے محظوظ فرمائیں۔ میں اپنی طرف سے تو اس وقت زندہ رہنے کے لیے بہت کوشش کروں گا۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔"

---

[۱]۔ مکاتیبِ حالی۔ ص ۱۱۲؎

"حالی کے خطوط ان کی دیگر نثری تصانیف کی طرح اُردو نثر کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ انہیں دلچسپ تو نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی ان خطوط سے انسانی سیرت کی نیرنگی پر روشنی پڑتی ہے لیکن یہ اپنے اسلوب کی بنا پر ہمیشہ اپنی اہمیت منواتے رہیں گے۔ حالی کے سبھی ہمعصر صاحب طرز تھے لیکن بقول پروفیسر آل احمد سرورؔ زندگی صرف حالی کے طرز کو نصیب ہوئی باقی یا تو ختم ہو گئے یا ان کی کارفرمائی محدود ہو گئی۔ آزاد کی صناعی، نذیر احمد کا زورِ بیان، سرسید کی سادگی، شبلی کی رنگینی سب اپنی جگہ پر خوب ہیں لیکن آج نثر کا رجحان کیا ہے؟ یہ بتلانے کی ضرورت نہیں۔"[1]

حالی ہمارے سب سے پہلے ادیب ہیں جو نثر کی اہمیت سے نہ صرف واقف تھے، بلکہ اس کا شدید احساس بھی رکھتے تھے، وہ ادب کو زندگی کو سدھارنے اور سنوارنے کا ذریعہ بھی سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے لئے وہ نثری اسلوب اختیار کیا جو سادگی کے ساتھ ساتھ قطعیت (CLARITY) کی صفت سے بھی متصف تھا۔ انہوں نے ورڈز ورتھ کی طرح اپنی زبان کو انسانوں کی حقیقی یا نیچرل زبان یعنی جیسے وہ بولتے ہیں، سے قریب کر دیا۔ یہی اسلوب ان کے خطوط میں بھی ملتا ہے۔ اس میں آفتاب کی تابانی نہیں بلکہ چاند کا سا نور ہے جس سے آنکھوں کو ٹھنڈک دل کو سرور اور ذہن کو ایک لطیف انبساط کا احساس ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اپنی پوتی کے نام ان کا ایک خط دیکھئے:۔

"تمہارا طوطا اچھا ہے اور خوب بولتا ہے اور خوش ہے۔ سُنتا ہے کہ جس روز تم یہاں سے روانہ ہوئی تھیں اس روز تمام دن اس نے کچھ کھایا پیا نہیں اور سارے دن چپ رہا۔ مگر پھر وہ بات نہیں رہی۔"[2]

"غالبؔ زندہ ہوتے تو شبلیؔ کو اپنی اُردوئے خاصہ کی داد ملتی۔"[3]

شبلیؔ نے گو اس بات کا اعتراف نہیں کیا لیکن اس میں شک نہیں کہ انہوں نے مکتوب نگاری میں تسعوری طور پر غالبؔ کی پیروی کی ہے اور اسی پیروی کا نتیجہ ہے کہ ان کی "اُردوئے خاصہ" کے جوہر نمایاں ہوئے۔ غالبؔ نے جو مراسلے کو مکالمہ بنانے کی بات کی تھی اس کے تتبع میں شبلیؔ نے بھی خطوط کو گفتگو کے

---

[1] آل احمد سرور۔ تنقیدی اشارے۔ ص ۸۷۔ [2] مکاتیب حالی۔ ص ۱۹۱۔ [3] افاداتِ مہدی۔ ص ۷۹۔

درجے تک پہنچا دیا۔ مولانا کے خطوط میں بے پناہ برجستگی ہوتی ہے۔ ان خطوط کی سب سے واضح خوبی یہ ہے کہ ان میں مکتوب الیہ کا ذوق بھی ملحوظ رہتا ہے۔ مہدی افادی نے اسی تاثر کو ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"جس روز ڈاک میں مولانا کا خط ملتا تھا اس کا پڑھنا پڑھانا میرے لئے ایک ایسا عیش ہوتا تھا جسے کبھی نہیں بھولوں گا۔" [۱]

یہ کیفیت غالباً اس لئے ہوتی تھی کہ یہ خط مہدی افادی کے ذوق کے مطابق ہوتے تھے۔ یہ بات مکاتیب شبلی کے ہر خط میں پائی جاتی ہے۔ شبلی بعض اوقات غالب ہی کی طرح اپنے خطوط میں محض لطف سخن کے لیے بھی باتیں کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے خطوں میں تقریباً وہ سب گر استعمال کئے جو لطف بیان اور دلچسپی پیدا کرنے کے لیے کبھی غالب نے استعمال کئے تھے۔ اپنی ان کوششوں میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے لیکن بعض جگہ اصل اور نقل کا فرق نمایاں ہو گیا ہے۔ غالب کو ڈرامائی انداز میں خط لکھنے پر بڑی قدرت تھی۔ شبلی نے بھی اس انداز سے خط لکھے ہیں لیکن ان میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکی ہے جو غالب کے یہاں ملتی ہے۔ اس طرز کا ایک خط [۲] شبلی نے مولوی محمد سمیع کو لکھا تھا جو مجلس کے نام سے ان کے مکاتیب میں شامل ہے۔ اس میں خط نہ لکھنے کی شکایت ہے۔ ڈرامائی انداز کی وجہ سے لطیف طنز بھی پیدا ہو گیا ہے لیکن مکالمہ میں بہت سے لوگوں کو شامل کرنے کی وجہ سے وہ لطف نہیں آتا جو غالب کے مکالموں میں آتا ہے۔ دراصل غالب کے طرز ادا اور اسلوب بیان کو اپنانے میں شبلی کو قدرے تکلف سے کام لینا پڑتا تھا لیکن اس تکلف اور تصنع کے باوجود جو شبلی کے بعض مکاتیب کی جان ہے ہمیں ان کے یہاں بے تکلفی اور سادگی کی فراوانی بھی ملتی ہے۔ شگفتگی جو شبلی کے انداز نگارش کا مایہ اعتبار ہے کم و بیش ان کے ہر خط میں نظر آتی ہے۔ ان کے خطوں میں مزاح اور شوخی کی بے شمار مثالیں بکھری ہوئی ہیں۔ مہدی افادی کے الفاظ میں "عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ ان کی حکیمانہ شوخیاں سرمایہ ادب ہوتی تھیں۔"

مولوی حبیب الرحمٰن خان شیروانی جو شبلی کے دوستوں میں سے تھے اور جن کے نام شبلی نے سب سے

---

[۱]، [۲]۔ مکاتیب اوّل۔ ص ۷، ص ۶۲؛

زیادہ خط لکھے ہیں۔ انہوں نے ایک بار نعت لکھنے کا ارادہ کیا تو شبلی انہیں بڑے لطیف پیرائے میں روکتے ہیں:۔

"علماء ادب کہتے ہیں کہ حسان بن ثابت جاہلیت کے نامور شعراء میں تھے لیکن اسلام آیا اور نعت کہنی شروع کی تو ان کا کلام مرتبہ سے گر گیا۔ فارسی میں دیکھئے، نعت گو بہت کم پھیلے ہیں خسرو کے سوا اور خیر جامی بھی سہی۔ باقی جتنے بھی ہیں بہت کم رتبہ ہیں اور صاف نظر آتا ہے کہ نعت گوئی نے ان کو ایسا بنایا ہے۔۔ مقصود اس دراز نفسی سے یہ ہے کہ آپ بھی اس میدان میں نہ آئیے۔ ثواب مقصود ہے تو درود پڑھ لیا کیجئے۔"

آخری جملہ "عالمانہ سنجیدگی اور حکیمانہ شوخی" کی بڑی عمدہ مثال ہے۔ انہیں مولانا شیروانی کو شادی کی مبارکباد دیتے ہیں:۔

"مکرمی مبارک، مبارک، سلامت۔
مگر حضرت یہ اکل کھرا پن کیسا، خبر تک نہ کی، دعوت میں بلانا تو بڑی بات ہے۔ نیاز مندوں کی خدمت بڑھ گئی یعنی ایک جان کے ساتھ دو جانوں کی سلامتی کی دعا ذمہ ٹھہری۔"[1]

مہدی افادی کو لکھتے ہیں:۔

"مکرمی، عنایت نامہ پہنچا، آپ کا خط بھی ایک دلچسپ آرٹیکل ہوتا ہے لیکن اس کی داد دی تو ہم دونوں 'حاجی' ہوئے جاتے ہیں۔" بیگم مہدی کے نام سلام لکھتے ہیں تو کس قدر پر لطف اور انوکھا پیرائیہ بیان اختیار کرتے ہیں:

"حرم سے گو اب تک نامحرم ہوں لیکن ایمان بالغیب کا سلام کہہ دیجئے۔"

بیگم مہدی شبلی سے پردہ کرتی تھیں۔ اس سلسلے میں مہدی کو لکھتے ہیں:۔

"ہم جیسے نفوس قدسیہ سے بھی پردہ اور وہ بھی ساٹھ برس بعد۔"[2]

---

[1] مکاتیب اول۔ ص ۱۴۰ [2] مکاتیب دوم۔ ص ۲۳۴

قاضی تلمذ حسین مہدی کے جاننے والے اور گورکھپور ہی کے رہنے والے تھے۔ وہ ندوہ میں ملازم ہو گئے تھے۔ ان کے متعلق مہدی کو لکھتے ہیں:۔

"قاضی صاحب ہمارے کام کے آدمی نکلے۔ ہنچا سنتے ہوتے تو خوش صحبت بھی تھے، جوان ہوتا تو ان سے باتیں کر لیتا۔ بڑھاپے میں اذان دینا ذرا مشکل ہے۔"[۱]

ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"کشمیر کا دیکھنا کچھ کم نعمت نہیں۔ پہلے نہ دیکھا تو قیامت ہیں۔۔۔۔ جنت میں اس کا نمونہ دیکھنے میں آئے گا مگر اصل و نقل میں پھر بھی فرق ہے۔"

"البتہ چمنستان بمبئی کو چھوڑنا فردوس کو چھوڑنا ہے جو ایک زاہد سے ممکن نہیں۔"

طنز کا ایک نمونہ بھی ملاحظہ ہو:۔

"جن عقائد کا مجھ سے اقرار کرایا جائے گا، ان میں کراماتِ اولیاء الحق بھی ہیں حالاں کہ میں کراماتِ الشیاطین حق کا بھی قائل ہوں۔"

پاؤں میں چوٹ لگی ہے۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"میں لکھنؤ میں اگر کوٹھے پر چڑھوں تو حضرتِ ادریس کی طرح پھر کبھی اترنا نصیب نہ ہوگا کوئی مکان ملتا تو فوراً آتا۔"

عطیہ بیگم فیضی کی شادی ایک یہودی سے ہوئی، تو مہدی افادی کو لکھا:۔

"قرآن میں ہے کہ یہودی ذلیل و خوار بنا دیئے گئے لیکن کیا ہ۔ دسمبر ۱۲ء کے بعد جس دن کہ ایک یہودی کو ہاتھ آئی۔ مشہور کیا گیا ہے کہ وہ مسلمان ہو گیا، اس لئے تو نہیں کہ میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا، خیر سلجہ راز زنار کردست و کند۔"[۲]

مولانا شبلی نے مولانا حمید الدین، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الباری، مولانا مسعود علی اور مولانا عبد الماجد دریا بادی کو جو خطوط لکھے ہیں ان کا رنگ یکساں ہے۔ ان خطوط میں خالص علمی اور تعلیمی گفتگو ہے

۱۔ مکاتیب دوم۔ ص ۲۲۴ ۲۔ مکاتیب دوم۔ ص ۲۳۲

جو بظاہر خشک موضوع کہا جا سکتا ہے لیکن مولانا کے طرزِ تحریر نے کہیں عبارت کو بوجھل نہیں ہونے دیا ہے مکاتیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا خطوط بڑے شوق سے لکھتے تھے اور غالب کی طرح یہ ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اسی لئے ان خطوط میں زندگی موجود ہے۔ ان مکاتیب کے بارے میں ڈاکٹر خورشید الاسلام لکھتے ہیں:۔

"شبلی کے خطوط ہمارا قومی اعمال نامہ ہیں۔ ان میں شبلی کی خانگی زندگی نمایاں نہیں ہے لیکن پس پردہ جلوؤں کی ایسی کمی بھی نہیں ہے۔ بہر حال ان خطوط میں ندوہ کے نقوش ہیں، سیرت پر مکالمات ہیں، شعر العجم کے مباحثہ پر گفتگو ہے، نادر کتابوں کی دریافت پر خوشی کا اظہار ہے، تبصرے ہیں، تنقیدی اشارات ہیں، دوستوں سے سرگوشیاں ہیں، عزیزوں کی سفارش ہے، اپنی عظمت کا شعور ہے اور وہ لطائف ہیں جو روح و بدن کو سرشار کئے بغیر حاصل نہیں ہوتے۔"[1]

شبلی نہ صرف یہ کہ اپنی عظمت کا بھرپور شعور رکھتے تھے بلکہ ساتھ ہی ان میں اثباتِ ذات کا جذبہ بھی بڑا نمایاں تھا اور دیکھا جائے تو اسی جذبے نے شبلی کو شبلی بنایا۔ اثباتِ ذات کے لیے وہ ہمیشہ نئے نئے میدان تلاش کرتے رہتے تھے۔ وہ کبھی اپنے آپ کو کسی ایک مقصد کے لیے وقف نہ کر سکے یہی وجہ ہے کہ ان کی طبیعت مختلف رجحانات کی آماجگاہ بن گئی اور آخر عمر تک وہ یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ وہ خود کو کس کام کے لیے وقف کریں۔ مولانا ابوالکلام سے پوچھتے ہیں:

"آپ نے یہ نہ لکھا کہ کون سا کام لے کر بیٹھوں، میں خود یہی چاہتا ہوں لیکن ابھی تک مختلف مقاصد میں سے کسی ایک کا قطعی انتخاب نہیں ہوتا۔"

ایک خط میں مولانا آزاد کے ساتھ مل کر قومی کام کرنے کی بھی خواہش ظاہر کی ہے:۔

"آپ نے بہت اونچا نصب العین رکھا ہے ورنہ جی یہ چاہتا تھا کہ سب طرف سے نظر بند کر کے وہیں آ رہتا اور آپ کے ساتھ مل کر کوئی ضروری خدمت انجام دیتا۔ اس وقت مسلمان سخت پراگندہ اور پریشان خیال اور پریشان عمل ہو رہے ہیں، کسی

---

[1] تنقیدیں۔ ص ۵۸۔

خاص مرکز پر ان کو لانا ہے ورنہ ہر طرف سے بھٹکتے بھٹکتے آخر بالکل برباد ہو جائیں گے۔"

علی گڑھ سے قطع تعلق کر کے انہوں نے بڑی اُمیدوں اور آرزوؤں سے ندوہ کی بنیاد ڈالی لیکن ندوہ میں وہ مستقل قیام نہ کر سکے اور نہ وہ ندوہ کے کاموں کی پوری ذمہ داری لینے کے لیے کبھی تیار ہوئے لیکن یہ ضرور چاہتے تھے کہ ہر کام میں ان کی رائے اور مشورے کو ملحوظ رکھا جائے۔ مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی کو لکھتے ہیں:۔

"اگر نظامت کے قابل ہوتا تو خود اپنا نام کسی دوست سے پیش کراتا کیوں کہ اس موقعہ پر خاکساری کرنا ایمانداری کے خلاف تھا لیکن میں اس عہدہ کے ناقابل ہوں میں بادشاہ بن کر کام نہیں کر سکتا، بلکہ وزیر بن کر کر سکتا ہوں۔ بجز امیری نظامت سے ندوہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، بلکہ اُلٹا نقصان ہو گا۔ ہاں ایسا شخص منتخب کیجئے کہ جب میں کام کرنا چاہوں وہ میری خواہ مخواہ مخالفت نہ کرے اور ذاتی تعلقات کو دخل نہ دے۔"

شبلی ندوہ کی چھوٹی سی دُنیا میں محصور رہنے پر ہرگز تیار نہیں تھے اور اثبات ذات کا جذبہ ندوہ سے باہر بھی سامان تسکین تلاش کرتا تھا۔ چنانچہ جب وہ ندوہ سے مستعفی ہوئے تو انہوں نے دار المصنفین کی داغ بیل ڈالی۔ ابھی دار المصنفین کا قیام عمل میں آیا تھا کہ انہوں نے مولوی مسعود علی کو لکھا:۔

"باغ ہے، بنگلہ ہے، گرکچویٹ ہیں، اسکول ہے، تعلیمی انجمن ہے اور حسب تنخواہ کام کرتے ہیں نہ کہ وہاں سگان بازاری کے ساتھ عوعو میں مبتلا ہوتا۔ دار المصنفین بھی شروع ہو جائے گا۔"

اثبات ذات کی شدت کا بین ثبوت وہ کلمات بھی ہیں جو اپنے ہمعصر ادیبوں کے متعلق ان کے خطوط میں ملتے ہیں۔ محمد حسین آزاد کے سخندان فارس کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:۔

"آزاد کا سخندانِ فارس حصہ دوم نکلا۔ سُبحَانَ اللہ لیکن اَلحَمدُ لِلّٰہِ میرے شعر العجم کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔"

——ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

"آزاد کی کتاب آئی۔ جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں تاہم اِدھر اُدھر کی گپیں بھی ہانک دیتا تو وحی معلوم ہوتی لیکن خدا کا شکر ہے کہ گیارہ لیکچر تک اس نے میری سرحد میں قدم نہیں رکھا، بارہویں میں یہ میدان میں اُترا ہے لیکن زور پہلے صرف ہو چکا تھا۔ یونہی سرسری چکر لگا کر نکل گیا۔" [1]

حالی اور شبلی کی معاصرانہ چشمک کا حال اردو ادب کے طالب علموں سے پوشیدہ نہیں —— مہدی افادی نے اس چشمک کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ حالی کی کتاب "حیات جاوید" کے بارے میں جب شبلی سے رائے پوچھی گئی تو انہوں نے لکھا:-

"حیات جاوید کی نسبت رائے پوچھتے ہو؟ میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ تم مقلد نہیں مجتہد ہو۔ پھر تقلید کیوں کرو، وہ بھی چھوٹی اُمت کی۔"

——دوسرے خط میں اسی کتاب کے بارے میں ذرا تفصیل سے لکھا ہے:

"حیاتِ جاوید میں مولانا حالی نے سید صاحب کی یکرخی تصویر دکھائی ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی کے معائب دکھانا تنگ خیالی اور بدطینی ہے لیکن اگر یہ صحیح ہے تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں۔ پھر ایشیائی شاعری میں کیا بُرائی ہے سوائے اس کے کہ وہ محض دعوے کرتے تھے، واقعات کی شہادت نہیں پیش کرتے تھے۔ بہرحال حیاتِ جاوید کو مُدلّل مدّاحی سمجھتا ہوں۔" [2]

---

[1] مکاتیب دوم۔ ص ۲۱۲ ؛ [2] حیاتِ جاوید کے سوا شبلی نے حالی کی دیگر تصانیف کی خوب داد دی ہے بلکہ یادگارِ غالب اور حیاتِ سعدی کی مبالغہ آمیز الفاظ میں تعریف کی ہے۔ میں پروفیسر آل احمد سرور کی اس رائے سے متفق ہوں کہ حیاتِ جاوید کے بارے میں اچھی رائے نہ لکھنے کی وجہ سوانح نگار سے بدظنی نہ تھی۔

مولوی نذیر احمد کے بارے میں اگرچہ تفصیل کے ساتھ کچھ نہیں لکھا ہے تاہم ان کے دل کی بات ابوالکلام کے نام ایک خط میں اس طرح ظاہر ہو گئی ہے :-

"ہاں اور سنئے افتخار عالم صاحب مولوی نذیر احمد کی لائف لکھ کر انہی آلودہ ہاتھوں سے حیات شبلی کو چھونا چاہتے ہیں اجازت اور حالات مانگتے ہیں۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ ظاہری حالات تو ہر جگہ سے مل جائیں گے لیکن عالم اسرار پر خدا کے سوا ایک اور بھی ہے وہاں سے منگوایئے۔ بھئی بتا تو نہ دو گے ایسے لوگ لائف لکھیں تو کس کو خوشی ہو گی"۔[1]

"انہی آلودہ ہاتھوں" پر توجہ کی ضرورت ہے۔

مکاتیب شبلی کے علاوہ شبلی کے خطوط کا ایک اور مجموعہ بھی ہے جو خطوط شبلی کے نام سے چھپا ہے۔ مکاتیب میں شبلی ایک عالم اور ادیب کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں لیکن خطوط میں ان کی شخصیت کے وہ پہلو سامنے آ گئے ہیں کہ جن کے بغیر شبلی کی شخصیت کا بھرپور اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ خطوط شبلی نے زہرا بیگم اور عطیہ بیگم کے نام لکھے ہیں۔ پروفیسر خورشید الاسلام ان خطوط کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"وہ مکاتیب جو عطیہ فیضی کے نام ہیں، خاصہ کی چیز ہیں اور میں انہیں انسانوں کے لیے نیک فال سمجھتا ہوں۔ اچھی زندگی نہ بے ضابطہ ہوتی ہے نہ باضابطہ۔ مذہب، فلسفہ اور رسوم زندگی میں مدد دیتے ہیں لیکن وہ بذات خود زندگی ہیں اور نہ زندگی کا مقصود "دین قیم" ایک اور صرف ایک ہے۔ زندگی کا احترام۔ یہ آرزو بھی ہے اور مدعا بھی ہے۔ لطف اسی میں ہے کہ بدن کی باریک سے باریک نسیں اعصاب کا ایک ایک ذرہ زندگی سے خراج لے اور جگمگا اٹھے۔ خدا کی عبادت کے ساتھ اپنی عبادت بھی ضروری ہے ..... روح کے لطایف اور وظایف بھی ہیں

گذشتہ سے پیوستہ: بلکہ سوانح کے سپرد سے بعض اختلافات کی بنا پر یہ رائے قایم کی گئی تھی۔

[1] - مکاتیب اول - ص ۲۶۴

لیکن بدن کے لطائف اور وظائف حسین بھی ہیں اور پاک بھی ہیں..... بہترین محبت وہ ہے جس میں ہوس اور لطافتیں پیوست ہو گئی ہوں۔ شبلی اور عطیہ فیضی کی محبت کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا لیکن ان مکاتیب میں ایک صحت مند جذبہ ضرور ملتا ہے۔ افسوس ہے کہ یہ خطوط شبلی کے شباب کی داستان نہیں ہیں ورنہ ہماری زبان میں نئی راہیں کھل جاتیں۔"[۱]

شبلی جن دنوں قسطنطنیہ میں تھے وہاں بمبئی کے ایک خاندان کے ساتھ ان کے مراسم پیدا ہو گئے، جن میں آگے چل کر بڑی ترقی ہوئی۔ زہرا بیگم اور عطیہ بیگم اسی خاندان کی دو لڑکیاں تھیں، انہوں نے زمانہ کے رواج کے خلاف اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور قومی اور سماجی کاموں میں حصہ لیتی تھیں اور پردہ نہیں کرتی تھیں۔ مولانا جب بمبئی گئے تو وہاں یہ تعلقات مزید استوار ہو گئے اور اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ خطوط شبلی میں عطیہ فیضی کے نام کل ۵۵ خط ہیں۔ ان خطوط کے بارے میں مولوی عبدالحق کی رائے ہے کہ:

"میں مولانا شبلی کے ان خطوں کو جو انہوں نے زہرا بیگم اور عطیہ بیگم کے نام لکھے ہیں، کئی لحاظ سے قابل قدر سمجھتا ہوں، ایک تو ان کا طرز بیان نہایت سادہ، بے تکلف اور دلچسپ ہے جو ان کی دوسری تصانیف اور رقعات میں نہیں پایا جاتا، دوسرے ان میں مولانا کے بعض ایسے خیالات پائے جاتے ہیں جو ان کی تصانیف میں کہیں نظر نہیں آتے اور نہ شاید گفتگو میں ان کا ذکر انہوں نے فرمایا..... تیسرے ان خطوں سے محبت اور خلوص کی بو آتی ہے جو ان کے دوسرے رقعات میں نہیں ہے اور یہ ایک بہت بڑی وجہ ان کی دلچسپی اور قدر کی ہے۔"[۲]

ان خطوط کی بنا پر شبلی کی حیات معاشقہ کو ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے جسے بعض حلقوں میں بہت ہی ناپسند کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ شروع میں نہ صرف ان خطوط پر بلکہ شبلی اور عطیہ بیگم کے تعلقات کو بھی اخفا میں رکھنے کی کوشش کی گئی۔

---

[۱] خورشید الاسلام۔ تنقیدیں۔ ص ۵۹-۶۱۔ [۲] خطوط شبلی۔ مقدمہ۔

سید سلیمان ندوی نے جب حیاتِ شبلی لکھی جو بذاتِ خود ایک بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔ اس میں بھی اسی سبب سے ان باتوں سے اغماض برتا گیا کہ اس تذکرے سے شبلی کی مولویت اور ثقاہت کے مجروح ہونے کا خدشہ تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان خطوں کی اشاعت سے شبلی کی شخصیت کے جو پہلو سامنے آئے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ ان کی شخصیت کو کئی اور ابعاد عطا کئے بل کہ ان کی عزت اور زیادہ بڑھ گئی۔ مولانا کی شخصیت بڑی پہلودار تھی۔ وہ ایک زبردست عالم دین، نقاد اور مورخ تھے اور اس کے علاوہ ایک خوش گو شاعر بھی تھے، خود لکھتے ہیں:۔

"ندوہ فرض مذہبی ہے اور شاعری فرض طبعی۔ کس کو چھوڑوں، پھر اسی پر موقوف نہیں
یک دل و صد ہزار سودا، خیر بہر حال گزر جاتی ہے۔" [۱]

فرضِ مذہبی اور فرضِ طبعی کی اسی آویزش کا نام شبلی ہے۔ خورشید الاسلام نے غالباً اسی لئے انھیں یونانی کہا ہے۔

مولانا شبلی کی فطرت جذباتی تھی محبت کا جذبہ ان کے خمیر میں داخل تھا اور حسن کے تو وہ پرستار تھے بقول مہدی افادی:۔

"حسن کہیں ہو، کسی حیثیت سے ہو فطرت کا وہ پاکیزہ مظہر ہے جس سے حافظ کی شرابِ معرفت کی طرح قطع نظر نہیں کی جا سکتی۔ مولانا ادبی حیثیت سے اس کا نہایت صحیح مذاق رکھتے ہیں۔"

جذباتی اور حسن پرست ہونے کے علاوہ جدت پسند بھی تھے۔ پروفیسر آل احمد سرور ان کی جذباتیت اور جدت پسندی کے بارے میں لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:۔

"شبلی بڑے جذباتی آدمی تھے، وہ شاعر و نکتہ سنج تھے، وہ خاصے جدت پسند تھے اور اپنے حلقے سے بہت آگے دیکھتے تھے۔ وہ ڈاکٹر انصاری کے قدموں کا بوسہ لینے کے لیے تیار تھے محض اس لئے کہ وہ ترکوں کی خدمت کے لیے جا رہے تھے پھر انھوں نے اگر بعض تعلیم یافتہ خواتین کی ہمت افزائی کی تو اس سے خواہ مخواہ غلط نتیجے نہ نکالنا چاہئیں۔" [۲]

۱۔ مکاتیب شبلی اوّل۔ ص ۷۔ ۲۔ آل احمد سرور۔ تنقیدی اشارے۔ ص ۶۷

ڈاکٹر انصاری کے قدموں کا بوسہ اور تعلیم یافتہ خواتین کی ہمت افزائی ان دونوں کے پیچھے جو جذبہ کارفرما تھا، اس کی اساس شبلی کی رومان پسند اور حسن پرست طبیعت پر تھی۔ ڈاکٹر انصاری کے قدموں میں بھی انہیں حسن نظر آیا اور یہی حسن انہیں عطیہ اور زہرا فیضی میں بھی نظر آیا جو ترقی پسند اور روشن خیال ہونے کی بنا پر اس دور کی خواتین میں جرأت، لیاقت اور استعداد علمی میں ممتاز تھیں۔ عطیہ فیضی سے شبلی کو نہایت محبت تھی، اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، یہ محبت لاکھ ضبط کے باوجود بھی ان کے خطوط کے ایک ایک لفظ سے چھلکتی پڑتی ہے، ان میں جذبات کی شفاف موجیں الفاظ سے بوس و کنار میں مصروف نظر آتی ہیں۔[۱]

"قرۃ العینی! تمہارا خط جو مدت کے بعد ملا تو بے ساختہ میں نے آنکھوں سے لگا لیا اور دیر تک بار بار پڑھتا رہا۔ افسوس کہ دیر تک ملنے کی امید نہیں، بمبئی یا جزیرہ دو قدم پر تھے۔ زہرا صاحبہ نے تھوڑی رد و کد کے بعد منظور کر لیا کہ پھر کبھی لکھوائیں۔ لیکن تم اتنی غریب نوازی کیوں کرو گی۔"

اپنی ایک تمنا کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اصل یہ ہے کہ میں چاہتا تھا کہ میرے کام میں تمہارے نام کی شرکت ہو۔ اس کا اصلی طریقہ یہ تھا کہ کوئی تصنیف تمہارے نام ڈیڈیکیٹ کرتا لیکن افسوس نہیں کر سکتا، جن حالات میں گھرا ہوا ہوں تم سمجھتی ہو اور جانتی ہو کہ اس سے دفعتاً ان کاموں کو نقصان پہنچ جائے گا جو میرے ہاتھ میں ہیں۔"[۲]

عطیہ کی بہن کو لکھتے ہیں:

"جناب والد صاحب اور جناب نواب بیگم صاحبہ کو آداب تسلیم کہیے لیکن عطیہ کو کچھ نہیں۔ کچھ نہیں، میں شبلی نے وہ سب کہہ دیا ہے جو وہ کہنا چاہتے تھے۔"

غرض عطیہ سے انہیں محبت تھی لیکن اس محبت میں عطیہ کے حسن صورت کے ساتھ ساتھ

۱۔ خورشید الاسلام۔ تنقیدیں۔ ۲۔ خطوط شبلی۔ ص ۲۲۔

حسنِ سیرت کو بھی دخل تھا اور اگر یہ کہا جائے کہ حسنِ سیرت کا حصہ اس میں غالب تھا تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ شبلی کو اپنی ذاتی زندگی میں محرومی نصیب ہوئی تھی۔ انھوں نے دوسری شادی بھی کی تھی لیکن دوسری بیوی بھی نہ خوب صورت ہی تھی اور نہ تعلیم یافتہ۔ ایک خط میں اس کا بڑی حسرت سے اظہار کرتے ہیں:

"تم جانتے ہو کہ حسنِ صورت کی نوبت ہو چکی۔ میری قسمت میں دونوں کا اجتماع نہ تھا، اب کوئی چیز مایۂ تسکین ہو سکتی ہے تو صرف حسنِ سیرت ہے اس لئے تعلیم سب سے مقدم ہے۔"

عطیہ فیضی میں شبلی کو اپنی آئیڈیل عورت کے خط و خال مل گئے اور وہ اس پر ایمان لے آئے۔ عطیہ بیگم فیضی اپنے زمانے کی بہت ہی پڑھی لکھی خاتون تھیں اور خاصی ترقی پسند تھیں۔ نہ صرف شبلی بلکہ اقبال، ابوالکلام آزاد، سجاد حیدر یلدرم اور شیخ عبدالقادر ان سے متاثر ہوئے۔ غرض:

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے　　　سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

——— اور اس اسیری کی وجہ عطیہ بیگم فیضی کی خاندانی وجاہت اور خوش رُوئی کے علاوہ ان کی ترقی پسندی اور اس کی علمی استعداد بھی تھی۔ جن دنوں اقبال لندن میں اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہے تھے تو اُن کی ملاقات عطیہ فیضی سے ہوئی، جو اس وقت بقول خود قدیم و جدید فلسفہ کا مطالعہ ختم کر چکی تھی۔ اقبال کی خواہش تھی کہ عطیہ بیگم ان کا تحقیقی مقالہ شروع سے آخر تک سُنیں، چنانچہ ایک دوسری صحبت میں یہ خواہش پوری کی گئی۔ عطیہ بیگم کا بیان ہے کہ اقبال نے اس صحبت میں اپنا پورا مقالہ پڑھا جس سے ان کی دقتِ نظر اور تلاش و تحقیق کا اندازہ ہوتا تھا۔ مقالہ ختم کرنے کے بعد انہوں نے عطیہ بیگم سے مقالے پر تبصرے کی فرمائش کی اور عطیہ نے جو جو مشورے دیئے وہ ان کو اپنے مقالے میں شامل کرنے کے لیے ایک کاغذ پر نوٹ کرتے گئے۔[1] یہ تھی اس خاتون کی علمی استعداد، پھر بھلا شبلی اس سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے۔ عبدالقادر کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اس اثناء میں زہرہ اور عطیہ فیضی کے بہت سے خطوط آئے اور بعض میں علمی مضامین

---

[1] خطوطِ اقبال بنام عطیہ فیضی — ص ۵۶

بھی تھے۔ ان ظالموں کی اردو نویسی پر مجھ کو تعجب ہوتا ہے۔"[1]

یہ مکتوب ۵ مئی ۱۹۰۸ء کا ہے۔ ۲۴ نومبر کو مہدی افادی کو لکھتے ہیں:۔

"ان صحبتوں میں اس کی قابلیتوں کے حیرت انگیز پہلو نظر سے گزر رہے ہیں۔ اردو، فارسی، انگریزی، فرنچ، زباندانی، مصوری، نقشہ کشی، پالیٹیکس، قوت تحریر۔ ع

"آنچہ عالم ہمہ می داشتند تو تنہا داری"[2]

عطیہ کی انہی صلاحیتوں نے شبلی کو اپنی زلف گرہ گیر کا اسیر بنا دیا۔ اس دوران میں انھوں نے جو خط لکھے وہ پڑھنے کی چیز ہیں۔ ان خطوط کے بارے میں عبد اللطیف اعظمی لکھتے ہیں:۔

"نہ صرف مولانا کے خطوط میں بل کہ اردو زبان کے بہترین خطوط وہ ہیں جو عطیہ بیگم اور زہرہ بیگم کے نام لکھے گئے ہیں۔"[3]

مولوی عبد الحق جنہوں نے خطوط شبلی پر مقدمہ بھی لکھا اور ان خطوط کی اشاعت پر زور دیا، لکھتے ہیں:

"یہ خطوط سدا بہار ہیں اس لئے کہ یہ تکلف اور بناوٹ سے بری ہیں۔ یہ دلی جذبات اور خیالات کے نقوش ہیں جو بے ساختہ قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ بے ریائی اور خلوص کی سچی تصویریں ہیں جن کے ادا کرنے میں ادبی تکلفات اور انشا پردازی کے داؤ پیچوں سے مطلق کام نہیں لیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے پڑھنے والوں کے دل لبھائیں گے اور ان کے شوق کو تازہ رکھیں گے۔"[4]

ان خطوط میں عورتوں کے بارے میں جو خیالات ظاہر ہوئے ہیں وہ شبلی کی دوسری تحریروں سے ظاہر نہیں ہوتے بل کہ ان میں تضاد بھی نظر آتا ہے خاص طور پر موسیقی تعلیم نسواں اور پردے کے متعلق۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شبلی پردے کے زبردست حامی اور مؤید تھے اس سلسلے میں الندوہ کی تحریریں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن عطیہ بیگم کی بے پردگی کو وہ مستحسن سمجھتے ہیں۔ عطیہ بیگم کو موسیقی اور فن تقریر

---

[1] مکاتیب شبلی اول۔ ص ۲۱۶ ۔ [2] مکاتیب شبلی دوم۔ ص ۲۲۰ ۔
[3] شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں۔ ص ۱۱۹ ۔ [4] خطوط شبلی۔ مقدمہ ۔

سیکھنے کی ترغیب دیتے ہیں صرف اتنا ہی نہیں بل کہ عورتوں کی معاشی آزادی کے لیے تعلیم نسواں کی حمایت کرتے ہیں:۔

"ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہو تو تم اجازت دو کہ لوگ تمہیں پوجیں وانا اول العابدین۔" ؎

"عورتوں کے متعلق تمہاری رائے ہے کہ وہ دینوی اور معاشی علوم کم پڑھیں اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں لیکن یاد رکھو کہ مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کئے اس بل پر کئے کہ عورتیں ان کی دست نگر تھیں تم عورتوں کا بہادر اور دلیر پیکر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو لیکن یہ تو پرانا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان پان، چھوئی موئی اور روئی کا گالا ہونا چاہیئے۔ جمال اور حسن نزاکت پر موقوف نہیں۔ تنومندی، دلیری، دلو پیکری اور شجاعت میں بھی حسن و جمال قائم رہ سکتا ہے۔"

بے پردہ اسٹیج پر آنے کی ترغیب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لیکچرار بن جائیں جو انگریز اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں لیکن اردو میں تاکہ ہم لوگ بھی سمجھ سکیں۔ آپ میں ہر قسم کی قابلیت موجود ہے صرف مشق کی ضرورت ہے۔ ہم پرانے لوگ عورتوں کا آزادی سے بے پردہ مجامع میں تقریر کرنا پسند نہیں کرتے لیکن آپ تو اس میدان میں آچکی ہیں، اس لئے اب جو کچھ ہو کمال کے درجہ پر ہو۔"

یہ تضاد ریاکاری کا نتیجہ نہیں بل کہ بشریت کے سبب سے ہے۔ شبلی اپنے زمانے سے نہ صرف بہت آگے تھے، بل کہ اپنے ہمعصروں کے مقابلے میں زیادہ بھرپور انسان تھے۔ یہی وہ خوبی ہے جس کی بنا پر ان کے عقائد و نظریات سے لاکھ اختلاف کے باوجود بھی ان سے محبت کی جا سکتی ہے۔

؎ خطوط شبلی۔ ص ۲۲۔

مہدی حسن جو ادبی دنیا میں مہدی افادی کے نام سے زیادہ معروف ہیں، اگرچہ اس لحاظ سے باقاعدہ ادیبوں کی صف میں جگہ نہیں پا سکتے کہ انہوں نے کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی، تاہم ان کے کچھ خطوط اور چند مضامین جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے، اپنے مخصوص اسلوب بیان کے باعث ہمیشہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ افادات مہدی ان کے چند مضامین کا مجموعہ ہے اور مکاتیب مہدی ان کے خطوط کا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ تحصیلدار تھے چنانچہ کاغذات پٹواری کی جانچ پڑتال نے کبھی اتنی فرصت نہ دی کہ یکسو ہو کر ادب کی تخلیق کر سکیں لیکن ذوق ادب کی فراوانی اس قدر تھی کہ اپنے زمانے کے تقریباً سبھی معروف ادیبوں اور شاعروں سے مراسلت تھی۔ ان میں حالی، شبلی، ناصر علی دہلوی، عبدالرزاق کانپوری، ریاض خیرآبادی، دلگیر اکبرآبادی، ہوش بلگرامی، عبدالماجد دریابادی، سید سلیمان ندوی اور عبدالباری ندوی قابل ذکر ہیں۔ مہدی افادی غالب اور شبلی کی طرح بڑی دلچسپی اور ذوق و شوق کے ساتھ خط لکھتے تھے، اپنے فرائض منصبی سے جب بھی انہیں فرصت ملتی تو وہ یا تو کتابیں پڑھتے یا خط لکھتے تھے۔ ان خطوں کے لکھنے میں وہ کاوش سے کام لیتے تھے اور ان سے ان کے "مذاق خاص کی خوب غمازی" ہوتی ہے۔ ان خطوں کی دلچسپی کی ایک بڑی وجہ مہدی کی رنگین اور جمالیاتی شخصیت بھی ہے۔ یہ اسی رنگینی اور ذوق جمال کا اثر تھا کہ وہ ہر شے کو لباس حسن سے آراستہ دیکھنا پسند کرتے تھے یہاں تک کہ خطوں کے لیے بھی دیدہ زیب کاغذ ہی استعمال کرتے تھے۔ شبلی کو جیسا کاغذ ملتا اسی پر لکھ دیتے تھے، مہدی کا ذوق جمال بھلا اسے کیسے گوارا کرتا، وہ شبلی کو نہایت نفیس لفافے اور خط کے کاغذ بھیجتے رہتے تاکہ شبلی کے جو خط ان کے پاس آئیں معنوی حسن کے ساتھ ساتھ حسن ظاہری سے بھی آراستہ ہوں۔ اس قسم کا اہتمام وہ کتابوں اور رسائل میں بھی کرتے تھے۔ چنانچہ اپنی کتابوں کی خوبصورت جلد بندی کرا دیتے تھے۔ ایک دفعہ 'معارف' اچھی حالت میں نہ پہنچا، انہوں نے بغیر دیکھے واپس کر دیا اور لکھا:

"میرا معارف اگر آپ نہیں بدل سکتے تو واپس کیجئے۔ کانپور کا کوئی نامی پریس میرے لئے صفحات خاصہ چھاپ لے گا۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے لیکن تاوان کابل منیجر صاحب کی جیب ٹٹولے گا۔"

دارالمصنفین کے ساتھ انہیں خاصا تعلق تھا، چناں چہ اس ادارے سے شائع ہونے والی کتابوں کے بارے میں وہ برابر مشورے دیتے رہتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"یہ غلط ہے کہ فلسفہ حسن آرائش و زیبائش سے بے نیاز ہو عورت کتنی ہی حسین ہو لیکن بیوگی کے بعد وہ جوبن نہیں رہتا۔ ہیرا تراش لونگ کے اترتے ہی اس کی سج دھج، تراش خراش سب میں فرق آجاتا ہے۔ مطبوعات دارالمصنفین کی طرح بالکل سادی اور رسالہ کی طرح کسی قسم کی بیل سے مبرا ہوتی ہے۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ حاشیے غیر تراشیدہ۔"

مہدی اپنے رہن سہن، لباس اور خوراک میں بھی نفاست کا اہتمام کرتے تھے، بیگم مہدی کا بیان ہے کہ وہ گھنٹوں درزی کے پاس بیٹھ کر اپنے کپڑوں کی تراش خراش کے بارے میں اسے مشورے دیتے تھے۔ عبارت میں بھی کوئی لفظ بھدا یا ثقیل ہوتا تو ان کے طبع سلیم پر گراں گزرتا تھا۔ ایک دفعہ مولوی عبدالسلام ندوی نے اپنے ایک مضمون میں "پادر ہوا" اور "نقش بر آب" کے الفاظ استعمال کئے تو مہدی نے لکھا:۔

"مولوی عبدالسلام نے فلسفہ لیبان کے عنوان سے "مساوات" پر اچھی خاصی تنقید کی۔ آخر میں کہتے ہیں "لیبان کے دلائل پادر ہوا اور نقش بر آب ہیں"۔ وہی مولویت کا اثر۔ لیبان کی متبسمانہ خاموشی دیکھئے کیا کہہ رہی ہے۔ اظہار رائے سے تشکیل رائے زیادہ دقت چاہتی ہے۔ بہر حال اس تصریح نے نتیجہ تنقید کا سارا لطف کھو دیا۔ قلم کا وزن احتیاط چاہتا ہے۔ میری معروضات "حکمت بہ لقمان آموختن" کی حیثیت سے ہیں۔ میں خدا جانے آپ لوگوں سے کیا چاہتا ہوں۔ کم سے کم ایک بلند پایہ معیار لطافت جو خود آپ کو اردو لٹریچر میں پیدا کرنا ہوگا اور جس کی نظیر آپ کو صرف مغربی زبانوں کے رکھ رکھاؤ میں مل سکتی ہے۔"

عربی اور فارسی کے ثقیل الفاظ کے علاوہ مہدی کو یہ بھی پسند نہیں تھا کہ اردو میں انگریزی

کے الفاظ کا استعمال کیا جائے۔ عبدالباری ندوی کو لکھتے ہیں:۔

"مبادی کے دیباچہ میں اسٹائل اور اسٹوڈنٹ کی پیوندکاری کس ضرورت سے ہے۔ آپ کی انگریزی دانی مسلّم، اچھا نظر بد کا اسپند ہوگا۔"

مہدی نے بے شمار خطوط لکھے ہیں لیکن مکاتیب مہدی کی ترتیب کے وقت سارے خطوط نہ مل سکے۔ صرف شبلی ہی کو انہوں نے بقول خود سینکڑوں خط لکھے لیکن بدقسمتی سے یہ خط محفوظ نہ رہ سکے مکاتیب میں شبلی کے نام صرف تین خط ملتے ہیں۔ بیگم مہدی اس سلسلے میں لکھتی ہیں:۔

"اس کا افسوس ہے کہ مرحوم کے بہت سے خطوط حاصل نہ کر سکی۔ خاص کر مولانا شبلی کو انہوں نے کیسے کیسے بہترین خطوط لکھے لیکن مولانا مرحوم نے باوجود اتنے خلوص کے اور قدردانی کے ساتھ بھی خطوں کو محفوظ نہیں رکھا۔"[1]

یہی حال ان خطوط کا بھی ہوا جو انہوں نے اپنی لڑکیوں اور دوسرے اعزا کو لکھے تھے۔ یہ بھی مکاتیب مہدی میں شامل نہیں ہو سکے۔ ان خطوں میں انہوں نے ادب تخلیق کرنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ سیدھی سادی باتوں کو بڑے ہی پُرلطف انداز سے ادا کیا ہے۔ ان خطوں کے جو اقتباسات مجنوں گورکھپوری نے اپنے ایک مضمون میں دیئے ہیں انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مہدی غالب کی طرح اس راز سے واقف تھے کہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور روزمرہ کی معمولی باتوں کے بیان میں بھی دلچسپی پیدا کی جا سکتی ہے۔ ایک خط میں بچوں کی شرارتوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:۔

"ایک لڑکا آگے آگے بھاگا جاتا ہے ایک بچہ اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ کچھ اختلاف ہو گیا ہے۔ اس لئے دانت سے کاٹنے کی فکر میں ہے۔ دری کے فرش تک تو یہ گھٹنوں چلا (جسے تم بکیاں کہتی ہو) اس کے بعد ٹاٹ کی رگڑ سے بچنے کے لیے یہ چھوٹا سا دو ٹانگ کا حیوان چوپایہ بن گیا ہے اور اب شاہد کی پنڈلی پر دانت جمانا چاہتا ہے لیکن مدد پہنچ گئی نافذ کا وار خالی ہو گیا۔"

---

[1] مکاتیب مہدی۔ ص ۹۲

اپنی لڑکی کے صحت یاب ہونے پر لکھتے ہیں:۔

"تمہارے ہاتھ کی کھجوروں نے الٰہ آباد کی زندگی کی یاد دلائی۔ کبھی یکجا شرط زندگی تھی۔ تم نے نئے سرے سے زندگی پائی۔ خدا کرے اس درمیان میں تم نے پوری ترقی کر لی ہو اور اس قابل رہو کہ تمہارے خیال سے دل بہلاتا رہوں۔"

ایک اور خط میں ایندھن کا ذکر کرتے ہیں:۔

"لکڑی جل گئی، آج ہی جاتی ہے۔ اتنی اچھی ہے کہ جلانے کے عوض کھانے کو جی چاہے گا۔ سب باہر نہ رکھو، نمک حرام غائب کر دے گا یا بے ضرورت پھونک دیگا۔"

افسوس ہے کہ یہ خطوط شائع نہیں ہوئے، اگر یہ بھی مجموعے میں شامل ہوتے تو اس مجموعے کے متعلق اردو کے نقادوں کی رائے مختلف ہوتی۔

مکاتیب مہدی کے تقریباً سبھی مکتوب ادبی نوعیت کے ہیں اور بقول آل احمد سرور "ان میں عوام کی دلچسپی کی چیزیں کم ہیں۔ ان کی زندگی میں کوئی خاص واقعہ نہیں گزرا جس چیز کو ڈرامائی کہا جا سکتا ہے وہ ان کے یہاں مفقود تھی"[1] لیکن بایں ہمہ یہ خطوط آج بھی دلچسپی سے پڑھے جا سکتے ہیں اور پڑھے جاتے ہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مہدی کا ادبی ذوق بے حد پاکیزہ اور شستہ تھا۔ ان کے خیالات میں غضب کی رعنائی تھی اور خیال کی یہ رعنائی ان کے الفاظ اور ان کے اسلوب سے بھی چھلکی پڑتی ہے۔ یہ خط بہت سے مستند ادیبوں اور نثر نگاروں کے خطوط کے مقابلے میں بذلہ سنجی، خوش طبعی، ذوق جمال اور مذاق ادب کی جیتی جاگتی تصویریں ہونے کی بنا پر بدرجہا بہتر ہیں۔ بقول سید سلیمان ندوی "ان کا قلم باغ و بہار تھا" اور یہ اسی باغ و بہار قلم کا نتیجہ تھا کہ وہ خشک فلسفیانہ مباحث میں بھی رنگینی پیدا کرتے تھے۔ ان کے اسلوب کی انفرادیت کے سبھی قائل تھے یہاں تک کہ شبلی جیسا نثر نگار بھی ان کے پُر لطف انداز بیان اور ان کی بالغ نظری پر رشک کرتا تھا۔ شبلی ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

---

[1] ۔ پروفیسر آل احمد سرور ۔ تنقیدی اشارے ۔ ص ۱۵۶

"... خدا آپ کو، آپ کے دست وقلم کو، آپ کی صنعت گوئی طبع کو قائم رکھے۔ بخدا مجھ کو خوشی سے زیادہ آپ پر رشک آتا ہے۔ کبھی کبھی خط لکھا کیجئے۔"[1]

مہدی نہ صرف اپنے ہی خطوط کو پُر لطف بنانے کا اہتمام کرتے تھے بلکہ دوسروں کے خطوط میں بھی اسی طرز کے متلاشی رہتے تھے کسی کے خط میں اگر اس طرح کی کمی پاتے تو شکایت کرتے تھے۔ ایک دوست کو لکھتے ہیں:۔

"کارڈ پھیکا تھا۔ کچھ اِدھر اُدھر کے تذکرے۔ ادبی چاشنی اور دلچسپیوں کی کمی نہیں ہونی چاہیئے۔ ابھی آپ بہت زندہ ہیں مولویت افسردگی کی مرادف نہ ہونے پائے۔"

مہدی کو اپنے مکاتیب کی ادبی نوعیت پر بڑا ناز تھا، ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"صوبہ متحدہ میں میں نئی قسم کا تحصیلدار ہوں کہ کاغذات پٹواری کے ساتھ ساتھ یہ مشغلہ شریفانہ بھی بیگم کے بعد گلے کا ہار رہتا ہے میری روزانہ بنچ کی ڈاک میں جانے کیا کیا ہوتا ہے اور لطف کی بات یہ کہ ردیات کا قطعی پتہ نہیں۔ سچ یہ ہے کہ تھوڑے سے رکھ رکھاؤ کی ضرورت ہے۔ آج کل کے صاحبزادے کتنے ہی کامیاب ہوں مگر ان کی زندگی ادبی دلچسپیوں سے ایک دم بے نیاز رہتی ہے۔"

مہدی اپنے طرز بیان میں مختلف طریقوں سے شوخی اور شگفتگی پیدا کرتے ہیں، کبھی تلمیح اور رمزیت سے کام لیتے ہیں۔ انتہائی سنجیدہ مباحث میں بھی وہ شوخی سے باز نہیں رہ سکتے تھے۔ بقول آل احمد سرور "مولویوں کے سامنے رندانہ وضع اور رندوں کی محفل میں سنجیدگی کے تیور، یہ عجیب و غریب اجتماع آپ کو مہدی کے یہاں ملے گا۔"[2] بعض اوقات اس شوخی اور شگفتگی کے پیچھے وہ ابتذال اور عریانی کی سرحدوں سے بھی جا ٹکراتے ہیں، لیکن ان کا طرز بیان یہاں بھی ان کے آڑے آتا ہے اور عبارت مبتذل اور عریاں ہونے کی بجائے حسین بن جاتی ہے

---

[1] - مکاتیب شبلی - دوم - ص ۱۹۹ ؛ [2] - تنقیدی اشارے - ص ۱۵۹ +

بقول سید سلیمان ندوی :۔

" ان کا یہ اسلوب تحریر جس قدر لطیف اور نازک ہے، اسی قدر پرخطر ہے۔ وہ اس راستہ میں غار کے منہ تک آجاتے ہیں، مگر قلم کا محتاط قدم اس طرح تل تل کے پڑتا ہے کہ لغزش نہیں ہونے پاتی۔"

مہدی کو "مولویت" اور "زہد خشک" سے چڑ تھی۔ لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جن ادیبوں سے ان کی خط و کتابت تھی وہ زیادہ تر علماء ہی کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ چناں چہ وہ انہیں ان کی "مولویت" پر چھیڑتے رہتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی کی دوسری شادی کا ذکر کرتے ہوئے انہیں ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

" آپ کی "نہیں، نہیں" پر بھی دار المصنفین میں "ملکۂ سبا" کی آمد متوقع چاہتی ہے کہ وہاں آج کل جو آواز نکلے ان سُروں میں ہو۔

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشان ہو گئیں

اپنی دوسری شادی کی اطلاع دیتے ہوئے شبلی کو لکھتے ہیں :۔

" مدت کی تلاش کے بعد وہ "جنس لطیف" ہاتھ آئی جو آپ لوگوں کو دوسری دُنیا میں ملے گی۔ خوف تھا کہیں پت جھڑ شروع نہ ہو جائے لیکن اب تو نئے سرے سے کونپلیں پھوٹتی معلوم ہوتی ہیں۔ آج کل خیام کے فلسفے کا عامل ہوں، کوئی ادا چھوٹنے نہیں پاتی۔"

سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں :۔

" وطن آیا تو دار المصنفین میرے لئے گھر آنگن ہو گا اور آپ سے لوسے بہ پیام کی جگہ آپ عورت ہوتے تو کہتا، لب بہ لب کی ٹھہرے گی۔ آخری فقروں سے آپ کے تقدس میں کچھ فرق تو نہیں آیا۔"

شملہ کے متعلق ایک خط میں جو جملے ان کے قلم سے نکل گئے ہیں، انہیں پڑھنے اور متانت کی رنگینی کی داد دیجئے۔

"وہ شملہ آپ کو پسند نہیں آیا۔ لیکن مجھے تو نام سے بھی دلچسپی ہے، دیکھئے پھولوں کی سیج پر 'جوانی کی ورزش' کی شائقہ اپنے چاہنے والے سے کیا کہتی ہے۔

دوسرا تیسرا یہ حملہ ہے! یہ بھی کیا کوئی شہر شملہ ہے"

سید سلیمان ندوی شبِ زفاف میں بیمار ہو گئے تو انہیں لکھتے ہیں:۔

"میں سنتا تھا مولوی خلوت کے رنگیلے ہوتے ہیں لیکن آپ کی رودادِ عروسی جہاں تک معلوم ہوئی غیر حوصلہ افزا ہے۔ یہ کیا کہ مرعوب ہو کر 'صنفِ قوی' کی آبرو کھوئی خیر گزری کہ علالت نے پردہ رکھ لیا لیکن دوستوں کو قلق رہے گا کہ جب بستر شکن ہونا تھا وہ شاعری کی اصطلاح میں 'شکن بستر' نکلا۔"

عبدالماجد دریا آبادی حیدر آباد کی ملازمت سے کنارہ کش ہو کر لکھنؤ آئے تو انہیں لکھا:۔

"آپ لکھتے ہیں: وقت اپنا ہے قلم اپنا ہے دماغ اپنا ہے، ایک صاحبہ فرماتی ہیں، صاف کیوں نہیں کہتے کہ بیگم اپنی ہیں۔ یہ نکتہ رہ گیا تھا، کمی پوری کئے دیتا ہوں۔"

مولانا عبدالباری ندوی کو لکھتے ہیں:۔

"ہاں جناب ماجد ہوں یا آپ۔ دونوں کی یہ مدرسیت میری سمجھ میں نہیں آتی کہ عورت مرد بنا کر پیش کی جائے اور اس سے انشا پردازی کی سنجیدگی پر استدلال ہو۔ میں نے عورت کے سینہ کے لیے جس پر سبزہ خود رو نہیں ہوتا، آپ لوگوں سے ایک لفظ مانگا تھا، اسی طرح مجھ کو اصرار ہے کہ وہ کرتا نہیں کرتی پہنتی ہے، کیا یہی حیا سوزی ہے جسے باوصف لذت کشی آپ بے نقاب دیکھنا نہیں چاہتے۔"

"باوصفِ لذت کشی" کی ترکیب میں مہدی ہلکے سے طنز کے ساتھ جو مفہوم ادا کر گئے ہیں۔ یہ انہی کا حصہ ہے۔ غرض مہدی کے یہ مکاتیب اردو کے مکاتیبی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں جسے نظر انداز

نہیں کیا جا سکتا۔ مہدی کی طبیعت میں جدت پسندی تھی۔کسی ایسے مضمون کو جسے وہ پہلے بھی ادا کر چکے ہوں اگر دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت پڑی تو ایک دوسرے ہی انداز میں پیش کرتے۔ دوستوں سے خط نہ لکھنے یا خط لکھنے میں تاخیر کرنے کی شکایت کا موقعہ بار بار آتا ہے۔ اس مضمون کو مہدی نے جب بھی ادا کیا ہے تو ہر بار نیا پیرائیہ بیان استعمال کیا ہے۔ اور لطف یہ کہ ہر دفعہ انداز کی شوخی نکھر آتی ہے۔ عبدالماجد دریابادی کا خط دیر میں آیا تو انہیں لکھا:۔

"جس طرح ایک بھوکا خوش ذائقہ کھانے پر گرتا ہے اور جب تک لقمہ تر جلد جلد حلق سے نیچے نہیں اتار لیتا۔ اس کی تسکین نہیں ہوتی، میں چھپانا نہیں چاہتا کہ آپ کے دلچسپ عنایت ناموں کے ساتھ مجھے بھی یہی صورت پیش آتی ہے۔ اس میں میرے 'کنگلے پن' کو اس قدر دخل نہیں جس قدر آپ کے بخل کو کہ یہ نعمت جلد جلد میرے حصہ میں نہیں آتی۔"

—— عبدالباری ندوی کے نام ایک خط میں یہی مضمون اس طرح ادا کیا ہے:۔

"ایسی بھی بے نیازی کیا ہے کہ ہفتوں اور مہینوں ایک کی دوسرے کو خبر نہیں۔ میں اس لئے نہ لکھ سکا کہ آپ باقیدار تھے۔ اس پھیر میں رہا کہ خود آپ کو میرا خیال آئے لیکن آپ کو اغیار سے فرصت نہیں۔ خیر آپ کی ستم کیشی کے مقابلے میں میری وفا کیشی سچ کہئے گا کیسی رہی۔"

—— ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

"آپ کا بالکل پتہ نہیں۔ کیا آپ کے رمضان سے میرے مئی کے شدائد کچھ کم ہیں جو ایک دم سے آپ مہر بلب ہو رہے ہیں۔ "تحریری فاقے" رندمشرب دوستوں کے لیے کسی طرح موزوں نہیں۔ روزہ رکھئے نہ رکھئے مگر مجھے یاد ضرور کیجئے۔"

—— مہدی کے مکاتیب کا یہ تذکرہ میں پروفیسر آل احمد سرور کی مندرجہ ذیل رائے پر ختم کرتا ہوں کہ میرے نزدیک ان خطوط کا اس سے زیادہ جامع اور بھرپور تجزیہ ممکن نہیں:۔

" طرز بیان کی شوخی مہدی کو زندہ رکھنے میں بڑی معاون ہوگی۔ ممکن ہے کہ ادبیات میں جو

نقطۂ نظر مہدی کا تھا وہ نہ رہے اور اسے رہنا بھی نہیں چاہیئے۔ اس لئے ادب میں قوت بڑھنے اور پھیلنے سے آتی ہے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ مکاتیب پھر بھی دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ ان میں وہ جوانی ہے جس پر عمر کا اثر نہیں ہوتا، وہ مستی ہے جو شراب انگور کی ممنون نہیں، وہ بانکپن ہے جس پر سادگی قربان اور وہ سادگی ہے جس پر بانکپن نثار ہے تحصیلوں اور قصبوں کی بے کیف زندگی میں بھی یہ صاحب ذوق حسن کا پرستار اور پجاری رہا۔ شمع انجمن ہو یا چراغ خانہ جہاں روشنی تھی اسے عزیز تھی اور جہاں روشنی کا پتہ نہ تھا وہاں بھی وہ اپنی حرارت عشق سے شعلہ روشن کر لیتا تھا۔ اس نے کتنے مولویوں کو انسان بنانے کی کوشش کی، کتنے بدمذاقوں کی اصلاح کی، کتنے بے راہ روؤں کو ٹوکا، وہ اس میں کامیاب ہوا یا نہیں لیکن اس کی کوشش کیا اس کی ادبی زندگی کی کافی ضمانت نہیں ہے۔"

مولانا آزاد کے مکاتیب کے اب تک چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ان میں جو شہرت غبار خاطر کو حاصل ہوئی وہ کسی اور مجموعے کو حاصل نہ ہو سکی۔ یوں بھی ان کے دوسرے مجموعہ مکاتیب مثلاً کاروان خیال، نقش آزاد اور مکاتیب ابوالکلام جب غبار خاطر کے پس منظر میں پڑھے جاتے ہیں تو بے نظروں سے گر جاتے ہیں، ان میں بھی غبار خاطر کی طرح نجی خطوط کی بے ساختگی مفقود ہے لیکن غبار خاطر کی جو دوسری خصوصیات اس مجموعہ کو طرۂ امتیاز بخشتی ہیں وہ بھی دوسرے مجموعوں میں نہیں ملتیں لیکن بہرحال مولانا کی زندگی اور شخصیت کو جاننے اور سمجھنے میں یہ مکاتیب بھی بہت حد تک مدد دے سکتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے مثلاً کاروان خیال کے شروع کے دو ایک خطوں سے کچھ تاریخوں کا تعین ہو جاتا ہے جن سے مولانا کی سوانح حیات مرتب کرنے میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اسی مجموعے کے ایک خط میں سفر بغداد کا تفصیلی ذکر بھی مل جاتا ہے اور ایک خط میں مولانا کی موسیقی سے دلچسپی اور شبلی کے شعر و ادب کے بارے میں ان کی رائے تفصیل سے معلوم ہوتی ہے نقش آزاد کے حصہ اول میں مولانا غلام رسول مہر کے نام آزاد کے ۱۲۴ خط ہیں۔ یہ خطوط زیادہ تر کاروباری نوعیت کے ہیں اور ترجمان القرآن اور غبار خاطر کی طباعت اور معاوضہ

وغیرہ سے تعلق ہیں۔ ان خطوں کی اہمیت اس لئے ہے کہ ان سے مولانا کی تصانیف کے بارے میں کچھ مزید معلومات مل جاتی ہیں۔ دوسرے حصہ میں مولانا مہر کی کتاب 'غالب' پر مولانا کی تحریرات اور تعلیقات ہیں اس حصہ میں غالب' معاصرین غالب اور قواعد کے بعض مسائل ہیں جو اہم ہیں۔ تیسرے حصے میں چار خط نیاز فتحپوری کے نام' ایک مولانا شفاعت اللہ خان کے نام اور خواجہ حسن نظامی کے نام ہیں۔ "مکاتیب ابوالکلام" میں حالی کے نام ایک خط' شبلی کے نام دو خط اور سید سلیمان ندوی کے نام ۳۰ خط اور محی الدین احمد قصوری کے نام دو خط ہیں۔ ان خطوں میں حالی اور شبلی کے نام کے خط تو بہر حال اہم ہیں ہی لیکن سب سے اہم وہ خط ہیں جو سید سلیمان ندوی کے نام ہیں۔ ان مجموعوں کے علاوہ بھی مولانا آزاد کے متفرق خطوط ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہو گئے ہیں اور ابھی تک مجموعہ کی صورت میں شائع نہیں ہوئے ہیں۔ زیر نظر مقالے میں 'غبار خاطر' ہی کو ملحوظ نظر رکھ کر مولانا کی خطوط نگاری کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

غبار خاطر کے خطوط آزاد نے قلعہ احمد نگر میں اپنی اسیری کے دوران اپنے صدیق مکرم مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی کے نام لکھے۔ گو یہ خط جیل سے باہر نہ بھیجے جا سکے تاہم مولانا اپنی 'طبیع نالہ سنج' اور 'ذوق مخاطبت' کے ہاتھوں مجبور تھے اور وہ خط لکھتے رہے۔

> "تاہم طبیع نالہ سنج کو کیا کروں کہ فریاد و شیون کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ آپ سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں' میرے ذوق مخاطبت کے لیے یہ خیال بس کرتا ہے کہ روئے سخن آپ کی طرف ہو۔"

——— ان خطوط کے بارے میں لکھتے ہوئے گوپی ناتھ امن لکھنوی نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ:

> "ان خطوط کی نوعیت میگھ دوت کے گندھرب کی سی ہے جو بادلوں سے مخاطب ہو کر اپنے دل کے جذبات بیان کرتا ہے۔"

——— جس طرح میگھ دوت کے بادل گندھرب کے لیے محض دل کی بھڑاس نکالنے کا ذریعہ بنتے ہیں یہی حال ان خطوط کے مکتوب الیہ کا ہے۔ جس کی موجودگی ان میں کہیں محسوس نہیں ہوتی۔ شروع سے آخر تک مولانا آزاد کی انا مکتوب الیہ پر غالب رہتی ہے۔

——— پروفیسر اسلوب احمد انصاری اس نکتے کو ابھارتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مکتوب الیہ کی حیثیت یہاں ایک ایسے رازدار کی سی نہیں جسے نہاں خانۂ دل میں گذر کی اجازت دی گئی ہو بلکہ ایک ایسے قاری کی ہے جس کے مفاد کے لیے دفتر حکمت کھولے گئے ہیں۔ ان میں لہجہ ہائے زیر لبی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"[1]

'غبار خاطر' کے خطوط میں نہ بے تکلفی ہے اور نہ یہ غیر رسمی ہیں ——— ان میں ادعائے علمیت ہے لیکن بایں ہمہ بعض خطوط میں مولانا آزاد نے اپنی ذہنی تربیت، اپنے افکار کے موثرات اور اپنی دلچسپیوں کا ذکر کیا ہے جن سے ایک عظیم دماغ کے ارتقاء کا تھوڑا بہت حال کھلتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"لیکن میں موروثی عقائد پر قانع نہ رہ سکا۔ میری پیاس اس سے زیادہ نکلی جتنی سرابی دہ دے سکتے تھے۔ مجھے پرانی راہوں سے نکل کر خود اپنی راہیں ڈھونڈنی پڑیں۔ زندگی کے ابھی پندرہ برس بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ طبیعت نئی خلشوں اور جستجوؤں سے آشنا ہو گئی تھی اور موروثی عقائد جس شکل و صورت میں سامنے آکھڑے ہوئے تھے ان پر مطمئن ہونے سے انکار کرنے لگی تھی۔" (مکتوب ۱۱ اگست ۴۲ء)۔

اپنی ابتدائی تعلیم و تربیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میری تعلیم خاندان کے موروثی عقائد کے خلاف نہ تھی۔ . . . . وہ سرتاسر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی جو موثرات نسل اور خاندان نے مہیا کر دیے تھے۔ تعلیم نے انہیں اور زیادہ تیز کرنا چاہا اور گرد و پیش نے انہیں اور زیادہ سہارے دیئے۔ تاہم یہ کیا بات ہے کہ شک کا سب سے پہلا کانٹا خود بخود دل میں چبھا۔ اسی تقلید کے خلاف تھا۔ میں نہیں جانتا کہ کیوں؟ مگر بار بار یہی سوال سامنے ابھرنے لگا تھا کہ اعتقاد کی بنیاد علم و نظر پر مبنی ہونی چاہیئے۔ تقلید اور توارث پر کیوں ہو۔ . . . شک یہی

---

[1] اسلوب احمد انصاری۔ غبار خاطر پر ایک نظر (اردو ادب۔ آزاد نمبر) جلد ۸۔ ۱۹۵۹ء)

چبھن تھی جو تمام آنے والے یقینوں کے لیے دلیلِ راہ بنی۔ بلاشبہ اس نے پچھلے سرمایوں سے تہی دست کو دیا تھا، مگر نئے سرمایوں کے حصول کی لگن بھی لگا دی تھی اور بالآخر اسی کی رہنمائی تھی جس نے یقین اور طمانیت کی منزلِ مقصود تک پہنچا دیا۔ گویا جس علت نے بیمار کیا تھا وہی بالآخر دارُوئے شفا ثابت ہوئی۔"

مولانا نے اپنے خطوط میں یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے بزرگ اپنے عقائد و افکار میں کس قدر متعصب اور بے لچک تھے۔ وہ اپنے مسلک سے سرِمو تجاوز کو کفر و زندقہ تصوّر کرتے تھے۔ مولانا نے تعلیم یا تو اپنے والد سے حاصل کی یا پھر ان لوگوں سے جنہیں اُن کے والد نے اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لیا تھا کہ "معیارِ عقائد و فکر پر پورے اُتر سکتے ہیں"۔ ان کی تعلیم جن پابندیوں سے گھری ہوئی تھی، ان خطوں میں اس کی تھوڑی بہت جھلک نظر آتی ہے۔

مولانا آزاد اپنی معمولی سے معمولی دلچسپی پر انفرادیت کا اتنا گہرا رنگ چڑھاتے ہیں کہ ان کی یہ معمولی دلچسپیاں بھی خاصے کی چیز ہو جاتی ہیں مثلاً چائے نوشی کا شغل۔ اس میں بھی ان کی انفرادیت نے وہ نقش و نگار پیدا کئے ہیں کہ چائے نوشی ان کی ذات کے ساتھ مخصوص ہو گئی ہے۔ اس چائے نوشی میں ان کا اجتہاد ملاحظہ کیجئے۔

"شائد آپ کو معلوم نہیں کہ چائے کے باب میں بعض اجتہادات ہیں۔ میں نے چائے کی لطافت و شیرینی کو تمباکو کی تندی و تلخی سے ترکیب دے کر ایک کیفِ مرکب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ متصلاً ایک سگریٹ بھی سلگا لیا کرتا ہوں۔ پھر اس ترکیبِ خاص کا نقشِ عمل یوں جماتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد چائے کا ایک گھونٹ لوں گا اور متصلاً سگریٹ کا بھی ایک کش لیتا رہوں گا ..... اس طرح اس سلسلۂ عمل کی ہر کڑی چائے کے ایک گھونٹ اور سگریٹ کے ایک کش کے باہمی امتزاج سے بتدریج ڈھلتی جاتی ہے اور سلسلۂ کار دراز ہوتا رہتا ہے۔ مقدار کے حُسنِ تناسب کا انضباط ملاحظہ ہو کہ

ادھر فنجان آخری جرعہ سے خالی ہوا۔ ادھر تمباکوئے آتش زدہ نے سگریٹ کے آخری خط کشید تک پہنچ کر دم لیا۔ کیا کہوں ان دو اجزائے تند و لطیف کی آمیزش سے کیف و سرور کا کیا معتدل مزاج ترکیب پذیر ہو گیا۔"

چائے کے بارے میں مولانا نے بعض بڑی دلچسپ باتیں لکھی ہیں، وہ صرف چینی چائے کو چائے سمجھتے تھے۔ چناں چہ فرماتے ہیں کہ سیلون اور ہندوستان میں جب چائے کی کاشت شروع کی گئی، گو یہاں کی مٹی نے چائے پیدا کرنے سے تو انکار کر دیا مگر اسی تشکل و صورت کی ایک دوسری چیز پیدا کر دی اور یہ کہ لوگوں نے بغیر سمجھے اسی کا نام چائے رکھ دیا۔ عوام میں نام نہاد چائے کی مقبولیت سے وہ بڑے نالاں تھے

"دنیا جو اس کی جستجو میں تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ جنس کمیاب ارزاں ہو بے سوچے سمجھے اسی پر ٹوٹ پڑی اور پھر تو گویا پوری نوع انسانی نے اس غریب خوردگی پر اجماع کر لیا۔ آپ ہزار سر پیٹئے، سنتا کون ہے ..... نوع انسانی کی اکثریت کے فیصلوں کا ہمیشہ ایسا ہی حال رہا ہے جمعیت بشری کی یہ فطرت ہے کہ ہمیشہ عقلمند آدمی اکا دکا ہو گا۔ بھیڑ بے وقوفوں کی رہے گی۔ ماننے پر آئیں گے تو گائے کو خدا مان لیں گے، انکار پر آئیں گے تو مسیح کو سولی پر چڑھا دیں گے۔"

غبار خاطر سے ہی مولانا کی زندگی کے کچھ ایسے پہلو بھی نمایاں ہوتے ہیں، جن سے عام طور پر لوگ نا واقف تھے مثلاً موسیقی سے انہیں جو شغف رہا ہے اس کا اظہار ۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ء کے خط سے ہوتا ہے۔ اس خط میں انہوں نے نہ صرف اسی فن سے اپنی دلچسپی ہی کا بیان کیا ہے بل کہ ہندوستان میں فن موسیقی کے کمالات اور اس کی تاریخ کا تفصیلی بیان بھی کیا ہے۔ اس فن سے اپنے شغف اور ذوق کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"میں آپ سے ایک بات کہوں، میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے، میں زندگی کی احتیاجوں میں سے ہر چند کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں، لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا، آواز خوش میرے لئے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا اور

جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے۔"

اسی خط میں انہوں نے چند جملے ایسے بھی لکھے ہیں جن میں براہ راست انکشاف حال کیا جاسکتا ہے، اگرچہ جزئیات اور تفصیلات نہیں دی گئی ہیں تاہم اس میں ان کی ذاتی زندگی کی جو جھلک ہے وہ بیشتر خطوط میں مفقود ہے۔

زندگی کے بارے میں مولانا آزاد کا رویہ مثبت اور صحت مند رہا ہے خوش رہنا وہ ایک اخلاقی فرض سمجھتے ہیں اور ہنسی خوشی کے ساتھ زندگی گزارنے کو سب سے اہم کام بتاتے ہیں:۔

"لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لیے کام میں لگیں لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہے۔ یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا۔"

"خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری ہے۔۔۔۔۔۔"

۲،۱۷، اور ۱۸ مارچ ۴۳ء کے خطوط اس اعتبار سے قدرے مختلف نوعیت کے ہیں کہ ان میں فلسفیانہ اور نیم فلسفیانہ موضوعات اور مسائل کی بجائے اپنے گرد و پیش کے ماحول سے خط لکھنے کا سامان فراہم کیا گیا ہے، یہ تینوں خط چڑے چڑیا کی کہانی پر مشتمل ہیں۔ اس کہانی میں بھی مولانا آزاد نے ادبی رکھ رکھاؤ اور التزام کو ملحوظ رکھا ہے۔ ۱۷ مارچ کے خط کا یہ آخری ٹکڑا اپنے دلچسپ انداز بیان کے اعتبار سے لاجواب ہے:۔

"بارہا ایسا ہوا کہ میں اپنے خیالات میں محو لکھنے میں مشغول ہوں، اتنے میں کوئی دلنشین بات نوک قلم پر آ گئی۔ اور بے اختیار اس کی کیفیت کی خود رفتگی میں میرا شانہ ملنے لگا۔۔۔۔ اور یکایک زور سے پروں کے اڑنے کی ایک پھرسی آواز سنائی دی۔ اب جو دیکھتا ہوں تو معلوم ہوا کہ ان یاران بے تکلف کا ایک طائفہ میری بغل میں بیٹھا بے تامل اپنی اچھل کود میں مشغول تھا۔ اچانک انہوں نے دیکھا کہ یہ پتھر اب ہلنے لگا ہے، تو گھبرا کر اڑ گئے۔"

عجب نہیں اپنے جی میں کہتے ہوں یہاں صوفے پر ایک پتھر پڑا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی آدمی بن جاتا ہے۔"

احمد نگر کی اسیری کے زمانہ میں مولانا کی چھبیس برس کی رفیقہ حیات دنیا سے سدھار گئیں۔ بیماری کی خبریں انہیں شروع سے مل رہی تھیں۔ مولانا کے لیے یہ زمانہ بڑا کٹھن گزرا۔ اس وقت ان کے دل کی جو حالت تھی اس کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"جونہی خطرناک صورت حال کی پہلی خبر ملی میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کیا۔ انسان کے نفس کا بھی عجیب حال ہے۔ ساری عمر ہم اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں۔ پھر بھی یہ معمہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتداء سے ایسے حالات میں گزری کہ طبیعت کو ضبط و انقیاد میں لانے کے متواتر موقعے پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا ان سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی، تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لیے جد وجہد کرنی پڑے گی۔ یہ جد وجہد دماغ کو نہیں جسم کو تھکا دیتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔ اس زمانہ میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا، میں اسے چھپانا نہیں چاہتا، میری کوشش تھی کہ اس صورت کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔"

تشویش خاطر کے باوجود مولانا نے اپنے روزانہ کے معمولات میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ حکومت کی جانب سے اشارہ ہوا کہ اگر درخواست دی جائے تو انہیں اپنی بیوی سے ملنے کی اجازت دی جا سکتی ہے لیکن اس پیش کش کو انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ابو الکلام آزاد کے لیے اپنی شخصیت کے مقابلے میں کوئی دوسری شخصیت اس حد تک اہمیت نہیں رکھتی تھی کہ وہ اس کی انفرادیت اور معنویت کو تسلیم کرتے۔ البتہ خط کے آخری جملوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کوئی انسان در اصل خود کفالتی (SELF - SUFFICIENT) نہیں

ہوتا ہے اور نہ تمام وقت رہ سکتا ہے۔"[1] خط کے آخری جملے اس بات کو بے نقاب کرتے ہیں کہ اپنی انانیت کے باوصف مولانا جذباتی سپردگی کے شکار ہو جاتے ہیں اور اس سپردگی کا اظہار ان لفظوں میں ہوتا ہے:۔

"اس طرح ہماری چھبیس[26] برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی .... یہاں احاطہ کے اندر ایک پرانی قبر ہے نہیں معلوم کس کی ہے۔ جب سے آیا ہوں سینکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ایک نئے طرح کا انس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہو۔ کل شام کو دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ اور ضمن بن نوید کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا بے اختیار یاد آ گیا۔"

مولانا کی شخصیت میں انفرادیت کا جو پہلو تھا، اس کا ایک مظہر ان کی خلوت پسندی بھی ہے خلوت پسندی ان کی طبیعت پر ابتدا ہی سے غالب تھی۔ خود لکھتے ہیں:۔

"ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔"

سیاسی اور اجتماعی مشغولتیں انہیں اس خلوت کا بہت کم موقعہ دیتی تھیں۔ اس سلسلے میں وہ سحر خیزی سے اپنی خلوت پسندی کے جذبے کو تسکین دیتے تھے۔ سحر خیزی کی اس عادت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"ایک بڑا فائدہ اس عادت سے یہ ہوا کہ میری تنہائی میں اب کوئی خلل نہیں ڈال سکتا۔ میں نے دنیا کو ایسی جرأتوں کا سرے سے موقعہ ہی نہیں دیا۔ وہ جب جاگتی ہے تو میں سو رہتا ہوں جب سو جاتی ہے تو اٹھ بیٹھتا ہوں۔
خواب غفلت ہمہ را بردہ و بیدار یکیست"

---

[1] اسلوب احمد انصاری۔ غبار خاطر پر ایک نظر (اردو ادب: آزاد نمبر۔ ۱۹۵۹ء) ص۔ ۶۹۳

مولانا ابوالکلام آزاد کے یہ خط، خطوں کے مجموعوں میں ایک ممتاز جگہ کے مالک ہیں۔ یہ خطوط اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود بھی جن کے بارے میں اردو کے نقادوں نے بہت کچھ لکھا ہے، اپنے منفرد اور مخصوص اسلوب بیان کے باعث ہر وقت دلچسپی سے پڑھے جا سکتے ہیں۔ ان میں مولانا آزاد کی شخصیت اور زندگی کے سبھی رُخ نظر نہیں آتے، اس کی ایک وجہ تو ہے کہ مولانا کو انکشاف حال منظور نہیں، پھر یہ بھی ہے کہ یہ خط ایک مختصر مدت کے ترجمان ہیں اور صرف ایک ہی شخص کے نام لکھے گئے ہیں، اس التزام کے ساتھ کہ کسی فقرے میں سیاست کی ملاوٹ نہ رہ جائے۔ بایں ہمہ اس بات سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ خطوط اردو کے مکاتیبی اور نثری ادب میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

اقبال کے حالات اور شخصیت کے سلسلے میں

خطوط کی اہمیت

شعری کلام سے قطع نظر اقبال نے نثر میں باقاعدہ کتابیں بھی لکھی ہیں' مضامین و مقالات بھی تحریر کئے ہیں اور ان کے علاوہ مکاتیب کا بھی ایک خاصا بڑا سرمایہ چھوڑا ہے۔ یہ تمام نثری تحریریں اقبال شناسی اور اقبال فہمی کے سلسلے میں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اقبال کی شاعری سے ان کے افکار و خیالات اور نظریات و تصورات کے علاوہ ان کی شخصیت کا جو خاکہ ہمارے ذہنوں پر مرتب ہوتا ہے اس میں ان کی نثری تحریروں کے مطالعے سے رنگ بھرے جا سکتے ہیں کیوں کہ ایک طرف تو ان افکار و نظریات کی تفصیل اور جزئیات ہمیں ان کی نثر ہی میں ملتی ہیں اور دوسری طرف ان کے کردار اور شخصیت کے بہت سے پہلو بھی ان کی نثری تحریروں سے ہی روشن ہو جاتے ہیں' نثر میں تحلیل و تجزیہ کی چوں کہ زیادہ گنجائش ہوتی ہے اس لئے اقبال کا مفکرانہ انداز اور تجزیاتی مزاج ان کی نثر ہی میں اپنے آپ کو رونما کرتا ہے۔ نثری تحریروں میں موضوعات کا جو تنوع' فکر کی جو گہرائی اور اظہار کی جو جمال آفرینی ہے۔ اس کے پیش نظر اقبال کی شاعری کی مفکرانہ عظمت سے صحیح طور پر آشنا ہونے کے لیے یہ نثری تحریریں نہ صرف ایک ذریعہ بل کہ ایک بہت بڑا سہارا ہیں۔

اقبال کی نثری تحریروں میں مکاتیب اپنی کیفیت کے اعتبار سے نہ سہی لیکن کمیت کے اعتبار

سے یقیناً جزو غالب ہیں۔ اس لئے جو لوگ اقبال کو صرف شاعری کے آئینے میں دیکھتے ہیں خود اقبال اور مطالعۂ اقبال کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔"[1]

ان کے مکاتیب کی تعداد جواب تک شائع ہو گئے ہیں تیرہ سو سے تجاوز کرتی ہے۔ اگرچہ تعداد اس سے بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔ آئے دن ان کے خطوط دریافت ہوتے رہتے ہیں اور یہ سلسلہ فی الحال جاری ہے۔ اقبال کثیر الاحباب تھے اور اس کے علاوہ بہت سے لوگ جنہیں اقبال سے شرف ملاقات حاصل نہیں تھا وہ بھی اکثر انہیں خطوط لکھتے تھے اور اقبال کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ہر خط کا جواب دیتے تھے اور اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ خط کا جواب مختصر ہی کیوں نہ ہو فوراً دیا جائے۔ اس طرح کا اہتمام غالب بھی کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ مشرقی اقدار کے حامل جو لوگ ہیں وہ اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ خط کے جواب میں تاخیر نہ ہو۔ ایک ہی مکتوب الیہ کے نام بعض اوقات ایک ہی دن میں دو دو خط لکھے گئے ہیں۔ ایسی کئی مثالیں مکاتیب اقبال میں ملتی ہیں۔ اب تک کے دستیاب خطوط میں ایک ہی تاریخ کے زیادہ سے زیادہ چار خط ملتے ہیں۔ (۳۱ جولائی ۱۹۳۷ء) اکثر دو اور متعدد بار تین خط لکھے گئے ہیں۔

ممنون حسن خان کو جنہیں سر راس مسعود نے اقبال کا ایکرمان کہا تھا، بھوپال میں قیام کے دوران اقبال کے بہت قریب رہنے کا موقعہ ملا تھا۔ انہوں نے بھوپال میں مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام ۱۹۷۸ء میں منعقدہ سیمینار میں کہا:۔

"مجھے علامہ کا کام بطور سکریٹری کرنا پڑتا تھا۔ وہ تمام خطوط اور تار مجھے دیا کرتے تھے اور خاص طور سے ہدایت تھی کہ میں ان کے جوابات جلد از جلد ان سے لکھوا لوں مجھ کو وہ مجھ کو خود بول دیا کرتے تھے کہ بھئی اس کا جواب اس طرح سے لکھ دو۔ میں دستخط کردوں گا لیکن جو خاص خاص لوگوں کے خطوط ہوتے تھے ان کا جواب وہ خود تحریر کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے مجھے خطوط کی گڈی دی اور کہا کہ ممنون صاحب

---

[1] ڈاکٹر جمیل جالبی۔ خطوط اقبال کی اہمیت (اقبال دورِ جدید کی آواز) ص ۲۵۔

ذ، کو دیکھ لینا۔ ان میں برٹرنڈ رسل کا خط ہے۔ اس میں مارگن فاسٹر کا خط ہے اس میں رابرٹ آکر جیل فشر کا خط ہے اور ان کے جواب میں چاہتا ہوں کہ آج ہی آپ مجھ سے لکھوا لیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ چاہتے تھے کہ خطوط کے جواب جلد از جلد دیئے جائیں۔"

اقبال کے خطوط مختلف مجموعوں کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں جن کی تفصیل یوں ہے:۔

۱۔ شاد اقبال۔ مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادر زور	۱۹۴۲ء
۲۔ اقبال نامہ حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ	۱۹۴۵ء
۳۔ خطوط اقبال بنام عطیہ فیضی (انگریزی)	۱۹۴۷ء
۴۔ اقبال نامہ حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔	۱۹۵۱ء
۵۔ مکاتیب اقبال بنام خان نیاز الدین خان	۱۹۵۴ء
۶۔ مکتوبات اقبال بنام سید نذیر نیازی	۱۹۵۷ء
۷۔ انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار	۱۹۶۷ء
۸۔ لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال (انگریزی) مرتبہ بشیر احمد ڈار۔	۱۹۶۷ء
۹۔ مکاتیب اقبال بنام گرامی مرتبہ محمد عبداللہ قریشی۔	۱۹۶۹ء
۱۰۔ نوادر اقبال بنام مہاراجہ کشن پرشاد شاد مرتبہ محمد عبداللہ قریشی۔	۱۹۷۵ء
۱۱۔ خطوط اقبال۔ مرتبہ رفیع الدین ہاشمی۔	۱۹۷۶ء
۱۲۔ جہان دیگر — مرتبہ فرید الحق	

ان خطوط کے علاوہ کچھ اور خطوط بھی ہیں جو بعض کتابوں اور رسالوں میں منتشر پڑے ہیں۔ ابھی حال ہی میں اقبال کے وہ خط بھی کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں جو انہوں نے پروفیسر تھامسن کو لکھے تھے یہ خطوط انگریزی میں ہیں۔ ان مجموعوں کے علاوہ محمد عبداللہ قریشی نے اقبال اکیڈمی پاکستان کی جانب سے ۱۹۷۷ء میں روح مکاتیب اقبال کے نام سے اقبال کے تقریباً سبھی دستیاب خطوط کو تاریخ وار جمع کر کے اقبال ہی کے الفاظ میں تلخیص کر کے شائع کیا ہے۔

اقبال کا پہلا خط جو دستیاب ہوا ہے وہ ۲۸ فروری ۱۸۹۹ء کا ہے اور حسن مارہروی کے

نام ہے۔ آخری خط وفات سے ایک روز قبل کا لکھا ہوا ہے۔ اس طرح سے ان خطوط کا زمانۂ تحریر انتالیس[۳۹] برسوں پر محیط ہے۔ یہ زمانہ نہ صرف برصغیر ہی میں بلکہ پوری دنیا میں بھی کئی لحاظ سے اتھل پتھل کا زمانہ رہا ہے۔ سیاسی لحاظ سے یہ دور نہایت ہی پر آشوب دور تھا۔ روس کے انقلاب اور پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں جو زبردست سیاسی سماجی اور اقتصادی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں وہ انسانی تاریخ میں اتنی کم مدت میں کبھی واقع نہیں ہوئی تھیں۔ علمی میدان میں بھی جو پیش رفت ان چار دہائیوں میں ہوئی وہ بھی بے مثال ہے۔ ان انقلابات سے اقبال کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ چناں چہ منجملہ شعری اور نثری تحریروں کے مکاتیب میں بھی ان کے اثرات اور عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔ خود اقبال کی ذاتی زندگی میں بھی اس عرصے میں جو نشیب و فراز آئے ان کی جھلک بھی خطوط میں نظر آتی ہے۔ یہاں البتہ یہ بات ملحوظ نظر رہنی چاہیئے کہ جہاں تک اقبال کے شخصی حالات کا تعلق ہے اس معاملے میں وہ خطوط میں بھی بہت زیادہ نہیں کھلتے اور بقول پروفیسر آل احمد سرور "خطوں میں اپنے آپ کو لئے دئے رہتے ہیں"[۱]۔ تاہم ان کے بعض خط ایسے بھی ہیں، جن میں بین السطور بہت کچھ پڑھنے کی گنجائش ہے۔ اسی طرح آخری چند برسوں کے وہ خط بھی اس لحاظ سے کافی اہم ہیں، جو انہوں نے نذیر نیازی کو لکھے ہیں اور جن میں اپنی بیماری اور علاج کے بارے میں خاصی تفصیلات دی ہیں۔ اسی طرح مثلاً ان کا سب سے پرانا خط جو اب تک دستیاب ہوا ہے ۲۸ فروری ۱۸۹۹ء کا ہے جو مولانا احسن مارہروی کے نام لکھا گیا ہے۔ اس وقت اقبال طالب علم تھے اس خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو اس وقت بھی ادب سے لگاؤ تھا اور شعر بھی کہتے تھے اور پھر یہ بھی کہ داغ دہلوی کی شاعری سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ ان کی پیروی بھی کرتے تھے۔ اس خط میں اقبال نے لکھا ہے:

> "دونوں رسالے پہنچے۔ سبحان اللہ۔ نواب صاحب کی غزل کیا مزے کی ہے۔ افسوس ہے کہ اب تک میں نے آپ کے گلدستے کو کوئی غزل نہیں بھیجی۔ ان شاء اللہ امتحان کے بعد باقاعدہ ارسال کیا کروں گا۔ ایک تکلیف دیتا ہوں۔ اگر آپ کے پاس استاذی حضرت مرزا داغ کی تصویر ہو تو ارسال فرمائیے گا۔ بہت ممنون ہوں گا۔ اگر آپ کے

---

[۱]- آل احمد سرور ۔ تنقیدی اشارے ۔ ص ۶۲

پاس نہ ہو تو مطلع فرمائیے گا کہ کہاں سے مل سکتا ہے۔ میں نے دنیا کے تمام بڑے شاعروں کے فوٹو جمع کرنے شروع کئے ہیں۔ چناں چہ انگریزی، جرمنی اور فرنچ شعراء کے فوٹوؤں کے لیے امریکہ لکھا ہے۔ غالباً کسی نہ کسی اُستاد بھائی کے پاس تو حضرت کا فوٹو ضرور ہوگا۔ اگر آپ کو معلوم ہو تو ازراہِ عنایت جلد مطلع فرمائیے۔ حضرتِ امیر مینائی کے فوٹو کی بھی ضرورت ہے۔ والسلام۔"[1]

اس خط سے اقبال کی پسند و ناپسند کا بھی پتہ چلتا ہے اور اپنے پسند کے شاعر اور اُستاد نواب مرزا داغ کو دیکھنے کے لیے جو بے چینی اس کے اندر ہے وہ بھی مترشح ہوتی ہے اور بین السطور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال کو خط لکھتے ہوئے نہ صرف مکتوب الیہ کی حیثیت ہی کا انداز ہے بل کہ اپنی حیثیت کا عرفان بھی ہے۔ اسی سبب سے اِس خط میں ایک رکھ رکھاؤ، ٹھہراؤ اور خودداری کا احساس بھی موجود ہے۔ شروع میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اقبال کے خطوط کے مطالعہ سے اُن کے کلام اور افکار کی تفہیم میں کافی مدد ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر آل احمد سرور انہیں کلام اقبال کی سب سے اچھی شرح سمجھتے ہیں۔ اقبال نے اپنے افکار و نظریات کے اظہار کے لیے شعری قوالب اختیار کیا اور شاعری میں چوں کہ بات بادہ و ساغر کے بغیر نہیں بنتی اور پھر یہ بھی کہ "فاش تر گفتن خطاست" لہٰذا کئی باتوں میں تضاد، اختلافات یا ابہام کا احساس ہوتا ہے۔ کلام اقبال کے اسی ابہام اور تضاد کے باعث اقبال فہمی میں مشکلات پیش آتی ہیں اور اسی کے باعث نقادوں کو اقبال کے بارے میں اکثر دھوکا ہوا ہے۔ پروفیسر عزیز احمد لکھتے ہیں "کہ کوئی انہیں رجعت پسند کہتا ہے، کوئی ترقی پسند، کوئی اشتراکی، کوئی فسطائی، کوئی صوفی، کوئی تصوف کا دشمن، غرض جتنی منہ اتنی باتیں۔"[2] اقبال کی نثری تحریروں اور خاص طور پر اُن کے خطوط کے مطالعہ سے ان کے خیالات و افکار اور نظریات و تصورات نہ صرف واضح تر ہو جاتے ہیں بل کہ ان میں تضاد اور اختلاف کی بجائے تسلسل اور اتحاد نظر آتا ہے اور پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے ان خطوط کو پڑھ کر

---

[1] اقبال نامہ۔ ج اول۔ ص ۴۰۳ ۔

[2] عزیز احمد۔ اقبال کی آفاقیت کا مسئلہ۔ "ماہِ نو" اپریل ۱۹۶۳ء۔ ص ۸ ۔

"ان کے ذہنی سفر اور ان کے ذہنی ارتقاء کی داستان قلمبند کی جا سکتی ہے۔ وہ کہاں سے چلے اور کن کن راستوں سے ہوتے کس منزل پر پہنچے"[1] اس طرح کے خطوط میں اقبال نے مختلف علمی، تاریخی، معاشی اور فلسفیانہ مسائل پر بحث کی ہے اور اپنے مکتوب الیہم کے ساتھ قرآن، حدیث، فقہ، تصوف اور دین و شریعت کے مختلف پہلوؤں پر تبادلۂ خیال کیا ہے۔ کئی خطوں میں اپنے بعض نظریات و تصورات مثلاً نظریہ خودی، تصور شاہین، تصوف، اجتہاد وغیرہ کی وضاحت کی ہے۔ نیز انہوں نے خطوط میں جابجا اپنے اشعار و افکار کی تشریح بھی کی ہے۔ اس ضمن میں ان خطوط کی اہمیت اور افادیت اقبال کے اس بیان کی روشنی میں بڑھ جاتی ہے جو انہوں نے سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھا ہے:۔

"فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی ہے ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔

ورنہ ؎
نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست
کہ برمن تہمت شعر و سخن بست"[2]

افکار و نظریات سے قطع نظر یہ خطوط اقبال کی شخصیت اور اُن کے حالات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور اس وجہ سے ان کے سوانح نگار کے لیے بھی بے حد اہم ہیں۔ ان کی شخصی زندگی کے علاوہ یہ مکاتیب ان کے مختلف رجحانات اور نفسیاتی اور جذباتی کیفیتوں کے آئینہ دار بھی ہیں لیکن اس بات کی یہاں وضاحت کر دینی ضروری ہے کہ حیاتِ اقبال کے بارے میں ان خطوط سے بہت زیادہ مدد نہیں مل سکتی اور خاص طور پر حیاتِ اقبال سے متعلق وہ مسائل جو غور طلب ہیں، ان کے بارے میں بھی یہ خطوط ہماری مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ اس قسم کے غور طلب مسائل میں جو ہنوز حل طلب ہیں، اقبال کا خاندان، مکتب میں ان کی تعلیم کی مدت، ان کے آباؤ اجداد کی کشمیر سے ہجرت، پہلے بیٹے آفتاب اقبال سے قطع تعلق کی وجہ، اکبر حیدری سے تعلقات میں کشیدگی کا سبب، عطیہ بیگم فیضی سے تعلقات کی نوعیت، جواہر لال نہرو سے ملاقات کے متعلق تضادات، اور حیدر آباد اور پنجاب میں ہائی کورٹ کی ججی نہ ملنے کی

[1] ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ خطوط اقبال کی اہمیت (اقبال۔ دورِ جدید کی آواز) ص ۲۰ [2] اقبال نامہ۔ ص ۱۹۵-۱۹۶؛

وجہ یہ اور اس طرح کے اور بھی کچھ مسائل ہیں جو اقبال کے سوانح نگار کو پریشان کر دیتے ہیں اور جن کے بارے میں اقبال کے خطوط سے بہت زیادہ مدد نہیں ملتی۔ البتہ ان میں سے چند ایک مسائل کے بارے میں خطوط اقبال کو سامنے رکھ کر قیاس آرائیاں کی جا سکتی ہیں لیکن قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے لیکن بایں ہمہ اقبال کی زندگی کے اہم واقعات اور حالات کسی نہ کسی صورت میں خطوط سے مستنبط کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی شخصیت کے وہ خط و خال بھی ان خطوط سے نمایاں کئے جا سکتے ہیں جو ان کی شاعری اور ان کی دیگر تحریروں کے مطالعہ کے باوجود بھی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ ان کی شاعری کے ذریعہ ہم مرد مومن کی قد و قامت کا اندازہ لگا سکتے ہیں سیرفی کائنات کا تصور کر سکتے ہیں بت کدہ صفات کے اصنام کو دیکھ سکتے ہیں۔ نوائے شوق اور حریم ذات کے شور و شر کو سُن سکتے ہیں لیکن تخلیقی عمل کے خارزار راستوں سے گذرتے ہوئے فن کار اور جدت طراز اقبال کو کن بلندیوں اور پستیوں سے گزرنا پڑا۔ اس کے سمجھنے کے لیے اُن کے خطوط ہی ہماری راہنمائی کر سکتے ہیں۔ خطوط میں اکثر اوقات ایسے معاملات کا بے تکلف اظہار مل جاتا ہے جو نہ نثری مضامین میں آ سکتے ہیں اور نہ شعری پیکر میں جگہ پا سکتے ہیں۔ اس لئے کہ مکتوب نگار کا روئے سخن فرد واحد کی طرف ہوتا ہے جہاں اظہار خیال پر عملاً کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی اور اس طرح سے مکتوب نگار اپنی شخصیت کے بیشتر پردے خود ہی اُتار پھینکتا ہے اور شعوری اور غیر شعوری طور پر ان شکوک و شبہات اور عقائد اور رویوں کا برملا اظہار کرتا ہے جو شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

اقبال کی شخصیت میں پیچیدگی یا تہہ داری نہیں بل کہ اس میں ہمہ گیری اور ہمہ جہتی پائی جاتی ہے۔ لہٰذا اس کے مکمل شعور کے لیے ان کی شخصیت کے بھی DIMENS IONS کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ وہ شاعر تھے، مفکر تھے، فلسفی تھے، اسلام کے فقہی مسائل سے دلچسپی رکھتے تھے سیاستدان تھے اور مسلمانوں کی سیاست سے عملاً بھی وابستہ تھے، غرض اُن کے کئی روپ تھے جن کی وجہ سے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں بعض اوقات ان کے سوانح نگاروں کو دھوکا ہوتا ہے۔ اور

انہیں اقبال کی شخصیت میں ہی نہیں بل کہ ان کی فکر میں بھی تضادات نظر آتے ہیں۔ مکاتیب اقبال کا مطالعہ اس ضمن میں ہماری بہت سی مشکلات کو حل کر دیتا ہے۔ اسرارِ خودی میں اقبال نے حافظ شیرازی کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا، ان سے صرف صوفیہ ہی نہیں بل کہ بعض دوسرے اربابِ ذوق بھی منغض ہوئے۔ یہاں تک کہ خواجہ حسن نظامی اور اکبر الہ آبادی بھی ان سے ناراض ہو گئے جو نہ صرف اقبال کے مداح تھے بل کہ جن سے اقبال کے کافی گہرے اور مخلصانہ مراسم تھے۔ اکبر الہ آبادی کے بارے میں تو اقبال نے لکھا ہے:۔

"میں آپ کو اس نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہوں۔"

"میں آپ کو اپنا پیر و مرشد تصور کرتا ہوں، اگر کوئی شخص میری مذمت کرے جس کا مقصد آپ کی مدح سرائی ہو تو مجھے اس کا مطلق رنج نہیں بل کہ خوشی ہے، جب آپ سے ملاقات اور خط و کتابت نہ تھی اس وقت بھی میری ارادت و عقیدت ایسی ہی تھی جیسی اب ہے اور انشاء اللہ جب تک میں زندہ ہوں، ایسی ہی رہے گی۔" لہ

لیکن ان تعلقات میں انقطاع کے امکانات پیدا ہو گئے تھے جس کی وجہ تصوف پر اقبال کے اعتراضات اور خواجہ حافظ پر اسرارِ خودی میں ان کی تنقید تھی لیکن اپنے خطوط میں اقبال نے اپنی پوزیشن واضح کر دی ہے کہ حافظ اور اُس کے کلام کو اس نے بطور مثال پیش کیا ہے کیوں کہ وہ جمالیاتی اعتبار سے بے حد پُرکشش ہے اور نوجوانی کو عبادت و عمل کے تقاضوں سے غافل کر دیتی ہے

"اسرارِ خودی میں جو لکھا گیا وہ ایک لٹریری نصب العین کی تنقید تھی جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے مقبول ہے۔ اپنے وقت میں اس نصب العین سے ضرور فائدہ ہوا لیکن اس وقت یہ غیر مفید ہی نہیں بل کہ مضر ہے۔ خواجہ حافظ کی ولایت سے

لہ۔ اقبال نامہ ۔ حصہ دوم ۔ ص ۔ ۴۰ ۔ ۴۹

اس تنقید میں کوئی سروکار نہ تھا، نہ ان کی شخصیت سے نہ ان کے اشعار میں مئے سے مُراد وہ مئے ہے جو لوگ ہوٹلوں میں پیتے ہیں بل کہ اس سے مُراد وہ حالتِ سُکر ہے جو حافظ کے کلام سے بحیثیتِ مجموعی پیدا ہوتی ہے چوں کہ حافظ ولی اور عارف تصور کئے گئے ہیں، اس واسطے ان کی شاعرانہ حیثیت عوام نے بالکل نظر انداز کر دی ہے اور میرے ریمارک تصوف اور ولایت پر حملہ کرنے کے مترادف سمجھے گئے ہیں۔" [1]

تصوف سے متعلق اقبال کے نظریئے کو سمجھنے کے لیے اس خط کو بھی ملحوظ نظر رکھنا ضروری ہے، [2] جو انہوں نے سراج الدین پال کے نام لکھا ہے جس میں اقبال نے اسلامی لٹریچر پر عجمی اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ بہر حال اس ایک مثال سے اس تضاد و تناقض کی طرف توجہ دلانا تھا جو اقبال کے یک طرفہ اور ادھورے مطالعے سے بعض اوقات محسوس ہوتا ہے۔

اقبال کی معلومات کا دائرہ خاصا وسیع تھا، وہ مغرب و مشرق کے فلسفہ اور ادب پر بہت حد تک حاوی تھے۔ تاہم وہ ہمیشہ اس دائرہ معلومات کو وسیع تر کرنے میں منہمک رہتے تھے، خود کتابیں پڑھتے تھے اور دوسروں سے بھی مختلف کتابوں اور مسئلوں کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔ اس ضمن میں وہ خطوط جو انہوں نے سید سلیمان ندوی کو لکھے ہیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے مطالعہ سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ ان کے دل میں علم کی کرید اور تحقیق کی لگن تھی، انہیں اپنے محدودات (LIMITATIONS) کا علم بھی تھا اور احساس بھی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی تعلیم جس ڈھنگ پر ہوئی ہے، وہ خاص طور پر اسلامی تعلیمات کو نئے سرے سے مدوّن کرنے یا اسلامی فقہ میں اجتہاد کی ضرورت اور فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید میں بہت موزوں نہیں ہے تاہم وہ ان مسائل کو نہ صرف بہت اہم سمجھتے تھے، بل کہ ان مسائل کو اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش بھی کرنا چاہتے تھے، چناں چہ ان مسائل کے مختلف پہلوؤں پر وہ خود بھی غور کرتے رہے اس سلسلے میں مطالعہ بھی کرتے رہتے، ہمعصر علماء سے بھی رائے پوچھتے رہتے اور ان مسائل کے

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم ص ۵۳-۵۷ [2] مکتوب مورخہ سراج الدین پال کے نام۔ اقبال نامہ۔ ص ۳۵-۳۶

بارے میں مفکرین اسلام کی آرا کو پیش نظر رکھتے تھے۔ اس تمام جستجو تلاش و تحقیق کا تھوڑا بہت اندازہ ان کے مکاتیب سے لگایا جا سکتا ہے۔ سید سلیمان ندوی کے نام بیشتر خطوط میں کسی نہ کسی مسئلے یا کسی نہ کسی کتاب کے بارے میں پوچھا ہے۔ یہاں صرف دو ایک اقتباس پیش کیے جاتے ہیں:۔

"مسلمانوں نے منطق استقرائی پر جو کچھ لکھا ہے اور جو جو اضافے انہوں نے یونانیوں کی منطق پر کئے ہیں اس کے متعلق میں کچھ لکھ رہا ہوں۔ میں آپ کا شکر گذار رہوں گا اگر آپ از راہ عنایت اپنی وسیع معلومات سے مجھے مستفیض فرمائیں۔ کم از کم کتابوں کے نام تحریر فرمایئے جن کو پڑھنا ضروری ہے ..... قیاس پر اعتراض سب سے پہلے امام رازی نے کیا تھا، امام غزالی ابن تیمیہ اور شاید شیخ سہروردی مقتول نے اس مضمون پر لکھا ہے۔"[۱]

—— کولمبیا یونیورسٹی کی طرف سے ایک کتاب (MOHAMMADAN THEORIES OF FINANCE) شائع ہوئی تو اس میں اس بات کا اظہار کیا گیا تھا کہ اجماع امت نص قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے۔ اقبال نے اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے استفسار کیا کہ یہ نظریہ کہاں تک صحیح ہے۔ اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:۔

"اس کتاب میں لکھا ہے کہ اجماع امت نص قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے یعنی کہ یہ تیر خوارگی جو نص صریح کی رو سے دو سال ہے کم یا زیادہ ہو سکتی ہے یا حصص شرعی میراث میں کمی بیشی کر سکتا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ بعض حنفاء اور معتزلیوں کے نزدیک اجماع امت یہ اختیار رکھتا ہے مگر اس نے کوئی حوالہ نہ دیا۔ آپ سے یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے یا امر دیگر یہ ہے کہ آپ کی ذاتی رائے اس بارے میں کیا ہے؟ میں نے مولوی ابوالکلام صاحب کی خدمت میں بھی عریضہ لکھا ہے۔"[۲]

مسئلہ زمان سے اقبال کو بہت ہی دلچسپی تھی چنانچہ کئی خطوط میں اس مسئلے کے بارے میں سید سلیمان

۱۔ بحوالہ اقبال اور سید سلیمان ندوی۔ ص ۶۹؛ ۲۔ بحوالہ اقبال اور سید سلیمان ندوی۔ ص ۷۱۔ ۷۲

سے پوچھتے ہیں۔ ایک خط میں انہیں لکھتے ہیں:۔

"شمس بازغہ یا صدرا میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کئے ہیں ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمان خدا ہے۔ بخاری میں ایک حدیث بھی اسی مضمون کی ہے، لاتسبوا الدھر الخ۔ کیا حکمائے اسلام میں کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے، اگر ایسا ہو تو یہ بحث کہاں ملے گی۔" [1]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"کیا یہ ممکن ہے کہ آپ زمان کے متعلق امام رازی کے خیالات کا خلاصہ قلمبند فرما کر مجھے ارسال فرمائیں۔ میں ان کا ترجمہ نہیں چاہتا، صرف خلاصہ چاہتا ہوں جس کے لکھنے میں غالباً آپ کا بہت سا وقت ضائع نہ ہوگا۔" [2]

اقبال سمجھتے تھے کہ مغربی فلسفہ کی مدد سے اسلامی تعلیمات کی توثیق یا تکفیر کرنا نہ صرف اسلام کے ساتھ زیادتی ہے بلکہ علمی تحقیق کے ساتھ بھی بڑی ناانصافی ہے۔ ایک دفعہ انہوں نے رویتِ باری جیسے نازک مسئلے پر سید سلیمان ندوی کو چند سوالات لکھ کر بھیجے۔ سید صاحب کو ان سوالات سے شاید کچھ غلط فہمی ہوگئی۔ اقبال اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

"رویتِ باری کے متعلق جو استفسار میں نے آپ سے کیا تھا، اس کا مقصود فلسفیانہ تحقیقات نہ تھی، خیال تھا کہ شاید اس بحث میں کوئی بات نئی نکل آئے جس سے آئین سٹائن کے انقلاب انگیز "نظریہ نور" پر کچھ روشنی پڑے۔ اس خیال کو ابن رشد کے ایک رسالے سے تقویت ہوئی جس میں انہوں نے ابوالمعالی کے رسالہ سے ایک فقرہ اقتباس کیا ہے۔ ابوالمعالی کا خیال آئین سٹائن سے بہت ملتا جلتا ہے، مگر متقدم الذکر کے یہاں یہ بات محض ایک قیاس ہے اور موخر الذکر نے اسے علم ریاضی کی مدد سے ثابت کیا ہے۔ اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکہ ڈال دیا ہے

---

[1] بحوالہ اقبال اور سید سلیمان ندوی۔ ص ۸۴۔۸۵؛ [2] بحوالہ اقبال اور سید سلیمان ندوی۔ ص ۷۱۔۷۲؛

تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے اور جس کو آپ نے آیت شریفہ کے حوالے سے بیان فرمایا ہے۔" [1]

اقبال پر خود ان کی زندگی ہی میں آئے دن تنقیدیں ہوتی رہتی تھیں لیکن وہ اپنے تنقید نگاروں سے خفا نہیں ہوئے بلکہ جہاں مناسب تھا وہاں ان سے استفادہ بھی کیا۔ اور اپنی لغزشوں کو ماننے میں کبھی پس و پیش نہ کیا۔ سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:-

"معارف میں آپ کا ریویو نظر سے گزرا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ میرے لئے سرمایہ افتخار ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے صحت الفاظ و محاورات کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے ضرور صحیح ہوگا لیکن اگر آپ ان لغزشوں کے متعلق بھی توجہ فرماتے تو میرے لئے آپ کا ریویو زیادہ مفید ہوتا۔ اگر آپ نے غلط الفاظ و محاورات نوٹ کر رکھے ہیں تو مہربانی کر کے مجھے ان سے آگاہ کیجئے کہ دوسرے ایڈیشن میں اصلاح ہو جائے۔" [2]

ایک اور خط میں انہیں لکھتے ہیں:-

"میری خامیوں سے مجھے ضرور آگاہ کیجئے۔ آپ کو زحمت تو ہوگی مگر مجھے فائدہ ہوگا۔" [3]

سید سلیمان ندوی نے ناقدانہ مشورے بھیجے تو اقبال نے کئی خطوں میں اپنے استعمال کئے ہوئے الفاظ اور محاوروں کی سند میں بہت سے شعراء کا کلام پیش کیا اور اس مسئلہ پر برابر خط و کتابت کرتے رہے۔ ان خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کو قدیم شعراء کے کلام پر کس قدر عبور حاصل تھا۔ مولوی حبیب الرحمٰن شیروانی کے نام بھی اسی طرح کے کئی خط ہیں۔ ایک خط میں انہیں لکھتے ہیں:-

"نظر ثانی کرتے وقت آپ کی تنقید سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ اگر میری ہر نظم کے متعلق اس قسم کا خط لکھ دیا کریں تو آپ کا نہایت ممنون ہوں گا۔" [4]

۱۔ بحوالہ اقبال اور سید سلیمان ندوی۔ ص ۱۷۰ ؛ ۲۔ اقبال نامہ جلد اول۔ ص ۸۱ ؛

۳۔ اقبال نامہ جلد اول۔ ص ۸۴ ؛ ۴۔ اقبال نامہ جلد اول۔ ص ۵۰

اقبالؔ ایک صاحبِ ذوق کی داد کو مجموعوں اور مشاعروں کی واہ واہ پر ترجیح دیتے تھے، چناں چہ نیّر واثی ہی کو لکھتے ہیں:-

"آپ کا نوازش نامہ آج صبح ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج مجھے اپنے ٹوٹے پھوٹے اشعار کی داد مل گئی۔ بعض جگہ جو تنقید آپ نے فرمائی ہے بالکل درست ہے..... آپ لوگ نہ ہوں تو واللہ ہم شعر کہنا ہی ترک کر دیں۔ اگرچہ جلسہ میں ہر طرف سے لوگ حسبِ معمول اُن کی تعریف کرتے تھے، مگر جو مزا آپ کی داد سے ملا ہے اُسے میرا دل جانتا ہے۔" [۱]

مولانا اسلم جیراجپوری کو لکھتے ہیں:-

"آپ کا تبصرہ 'اسرارِ خودی' پر الناظر میں دیکھا، جس کے لیے میں آپ کا نہایت ہی شکر گزار ہوں۔ ع۔ دیدمت مردے دریں قحط الرجال
..... آپ کے تبصرے سے مجھے تسکین ہوئی۔" [۲]

جب ضربِ کلیم شائع ہوئی تو بہت سے لوگوں نے اس کتاب میں جوشِ بیان اور شعریت کی کمی کی شکایت کی۔ ان شکایتوں کے بارے میں راس مسعود کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"باقی رہی کتاب، سو یہ ایک TOPICAL چیز ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ بعض خاص خاص مضامین پر میں اپنے خیالات کا اظہار کروں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ ایک اعلانِ جنگ ہے زمانۂ حاضر کے نام اور ناظرین سے میں نے خود کہا ہے۔ ع میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
نوائے چنگ یہاں موزوں نہیں، اس کتاب کا REALISTIC ہونا ضروری ہے اور نوائے چنگ کی تلافی EPIGRAMATIC STYLE سے کی گئی ہے۔" [۳]

۱۔ اقبال نامہ۔ جلد اوّل۔ ص ۷۰، ۲۔ اقبال نامہ۔ جلد اوّل۔ ص ۵۲
۳۔ اقبال نامہ۔ جلد اوّل۔ ص ۳۸۱

مکاتیب اقبال کے مطالعہ سے ان کی مختلف تصانیف نظم و نثر کے بارے میں بھی ہماری معلومات میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اس طرح سے یہ مکاتیب اقبال کی تصانیف کا پس منظر پیش کرتے ہیں۔ ان کے احباب اور مداح اکثر ان کے مجموعہ ہائے کلام کے بارے میں استفسار کرتے یا کسی نظم یا شعر کی وضاحت چاہتے۔ اس نوع کے استفسارات کے جواب میں اقبال نے بعض اشعار و منظومات کی شان نزول ان کے سیاق و سباق کے ساتھ بیان کی ہے۔ بعض مکاتیب میں اپنے شعری مجموعوں کے تکمیلی مراحل ترتیب اور طباعت اور اشاعت کے بارے میں بھی تفصیلی معلومات ملتی ہیں۔ ۱۳ جولائی ۱۹۱۴ء کے خط میں مولانا گرامی کو اپنی فارسی مثنوی 'اسرار خودی' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:۔

"گذشتہ سال ایک مثنوی لکھنی شروع کی تھی۔ ہنوز ختم نہیں ہوئی۔"

۲ فروری ۱۹۱۵ء کو خواجہ حسن نظامی کو اس مثنوی کی اطلاع دیتے ہیں کہ مثنوی اب تقریباً تیار ہے اور اس مثنوی کے موضوع کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں خودی کی حقیقت اور استحکام پر بحث کی ہے اور ساتھ ہی خواجہ صاحب سے اس مثنوی کے لیے کوئی نام تجویز کرنے کو کہتے ہیں۔

مولانا گرامی جو اقبال کے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے اور فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے انہیں ۵ مئی ۱۹۱۵ء کو مثنوی کی تکمیل کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مثنوی ختم ہو گئی۔ کاش آپ یہاں ہوتے یا میں حیدرآباد میں ہوتا تو پریس میں جانے سے پہلے آپ کے ملاحظہ سے گزر جاتی۔"[1]

۱۲ ستمبر ۱۹۱۵ء کو مہاراجہ پرشاد کو لکھتے ہیں:۔

"مثنوی اسرار خودی کی ایک کاپی ارسال خدمت کرتا ہوں۔"

۳۰ ستمبر ۱۹۱۵ء کو انہی کو لکھتے ہیں کہ مثنوی کا دوسرا حصہ لکھنے کا بھی ارادہ ہے "جو باعتبار معانی کے اس سے لطیف تر ہوگا۔"

منشی سراج الدین سے بھی علامہ اقبال کے تعلقات خلوص اور محبت پر مبنی تھے۔ مثنوی

---

[1] مکاتیب اقبال۔ ص ۱۰۴۔

اسرارِ خودی کی تخلیق کے مختلف مراحل اور اپنی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے انہیں ۴۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو لکھتے ہیں:۔

"یہ مثنوی گزشتہ دو سال کے عرصے میں لکھی گئی ہے مگر اس طرح کہ کئی کئی ماہ کے وقفوں کے بعد طبیعت مائل ہوتی رہی۔ چند اتوار کے دنوں اور بعض بے خواب راتوں کا نتیجہ ہے۔ موجودہ مشاغل وقت نہیں چھوڑتے اور جوں جوں اس پروفیشن میں زمانہ زیادہ ہوتا جاتا ہے کام بڑھتا ہی جاتا ہے۔ لٹریری مشاغل کے امکانات کم ہوتے جاتے ہیں اگر مجھے پوری فرصت ہوتی تو غالباً اس موجودہ صورت سے یہ مثنوی بہتر ہوتی۔ اس کا دوسرا حصہ بھی ہوتا جس کے مضامین میرے ذہن میں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حصہ اس حصے سے زیادہ لطیف ہوگا، کم از کم مطالب کے اعتبار سے گو تخیل کے اعتبار سے میں نہیں کہہ سکتا کہ کیسا ہوگا۔ یہ بات طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے جو اپنے اختیار کی بات نہیں۔"[1]

مثنوی کے دوسرے حصے کے لکھنے میں تعویق ہوئی اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے اپنے ایک نیاز مند خان محمد نیاز الدین خان کو ۱۳ فروری ۱۹۱۶ء کو لکھتے ہیں:۔

"مثنوی کا دوسرا حصہ لکھنا چاہتا ہوں، مگر خواجہ حسن نظامی نے بحث چھیڑ کر توجہ اور طرف منعطف کر دی ہے۔ تصوف کی تاریخ لکھ رہا ہوں.... اس کے ساتھ ہی علامہ ابن جوزی کی کتاب کا وہ حصہ بھی شائع کر دوں گا جو انہوں نے تصوف پر لکھا ہے۔"[2]

یکم نومبر ۱۹۱۶ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کو اطلاع دیتے ہیں:۔

"لاہور سے ایک ماہ کی غیر حاضری کا مقصد سیاحت نہ تھا محض آرام تھا، اس واسطے ایک گاؤں چلا گیا۔ اس تنہائی میں مثنوی اسرارِ خودی کے حصہ دوم کا کچھ حصہ لکھا گیا اور ایک نظم کے خیالات پیدا ذہن میں آئے جس کا نام ہوگا۔

---

[1] انوار اقبال نامہ جلد اوّل۔ ص ۲۲۔۲۴ [2] مکاتیب اقبال۔ ص ۱۰۳

اقلیمِ خاموشاں۔"[۱]

۷، فروری ۱۹۱۷ء کو خان محمد نیاز الدین خان کو لکھتے ہیں:۔

"مثنوی کا دوسرا حصّہ تیار نہیں ہو سکا۔ کل فقہ کا وہ مسئلہ نظم کیا جس کی رو سے مسلمانوں کے لیے اس دشمن پر حملہ کرنا حرام ہے جو صلح کی امید پر اپنے حصار وغیرہ گرا دے۔"[۲]

۲، مارچ ۱۹۱۷ء کو انہیں پھر لکھتے ہیں کہ "مثنوی کا دوسرا حصّہ" رموزِ بے خودی" ان شاء اللہ اس سال کے ختم ہونے سے پیشتر ختم ہو جائے گا۔"

—— مولانا گرامی کو ۲۱، مئی ۱۹۱۷ء کو رموزِ بے خودی کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"مثنوی کا دوسرا حصّہ (رموزِ بے خودی) قریب الاختتام ہے۔ تقریظ موعودہ لکھیے۔"

—— ۴، نومبر ۱۹۱۷ء کو خان محمد نیاز الدین خان کو اطلاع دیتے ہیں کہ مثنوی (رموزِ بے خودی) قریب مکمل ہو گئی ہے۔ "صرف چند اشعار کی کسر باقی ہے۔" اسی مہینے کی ۲۷ تاریخ کو انہیں پھر لکھتے ہیں:۔ "مثنوی ختم ہو گئی ہے۔ اسے نقل کر رہا ہوں۔ چند روز کے بعد پریس میں دی جائے گی۔"[۳]

—— ایک ماہ کے بعد یعنی ۲۷، دسمبر انہیں پھر اطلاع دیتے ہیں۔

"مثنوی کل سنسر کے محکمے سے واپس آ گئی ہے ان شاء اللہ آج کاتب کے حوالے کی جائے گی۔"[۴]

خطوطِ اقبال سے یہ چند اقتباسات صرف ان کی دو تصانیف اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی سے متعلق ہیں۔ انہیں بھی انتہائی قطع و برید اور اختصار سے پیش کیا گیا ہے۔ اس قسم کا مواد جو اقبال کی تصانیفِ نظم و نثر کے بارے میں حوالے پیش کرتا ہے مکاتیب میں جابجا بکھرا پڑا ہوا ہے جس کا مطالعہ نہ صرف بذاتِ خود دلچسپ ہے بل کہ ان تصانیف کے پس منظر اور اکثر ان تصانیف کے بارے میں خود مصنف کی رائے بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ رائے ممکن ہے کہ نقادانِ اقبال کے لیے زیادہ وقیع نہ ہو تاہم اس میں شک نہیں کہ اس نوع کے خطوطِ اقبال کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں کافی مدد دے سکتے ہیں۔

۱۔ شادِ اقبال۔ ص ۲۳۔ ۲ و ۳۔ مکاتیبِ اقبال۔ ص ۶۔۷ و ۷ و ۸۔ ۴۔ مکاتیبِ اقبال۔ ص ۱۱

سیرتِ اقبال کا ایک اور روشن پہلو ان کی وسیع القلبی ہے۔ یہ خصوصیت انہیں دوسرے بڑے ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کے خطوط اپنے ہمعصر علماء اور ادیبوں سے چشمک زنی کے اظہار سے قطعاً پاک ہیں۔ وہ جب بھی کسی ہمعصر کا ذکر کرتے ہیں تو نہایت احترام کے ساتھ۔ اِس اعتبار سے وہ اپنے کئی ہمعصروں سے بہت بلند تھے۔ ان کے خطوط سید سلیمان ندوی اور دوسرے علماء کی تعریف سے پُر ہیں۔ سید سلیمان ندوی کے ساتھ تو اُن کے دوستانہ مراسم تھے لیکن دوسرے علماء کا ذکر بھی احترام اور عزت سے کیا ہے جن سے اِس طرح کے تعلقات نہیں تھے۔ سید سلیمان ندوی کو انہوں نے "استاذ الکل" اور "علومِ اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد" کہا ہے اور اُن کے علمی کمالات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ موصوف کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ میں اسلام کی کچھ خدمت کر سکتا۔ فی الحال آپ کی مدد سے کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔"[۱]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"مگر میرے لئے آپ کی رائے پروفیسر نکلسن کی رائے سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔"[۲]

اقبال نے ان لوگوں کے بارے میں جو اُن پر یا اُن کے کلام پر بیجا نکتہ چینیاں کرتے تھے، صرف ایک آدھ جگہ لکھا ہے لیکن ان تحریروں میں بھی ان کا قلم جادۂ اعتدال سے نہیں ہٹتا۔ اس طرح کے لوگوں پر وہ غصہ نہیں ہوتے بلکہ انہیں ہمدردی کا مستحق سمجھتے ہیں۔ شملہ کے کوئی صاحب اقبال کی غزلوں کی اصلاح کر کے انہیں بھیجتے تھے۔ اس خط کا ذکر بابو عبد المجید کے خط میں کرتے ہیں:۔

"یہ کوئی صاحب چھوٹے شملہ سے میری غزل کی اصلاح کرتے ہیں۔ میری طرف سے اُن کا شکریہ ادا کیجئے اور عرض کیجئے کہ بہتر ہو اگر آپ میر اور داغ کی اصلاح کیا کریں۔ مجھ گمنام کی اصلاح کرنے سے آپ کو شہرت نہ ہوگی۔ میرے بے گناہ اشعار کو جو حضرت نے تیغِ قلم سے مجروح کیا ہے اس کا صلہ انہیں خدا سے ملے۔ میں بھی دعا

---

[۱] اقبال نامہ۔ جلد اول۔ ص ۴۸
[۲] اقبال نامہ۔ جلد اول۔ ص ۱۲۹

کرتا ہوں کہ خدا انہیں عقل و فہم عطا کرے۔ میں نے یہ دو حرف محض از راہ ہمدردی تحریر کئے ہیں۔ امید ہے وہ بُرا نہ سمجھیں۔ اکثر انسانوں کو کنجِ تنہائی میں بیٹھے ہمہ دانی کا دھوکا ہو جاتا ہے۔ ان کا قصور نہیں، فطرتِ انسانی ہی اس قسم کی ہے۔"

ابوالکلام آزاد اقبال کے ہمعصر تھے اور اپنے زمانے کے جیّد عالم دین اور عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے مغائرت برتتے تھے۔ اس بے گانگی اور مغائرت کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

"یہ دونوں بزرگ (اقبال اور ابوالکلام) ایک ہی زمانے میں، ایک ہی ملک میں اور ایک ہی ماحول میں باندازِ بے التفاتی یا برنگِ تغافل ایک دوسرے کو دور سے دیکھتے رہے... اور ایک دوسرے کے بارے میں دوسروں کی زبانی باتیں سُنتے رہے... میرا خیال ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے، ایک دوسرے کو پہچانتے بھی تھے یا نہیں اس میں مجھے شبہ ہے۔ اس اندازِ تغافل کو کس چیز پر محمول کیا جائے؟ رنگِ ناآشنائی؟ معاصرانہ چشمک؟ یا اختلافِ مزاج و مشرب و مسلک؟ بزرگوں کے معاملات ہیں، ناموروں کی باتیں ہیں، بڑوں کے مسائل ہیں، ایک خوردا ایک ذرّہ حقیر خاکِ پا، ان جھگڑوں کی وجہ بیان کرے تو قصہ دار و رسن نہ سہی، سنگِ خلائق کا نشانہ بننا لازمی ہے۔ کیا کہا جائے اور کیا کیا جائے علامہ اقبال نے مسائل و مشکلات کے بارے میں صدہا اہلِ علم و فضل سے مشورہ کیا۔ اس فہرست میں اصاغر بھی ہیں اور اکابر بھی۔ علمائے دین بھی اور فضلائے جدید بھی مگر فہرست سے جو نام غائب ہے وہ ابوالکلام کا ہے، مجھے معلوم نہیں کبھی دونوں ایک دوسرے سے ملے ہوں (ممکن ہے ملے ہوں) خط و کتابت بھی شاید ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ امام الہند نے تذکرے سے لے کر غبارِ خاطر تک اپنی نثر کو فارسی اردو کے متعدد شعراء کے شعروں سے مزین کیا ہے لیکن اگر نہیں کیا ہے تو

علامہ اقبال کے شعروں سے نہیں کیا، داغ تک کے اشعار ہیں مگر اقبال کے نہیں
یہ رنگِ نا آشنائی ہے تو عجیب رنگ ہے۔ معاصرانہ چشمک ہے تو عجیب
چشمک ہے۔ یہ اختلافِ مزاج ہے تو عجیب اختلافِ مزاج ہے کہ ایک شخص دوسرے
شخص کے وجود ہی کا انکار کر دے۔" [1]

ڈاکٹر سید عبداللہ نے جو کچھ لکھا ہے یہ صحیح ہے لیکن اس میں پوری صداقت نہیں۔ ایک گونہ مغائرت ان دو بزرگوں میں ضرور تھی لیکن اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ دونوں ضرف ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے اور ایک دوسرے کے مرتبے سے واقف تھے بل کہ دونوں میں خط و کتابت بھی تھی۔ یہ بات ضرور ہے کہ ابھی تک کوئی ایسا خط دستیاب نہیں ہوا ہے جو انہوں نے ایک دوسرے کو لکھا ہو، تاہم دوسرے لوگوں کے نام لکھے گئے خطوط سے اُن کی ایسی مراسلت کی شہادت ملتی ہے مثلاً سید سلیمان ندوی کے نام ۲۸۔اپریل ۱۹۱۸ء کو لکھے گئے خط میں اقبال لکھتے ہیں:

"آج مولانا ابو الکلام کا خط آیا ہے، انہوں نے بھی میری اس ناچیز کوشش (رموز بے خودی) کو بہت پسند فرمایا۔" [2]

سید سلیمان ندوی کے نام جس خط میں اجماعِ اُمت اور نصِ قرآنی کے بارے میں استفسار کیا گیا ہے اور جس کا اقتباس اس سے پہلے دیا جا چکا ہے، اس میں اقبال لکھتے ہیں:-

"..... میں نے مولوی ابو الکلام کی خدمت میں بھی عریضہ لکھا ہے۔" [3]

۱۹۱۹ء میں ابو الکلام کی رہائی کے موقعہ پر اقبال نے سید سلیمان ندوی کے نام خط لکھا، جس میں علاوہ اور باتوں کے وہ لکھتے ہیں:-

"الحمدللہ کہ مولانا آزاد کو آزادی ملی ... مولانا آزاد اب کہاں ہیں؟ پتہ لکھیے کہ ان کی خدمت میں عریضہ لکھوں۔" [4]

---

[1] نقوش، لاہور۔ اقبال نمبر ۲ بابت دسمبر ۱۹۷۷ء۔ ص ۵۴۳ [2] اقبال نامہ جلد اوّل۔ ص ۸۰۔ (بحوالہ روحِ مکاتیبِ اقبال) [3] بحوالہ اقبال اور سید سلیمان ندوی۔ ص ۷۱-۷۲ [4] بحوالہ اقبال اور سید سلیمان ندوی۔ ص ۵۲-۵۳

ان اقتباسات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ان دونوں بزرگوں میں نہ صرف شناسائی تھی بلکہ مراسلت بھی تھی۔ اب رہا سوال کہ مولانا آزاد نے اپنی تصنیفات میں اقبال کا کوئی شعر استعمال نہیں کیا ہے تو اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا بیان بڑی حد تک درست ہے بڑی حد تک اس لئے کہ ابوالکلام نے جہاں فارسی اور اردو کے لاتعداد اشعار سے اپنی نثر کو مزین کیا ہے وہاں اقبال کا صرف ایک شعر غبار خاطر کے اس خط میں ملتا ہے جس پر ۱۸ مارچ ۱۹۴۳ء کی تاریخ درج ہے۔

نالہ کشیدم ورنہ تو بیدار شوی
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

یہ شعر زبورِ عجم سے لیا گیا ہے۔

لیکن اس کی وجہ نہ معاصرانہ چشمک ہے نہ اختلافِ مزاج اور نہ اقبال کے شاعرانہ وجود سے انکار، یہ بات ہوتی تو مولانا آزاد "البلاغ" کے پہلے صفحے پر اقبال کی نظم نہ چھاپ دیتے یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ اقبال وہ واحد شاعر ہیں جن کی نظم "البلاغ"[1] کے پہلے صفحے پر شائع ہوئی۔ شبلی سے مولانا آزاد کے گہرے تعلقات تھے ان کی متعدد نظمیں ابوالکلام نے "الہلال" میں شائع کیں لیکن پہلا صفحہ انہیں بھی نہیں ملا۔ اور بقول قاضی افضل حق قریشی "صرف اقبال کی نظم کو یہ مستثنیٰ مقام حاصل ہوا۔"[2]

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی جو مولانا آزاد کے ہم جنس اور رفیق کار تھے اور مولانا کی نگرانی میں نکلنے والے ہفتہ وار اخبار "پیغام" کے ایڈیٹر بھی تھے۔ انہوں نے "ذکرِ آزاد" میں ایک واقعہ بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

"اسی زمانے کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ مصر کے شاعر احمد شوقی پاشا کو عرب ملکوں نے امیر الشعراء کا خطاب دیا تھا۔ اس پر مولانا (آزاد) کو خیال ہوا کہ ہندوستان میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کو

---

[1] ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء (یہ نظم بعد میں "غرّہ" کے عنوان سے بانگِ درا میں شامل کی گئی)۔
[2] نقوش (لاہور) اقبال نمبر (۲) دسمبر ۷۷ء۔ ص ۵۴۶۔

ملک الشعراء بنا دیا جائے۔ ایک دن صبح مولانا ہاتھ میں کچھ کاغذ لئے میرے کمرے میں آئے اور اپنا خیال ظاہر کیا۔ میں نے سختی سے مخالفت کی۔ تعجب ہو کر فرمایا "کیا ڈاکٹر اقبال اس خطاب کے اہل نہیں ہیں"۔ عرض کیا:۔ "ڈاکٹر اقبال کے شاعرانہ کمالات کے مبتقر آپ ہیں، مجھے شاعری سے ذوق نہیں لیکن ڈاکٹر صاحب محض شاعر ہی نہیں ہیں، سیاسی لیڈر بھی ہیں اور ہم ان کی سیاسیات کے مخالف ہیں۔ ملک الشعراء بن کر وہ سیاسی فائدے بھی اٹھا سکتے ہیں"۔ مولانا سوچ میں پڑ گئے اور میں کہتا رہا۔ "اخبار کے مالک آپ ہیں اور جو چاہیں تجویز پیش کر سکتے ہیں لیکن جب تک ایڈیٹر میں ہوں اپنے ضمیر کے خلاف کسی تجویز کی حمایت نہیں کر سکتا، میرا نام ایڈیٹری سے الگ کر دیا جائے، اس کے بعد بھی اخبار کی خدمت جاری رکھوں گا"۔ یہ سن کر مولانا نے ہاتھ کے کاغذ پھاڑ ڈالے اور فرمایا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں"۔ [۱]

عبدالرزاق ملیح آبادی کی شدید مخالفت کے باعث یہ تجویز ہندوستانی عوام کے سامنے پیش نہ ہو سکی لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کی نظروں میں اقبال کی حیثیت کیا تھی؟ وہ انہیں بجا طور پر اپنے دور کا ملک الشعراء سمجھتے تھے۔

رہا سوال کہ آیا اقبال اور مولانا آزاد کبھی ایک دوسرے سے ملے بھی ہیں یا نہیں تو اس سلسلے میں بھی ہمارے پاس شہادتیں ہیں کہ اس صدی کی یہ دو عبقری شخصیتیں جو بقول سید ابوالاعلیٰ مودودی اس دور کے دماغ تھے۔ نہ صرف ایک دوسرے سے واقف تھے بل کہ ایک سے زاید مرتبہ ان کی ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ پہلی ملاقات اپریل ۱۹۰۵ء میں لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں ہوئی۔ مولانا آزاد اس اجلاس میں لسان الصدق کے ایڈیٹر کی حیثیت میں مدعو تھے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، مولانا کی زبانی لکھتے ہیں:۔

---

[۱]۔ عبدالرزاق ملیح آبادی۔ ذکر آزاد۔ ص ۳۱۳؛

[۲]۔ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد ادیبوں اور نقادوں کی نظر میں۔ چٹان ۲۴ اپریل ۱۹۶۷ء

"اس زمانے میں ڈاکٹر اقبال کی شاعری کو مخزن نے نیا نیا ملک کے سامنے پیش کیا تھا لیکن بہت جلد ہی لوگوں میں غیر معمولی شہرت ہو گئی تھی۔ انجمن میں ان کی نظم خوانی خاص طور پر شوق و ذوق سے سنی جاتی تھی۔ ان سے بھی پہلی مرتبہ اسی سفر میں ملاقات ہوئی۔" [۱]

۱۹۰۵ء کی اس ملاقات کے بعد اقبال اور ابوالکلام کی اور ملاقاتیں بھی ہوئیں یہاں صرف چند ایک کی تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں۔ ۱۹ فروری ۱۹۱۴ء کو مولانا آزاد انجمن ہلال احمر قسطنطنیہ کے وفد کے ساتھ لاہور آئے اور اقبال سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ وفد مسلمانانِ ہند کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہندوستان آیا تھا۔ شام کو بیرون موچی دروازہ میں جلسۂ عام منعقد ہوا، اراکین وفد اور مولانا آزاد جب جلسہ گاہ میں آئے تو حاضرین جلسہ کی طرف سے ان کے گلے میں ہار ڈالے گئے اور بے شمار پھول برسائے گئے۔ اس کے بعد حاجی شمس الدین سکریٹری انجمن حمایت اسلام لاہور نے نواب ذوالفقار علی خان، رئیس مالیر کوٹلہ، سابق وزیر اعظم پٹیالہ کے صدر جلسہ بنائے جانے کی تجویز پیش کی جو اقبال کی تائید سے باتفاق رائے منظور ہوئی۔ مولانا آزاد اسی شام وفد کے ہمراہ واپس چلے گئے۔ اقبال اور نواب ذوالفقار علی خان نے مولانا آزاد پر زور دیا کہ مزید ایک روز لاہور میں قیام پذیر فرمائیں لیکن دوسرے روز چوں کہ دہلی میں بھی جلسہ ہو رہا تھا، لہٰذا انہوں نے معذرت کی۔" [۲]

—— ایک اور ملاقات کے راوی ڈاکٹر شیر بہادر خان ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"ایک دفعہ مولانا لاہور تشریف لائے اور حسب معمول میاں عبدالعزیز بار ایٹ لا کی کوٹھی پر فروکش ہوئے ان کے ہاں خواص کی ایک مجلس عصر کے قریب منعقد ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ علامہ اقبال بھی وہاں موجود تھے۔ اس محفل میں میں اور میرا ایک دوست بھی جا پہنچے۔ مولانا نے وقت کے کسی مسئلہ پر (وہ مسئلہ اب ٹھیک یاد نہیں) فرش پر بیٹھے بیٹھے تقریر کی۔ جب تقریر کر چکے تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ علامہ اقبال سے مخاطب ہوئے

۱۔ ذکر آزاد۔ عبدالرزاق ملیح آبادی۔ ص ۲۰۱۔

۲۔ شمشیر قلم: ۲۷ فروری ۱۹۱۴ء۔ ص ۱۳ (بحوالہ اقبال کے ممدوح علماء قاضی افضل قریشی۔ ص ۱۰۳)۔

اور استفسار کیا "کیوں علامہ صاحب آپ کی کیا رائے ہے؟ علامہ مرحوم نے فرمایا۔ مولانا مجھے آپ سے کلی اتفاق ہے۔"[1]

ایک اور ملاقات کی تفصیل مولانا غلام رسول مہر نے اپنے ایک مکتوب میں دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"ایک ملاقات میرے سامنے نواب سر ذوالفقار علی خان مرحوم کی دعوتِ طعام پر ہوئی تھی۔ حضرت علامہ نے بطور خاص فرمایا تھا کہ ہمیں مولانا آزاد کے پاس بٹھایا جائے تاکہ ان سے باتیں کر سکیں۔ میں نے اس کا انتظام کیا اور کھانے کے دوران میں دونوں بزرگ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔"[2]

—اقبال کی وفات پر مولانا آزاد نے جو پیغام اخباروں کے لیے جاری کیا اس میں فرماتے ہیں:

"یہ خیال کرتے ہوئے کس قدر صدمہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اس جہان سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے۔ ہندوستان آپ سے بڑا اردو شاعر پیدا نہیں کر سکا۔ آپ کی وفات سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ مشرق کو نقصانِ عظیم پہنچا ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس لئے زیادہ صدمہ ہے کہ مرحوم سے میرے دوستانہ تعلقات تھے۔"[3]

ایک نجی خط میں مولوی محی الدین احمد قصوری کو لکھتے ہیں:-

"اقبال کی موت سے نہایت قلق ہوا۔ ع بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔"[4]

—غرض جہاں اقبال ابوالکلام آزاد کے علمی مرتبے کے معترف تھے وہاں ابوالکلام بھی اقبال کی ملک الشعرائی کے قائل تھے۔

اقبال جب اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے تو وہاں انگلستان میں ان کی ملاقات مس عطیہ فیضی سے ہوئی جو نہ صرف بہت ہی روشن خیال اور ذہین تھیں بلکہ اعلیٰ درجے کا علمی اور ادبی ذوق رکھتی تھیں

---

[1] چٹان۔ ابوالکلام نمبر: ۱۵ فروری ۱۹۶۵ء۔ ص ۱۷

[2] مکتوب مولانا غلام رسول مہر بنام فیض لدھیانوی مورخہ ۲۰ مئی ۱۹۷۱ء (بحوالہ اقبال کے ممدوح علماء ص ۱۰۴)

[3]، [4] مکاتیب ابوالکلام آزاد (مرتبہ ابو سلمان شاہجہانپوری) ص ۳۰۲

خود اقبال بھی اُس کی ذہانت اور علمی اور ادبی ذوق کے قایل تھے چناں چہ اس ضمن میں ایک تو عطیہ بیگم فیضی کا اپنا بیان بھی قابل توجہ ہے اور پھر —— خود اقبال کے خطوط سے بھی یہ بات مترشح ہوتی ہے عطیہ بیگم لکھتی ہیں:۔

"فلسفیانہ مضامین پر تبادلۂ خیال کی وجہ سے انہوں نے مجھ سے خط و کتابت شروع کی اور اکثر مواقع پر انہوں نے چھٹیوں کے دن گزارنے کے لیے مقام کے تعین اور کتابوں کے انتخاب میں میری امداد طلب کی۔ جدید فلسفے کے متعلقہ نصاب کو میں نے ان ہی دنوں ختم کیا تھا۔" [1]

اقبال نامہ کے مرتب شیخ عطاء اللہ نے لکھا ہے کہ اقبال نے عطیہ کی رائے کی وقعت کو عملاً تسلیم کیا۔ یہاں تک کہ انہیں اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ اور تاریخ عالم کا مسودہ پورا سنایا۔" [2] ضیاء الدین احمد برنی جنہوں نے عطیہ فیضی کی انگریزی کتاب 'اقبال' کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اس سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

"اقبال نہ صرف انہیں (عطیہ فیضی کو) نظمیں بھیجتے تھے اور ان پر تنقید کے طالب ہوتے تھے بل کہ انہوں نے اپنے مقالے بھی یونیورسٹی کو بھیجنے سے پہلے انہیں پڑھ کر سنائے تھے اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ ان پر تبصرہ کریں چناں چہ بعض حصّوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال ان تبصروں سے ایک حد تک مستفید بھی ہوئے۔" [3]

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مس عطیہ بیگم فیضی کا تعارف کرا دیا جائے۔ مس فیضی کو بیسویں صدی کے آغاز میں ہی تحصیل علم کے لیے انگلستان بھیجا گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان یہ طے بھی نہ کر پائے تھے کہ مغربی تعلیم ملت کے لیے مفید ہے یا مضر۔ بہر حال خواتین میں یہی وہ شخصیت ہیں جو سب سے زیادہ اقبال پر اثر انداز ہوئیں ان کے تعارف کے لیے آئیے سب سے پہلے ہم رئیس احمد جعفری کی کتاب 'دید و شنید' کی ورق گردانی کرتے ہیں۔

---

[1] بیگم عطیہ فیضی۔ اقبال (ترجمہ ضیاء الدین برنی) ص ۱۹۔ طبع دوم۔

[2] اقبال نامہ۔ جلد دوم۔ ص ۱۰۱۔ [3] اقبال (ترجمہ ضیاء الدین برنی) ص ۷۔

"مولانا (عرفان) آگے آگے تھے میں پیچھے پیچھے۔ اب ہم ایک کشادہ اور شاندار ہال میں پہنچے۔ استقبال کے لیے سفید لباس میں ملبوس ایک کہن سالہ خاتون آگے بڑھیں۔ بال سفید، چہرہ ضعیفی کا آئینہ دار لیکن ادا اور میں شوخی، اندازِ گفتگو میں بے باکی حرکات و سکنات میں ایک خاص قسم کی انفرادیت۔ مولانا نے ان سے میرا تعارف کرایا: "یہ ہیں خلافت کے اڈیٹر جعفری صاحب۔" اور پھر مجھ سے فرمایا "یہ ہیں عطیہ بیگم فیضی۔"

"عطیہ بیگم، کتنا دلاویز نام اور اس نام کے ساتھ وابستہ کتنی رنگین حکایتیں اور کتنی ہوش رُبا کہانیاں اور کتنی دلچسپ داستانیں وابستہ تھیں۔ یہ بوڑھا مجسمہ جس میں آج نہ کوئی رعنائی ہے نہ زیبائی ہے نہ دلکشی ہے نہ سحر طرازی۔ اپنے زمانے میں کیا کچھ نہیں تھا۔ یہ بے رس آنکھیں جس طرف اٹھ جاتی تھیں، قتل عام شروع ہو جاتا تھا۔ میں اپنے حافظے پر تاریخِ ماضی کے اوراق الٹ رہا تھا کہ عطیہ بیگم نے تپاک کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ تو آج پہلی بار ہمارے یہاں آئے ہیں، آئیے میں آپ کو اپنے مکان کی سیر کراؤں۔"[1]

یہ تعارف تو خیر عطیہ بیگم کے بڑھاپے کا ہے۔ ۱۹۰۳ء میں جب عطیہ کا آغازِ جوانی تھا۔ مولوی عبدالرزاق البرامکہ جو اُن دنوں جسٹس بدرالدین طیب جی کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے نے انہیں دیکھا تو اپنے تاثرات کو یوں قلمبند کیا:

"عطیہ بیگم کو دیکھا اور گفتگو سے اندازہ ہوا کہ "ہنوز غنچۂ استعدادش ناشگفتہ است" یعنی سلسلۂ تعلیم جاری ہے۔ عطیہ میں اردو مذاق کے ساتھ فارسی کا بھی ذوق ہے۔"[2]

ستمبر ۱۹۰۶ء میں استعداد کا غنچہ پھول بن چکا تھا جس کی مہک سے مولانا شبلی جیسا ذہین اور فطین ادیب، صفِ اوّل کا انشاء پرداز، جہاں دیدہ سیاح، تجربہ کار مورخ، مذہبی رہنما اور متعدد علوم پر حاوی انسان "بھی لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں جب عطیہ بیگم لکھنؤ آئیں تو دیکھیے شبلی کس پُرلطف انداز میں مہدی افادی سے اُن کا ذکر کرتے ہیں۔

"بمبئی کا مہمان آج کل حسنِ اتفاق سے یہیں ہے۔ یہ لفظ یعنی اس کا پہلا جزو کبھی

---

[1] دید و شنید۔ رئیس احمد جعفری، ص ۳۷۲۔ ۳۷۳۔

[2] یادِ ایام۔ مولوی عبدالرزاق البرامکہ۔ ص ۲۷۰۔

اس سے عمدہ تر موقعے پر استعمال نہ ہوا ہوگا۔ ان صحبتوں میں اس کی قابلیت کے حیرت انگیز پہلو نظر سے گزرے ہیں، اُردو، فارسی، انگریزی، فرینچ، زبان دانی، مصوری، نقشہ کشی، پالٹیکس، قوتِ تحریر ع آنچہ عالم ہمہ داشت تو تنہا داری۔ افسوس غیرت و محبت کی کشمکش تھی، ورنہ آپ بھی وہ دیکھتے جو میں کہتا ہوں۔"[1]

کم و بیش اسی زمانے میں سید سجاد حسین یلدرم کی ملاقات بھی عطیہ بیگم سے ہوتی ہے۔ اس ملاقات سے یلدرم کس طرح محظوظ ہوتے ہیں، اس کا ذکر شیخ عبد القادر کی زبانی سنئے جسے قرۃ العین حیدر نے کارِ جہاں دراز ہے میں یوں بیان کیا ہے:۔

"۱۹۰۷ء میں مسلمانوں کی تعلیمی کانفرنس کراچی میں ہورہی تھی، جس کے صدر اس سال مولانا حالی تھے۔ سجاد حیدر بھی شریک تھے۔ ایک روز جب جلسہ دوپہر کے کھانے کے لیے برخاست ہوا اور میں اپنی قیام گاہ کی طرف جارہا تھا کہ سامنے سے سجاد حیدر آتے نظر آئے، مجھے دیکھتے ہی انہوں نے ایک دو چکر لگائے جیسے خوشی سے رقص کر رہے ہوں اور مجھ سے کہنے لگے: "کچھ نہ پوچھئے، میرا دماغ اس وقت آسمان پر ہے اور میں زمین پر کسی سے بات کرنے کو تیار نہیں ہوں۔" میں نے پوچھا "کچھ تو بتائیے، کیا دیکھا ہے جو طبیعت اس طرح زوروں پر ہے۔" کہنے لگے "ایک ایسی عورت سے باتیں کرکے آیا ہوں جو آزادی کی حامی اور خود بھی آزادی پر عامل ہے۔"[2]

اسی ضمن میں اب مولانا ابو الکلام آزاد کو بھی سن لیجئے، جو عطیہ بیگم کے نام اپنے ایک خط میں یوں رقمطراز ہیں:۔ "بلاشبہ ایک گرفتاری سے رہائی مل چکی ہے لیکن اور کتنی گرفتاریاں باقی ہیں۔ اس گرفتاری کی نہ طلب تھی نہ انکار۔ لیکن بعض گرفتاریاں ایسی ہیں کہ چھوٹنا بھی چاہیں نہیں چھوٹ سکتے، مثلاً آپ کے لطف و عنایات کی اسیری ع

خلاص حافظ ازاں زلف تابدار مباد"[3]

یہ سبھی حضرات ثقہ تھے، اپنے وقت کے نابغہ تھے، تو ان لوگوں کی نظروں میں کسی عورت کا اس طرح سے بچ جانا واقعی بڑی حیرت انگیز بات ہے۔ اس سے اس بات کا

---

[1] مکاتیب شبلی، دوم، ص ۲۲۰۔ [2] کارِ جہاں دراز ہے، ص ۱۲۰۔۱۲۱۔ [3] شبلی نامہ۔ حاشیہ ص ۱۶۲۔

سراغ ملتا ہے کہ عطیہ بیگم فیضی کس قدر غیر معمولی شخصیت کی مالک رہی ہوں گی۔ لہٰذا اگر اقبال جو بنیادی طور پر ایک شاعر تھے' ان سے متاثر ہوئے تو ہمیں بالکل تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔

مس عطیہ فیضی نے ۱۹۴۷ء میں اقبال کے نو خط اور یورپ کے قیام کی کچھ تفصیلات اپنی یادداشتوں کے اقتباسات کے طور پر شائع کر دیئے۔ یہ خطوط مکاتیبِ اقبال کے مطالعے کے سلسلے میں بے حد اہم ہیں۔ ان سے اقبال کی یورپ میں مصروفیات کی تفصیل کے علاوہ یورپ سے آنے کے بعد ان کی ذہنی کیفیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور اس طرح سے اقبال کی شخصیت کے کچھ ایسے گوشے بھی منور ہو جاتے ہیں جو ان خطوط کی عدم موجودگی میں غالباً ہمیشہ تاریکی میں ہی رہ جاتے۔ "اقبال نے اپنی شخصیت پر بہت سے پردے ڈال رکھے تھے اور ہر ایک کو اپنی صورت دکھاتے بھی نہ تھے" پروفیسر مجیب کا یہ قول بالکل صحیح ہے لیکن اس کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تیرہ ۱۳ سو خطوط میں کم از کم یہ دس خط جو عطیہ کے نام ہیں ضرور ایسے ہیں جن میں اقبال کی زندگی کے کچھ ایسے لمحوں کی رونمائی ہوتی ہے جن میں پاس گریباں کے باوجود بھی زورِ جنوں کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔ ان خطوط میں بین السطور اقبال کی شخصیت کے چند دلچسپ گوشے بھی بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ یہ خطوط اقبال کی زندگی کے اس دور کی عکاسی کرتے ہیں جس میں وہ اپنی گھریلو زندگی اور چند الجھنوں کے باعث زبردست ذہنی پریشانی اور کوفت میں مبتلا تھے۔ اس پریشانی کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور میں اقبال وطن سے ہجرت اور خودکشی کی باتیں سوچتے تھے۔ عطیہ بیگم فیضی کے اقبال کے نام خطوط اگرچہ منصۂ شہود پر نہیں آ سکے تاہم لگتا ہے کہ عطیہ کی ہمدردیاں اور اس کے مخلصانہ مشورے یقیناً اقبال کے لیے طمانیت اور سکون کا باعث ہوئے۔ ان خطوط سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اقبال عطیہ فیضی سے اپنے دل کی وہ بات بھی کہتے تھے اور کہہ سکتے تھے جو وہ اور کسی سے نہیں کہتے تھے اور اس خصوصیت میں اقبال کا کوئی اور دوست شریک نہیں اور اس طرح سے ان خطوط کا مطالعہ اقبال کے ذاتی میلانات اور شخصیت کے بعض ایسے رجحانات کی نقاب کشائی میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے جن کے بارے میں ان خطوط کی غیر موجودگی

میں ہمارا مطالعہ اور تجزیہ یک طرفہ اور نامکمل رہ سکتا تھا۔ اقبال اپنے احساسات اور خاص طور پر اپنے جذبات کا برملا اظہار کرنے میں ہمیشہ ہی سے بڑے محتاط تھے اور خود کو لئے دیئے رکھتے تھے تاہم عطیہ کے نام خط لکھتے وقت احتیاط کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا تھا۔ پھر بھی لکھتے لکھتے کہ وہ چونک سے پڑتے ہیں اور اپنے قلم کی جولانی پر روک لگا کر بات کا رُخ پھیر دیتے ہیں۔

"مجھے ڈر ہے کہ میں وہ باتیں لکھ رہا ہوں جو صرف گفتگو کے لیے محفوظ رہنی چاہئیے تھیں میں اس کے متعلق اور کچھ نہیں لکھوں گا۔ اس لئے کہ مجھے ترغیب ملتی ہے کہ میں اپنے دل کی ساری باتیں کہہ ڈالوں اور بہت سی دوسری باتیں بھی کہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ اسی نوعیت کی ہوں جنہیں میں کاغذ پہ لانا نہیں چاہتا۔"[1]

—— لیکن اس کے باوجود بھی یہ خطوط بے تکلفی سے لکھے گئے ہیں اقبال کو خدشہ تھا کہ عطیہ فیضی شاید انہیں غلط سمجھ رہی ہے یا پھر یہ کہ وہ اپنا مافی الضمیر واضح طور پہ بیان نہیں کر سکتے چنانچہ اسی خدشے کے باعث اقبال نے انہیں ایک خط میں کہا:۔

"میں اسی خیال سے کانپ اٹھتا ہوں کہ آپ میری فطرت سے ناواقف ہیں۔ کاش میں اپنے دل کو اندر سے دکھا سکتا تاکہ آپ بہتر طریقے سے میری رُوح کا مشاہدہ کر سکیں۔"[2]

ان خطوط میں اقبال اپنے بارے میں ایک مخصوص انداز کے اظہار اور اپنے غموں اور دکھوں پر ایک خاص زاویئے سے روشنی ڈالتے ہیں۔ اس میں جہاں بقول کسے خود آسودگی تھی وہاں مخاطب سے دل طلبی اور اس سے وابستہ نفسی محرکات کو کلیتاً نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔[3] یہ بات یقیناً قابل لحاظ ہے کہ اقبال جب یورپ کے تین سالہ قیام کے بعد وطن لوٹے تو انہیں اس شدید تفاوت کا احساس ہوا جو لندن اور ہائیڈل برگ کی مجلسی زندگی اور لاہور میں اقبال کے گھر کی فضا میں پایا جاتا تھا اور انہیں رہ رہ کر یورپ کی گزری ہوئی صحبتوں کی یاد آتی تھی۔ ۷۔ اپریل ۱۹۰۹ء کے خط میں عطیہ کو لکھتے ہیں:۔

---

1. عطیہ فیضی۔ اقبال (ترجمہ برنی) ص ۔ ۱۷؛ 2. عطیہ فیضی۔ اقبال (ترجمہ برنی) ص ۔ ۶۷؛

3. حیات اقبال ۔ ص ۔ ۱۸۲؛

"چند روز ہوئے ویگے ناست کا خط آیا تھا جب اسے جواب لکھوں گا تو وہ دن یاد کراؤں گا جب آپ جرمنی میں تھیں افسوس ہے کہ وہ دن اب ہمیشہ کے لیے گزر گئے۔" ؎

پروفیسر محمد عثمان نے اپنے ایک مضمون حیاتِ اقبال کا ایک جذباتی دور" میں اقبال کی ذہنی کشمکش اور جذباتی ناآسودگی کے احساس کی بڑی معقول اور قابلِ فہم توجیہ کی ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"تب اقبال وطن واپس آئے تو وہ دوسرے کئی ہندوستانیوں کی طرح وہاں سے کوئی نئی شادی کر کے کسی کو ساتھ تو نہیں لیتے آئے تھے لیکن وہ ایسا ذہن ضرور لائے تھے جو انہیں نئی شادی، نئی ازدواجی زندگی پر مجبور کرے۔ یورپ سے واپس آنے والا اقبال یورپ جانے والے اقبال سے کئی اعتبار سے مختلف تھا۔ ان کی آرزومندی، ارادوں کی پختگی اور حوصلوں کی بلندی تو وہی تھی لیکن ان آرزوؤں اور ارادوں کے پیچھے کام کرنے والا ذہن اس دوران میں اپنے ارتقاء کی کئی اور منزلیں طے کر چکا تھا۔ وہ وطنیت کے سیاسی تصور کی ہولناکیوں سے آگاہ ہو کر اسلام کے روحانی اور عمرانی نظام کے قریب آچکے تھے اور اب واپس آکر انہیں اپنی شاعری کے لیے ایک نئی منزل (ملتِ اسلامیہ کی بیداری اور اسلامی قدروں کے احیاء کی منزل) کا تعین کرنا تھا پھر وہ ذاتی زندگی کے متعلق اپنے معاش اور معاشرتی مستقبل کے متعلق بھی مختلف طریق سے سوچ رہے تھے۔ سرکاری ملازمت کی نسبتاً آسان اور ہموار راہ چھوڑ کر انہیں وکالت کا آزادانہ مگر جو پُر خار اور دشوار گزار راستہ اختیار کرنا تھا۔ وطن واپس پہنچ کر چند عزیزوں اور دوستوں سے ملنے کے بعد انہوں نے پوری سنجیدگی کے ساتھ ان دونوں میدانوں میں اپنی تگ و دو شروع کر دی لیکن انہیں جلد معلوم ہو گیا کہ ان کی سعی و تلاش اور شوق و جستجو کا ایک گوشہ اور بھی ہے جسے وہ نظر انداز نہیں کر سکتے اور یہ ان کی صنفی محبت اور گھریلو زندگی کا گوشہ تھا۔ یورپ میں وہ عورت کے جن ذہنی اور تہذیبی اوصاف سے آشنا ہوئے تھے ان کو بھول جانا یا ازدواجی اور

؎۔ اقبال نامہ۔ جلد دوم۔ ص ۱۳۱۔

جذباتی زندگی میں ان کی قدر و قیمت سے انکار کرنا اب ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ انہیں یقیناً رہ رہ کر فراؤ سینے شل کی فلسفہ طرازی، ویگے ناسٹ کی نکتہ آفرینی، عطیہ فیضی کی حاضر دماغی اور گزری ہوئی صحبتوں اور بیتے ہوئے دنوں کی یاد آتی ہو گی۔ اور اس کے مقابلے میں جب وہ اپنے گھر کی مالکہ اپنی رفیقۂ حیات کو دیکھتے ہوں گے جو افلاطون کے فلسفے اور حافظ کی شاعری پر گفتگو کرنا تو درکنار غالباً اُن کے نام سے بھی آشنا نہ تھیں تو اُن کا دل خون ہو جاتا ہو گا۔ ان کی زندگی پر مایوسی اور اضطراب کے سیاہ بادل چھا جاتے ہوں گے اور مستقبل پر اُن کے پختہ اعتقاد کی بنیادیں ہل جاتی ہوں گی۔"[1]

——— اس سلسلے میں آگے بڑھنے سے پہلے علامہ اقبال کی پہلی بیگم کی قرابت دار محترمہ بلقیس عابد علی کے اس مضمون سے درج ذیل اقتباس برمحل ہو گا جو لیڈی اقبال کے عنوان سے ہفت روزہ صادق لاہور بابت ۲۰ اپریل ۱۹۵۶ء کو شائع ہوا تھا۔ اقبال کی پہلی بیگم کے بارے میں وہ لکھتی ہیں:۔

"اماں مرحوم بہت سیدھی اور نیک دل عورت تھیں۔ وہ اپنا نام لکھنے کے سوا پڑھنا لکھنا بالکل نہ جانتی تھیں۔"

——— اس پس منظر میں اقبال کے اس خط سے اقتباس دیکھئے جو انہوں نے ۱۹ اپریل ۱۹۰۹ء کو یعنی یورپ سے واپسی کے کوئی آٹھ ماہ بعد عطیہ فیضی کو لکھا:۔

"بلاشبہ چند روز قبل میں نے علی گڑھ کے شعبۂ فلسفہ کی پروفیسری اور گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ تاریخ کی صدارت قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ میں دراصل ملازمت میں پھنسنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس ملک کو چھوڑ جاؤں۔ اس کی وجہ آپ کو معلوم ہے۔ مجھے صرف اس بات نے روک رکھا ہے کہ میں اپنے بھائی کے احسانات سے بے حد زیر بار ہوں۔ میری زندگی نہایت تلخ ہے۔ یہ لوگ میری بیوی کو زبردستی میرے سر چپکنا چاہتے ہیں۔ میں نے والد ماجد کو

---

[1] پروفیسر محمد عثمان۔ حیات اقبال کا ایک جذباتی دور (حیات اقبال ص ۱۲۳۔۱۲۵)۔

لکھ دیا ہے کہ انہیں میری شادی کر دینے کا کوئی حق حاصل نہ تھا خصوصاً جب کہ میں نے اس سے انکار کر دیا تھا۔ میں بیوی کی کفالت پر ہر وقت آمادہ ہوں لیکن اسے اپنے پاس رکھ کر اپنی زندگی کو عذاب بنانے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ ایک انسان ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی مسرت کا حق حاصل ہے۔ اگر معاشرہ یا فطرت میرے حق سے انکار کریں گے تو میں دونوں کے خلاف بغاوت کروں گا۔ میرے لئے ایک ہی چارہ کار ہے کہ میں اس بدبخت ملک کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ جاؤں یا پھر شراب نوشی میں پناہ ڈھونڈوں کہ خودکشی کا مرحلہ آسان ہو جائے۔ کتابوں کے یہ بے جان اور خشک بوسیدہ اوراق میرے لئے وجہ مسرت نہیں بن سکتے۔ میری رُوح کی گہرائیوں میں اس قدر آگ بھری ہے کہ میں ان کتابوں کو اور ان کتابوں کے ساتھ سماجی رسم و روایات کو بھی جلا کر خاکستر بنا سکتا ہوں۔"

— اتنا ہی نہیں بل کہ اس ہیجانی دور میں، خدائے خیر پر ان کا ایمان بھی متزلزل ہو گیا تھا۔ اسی خط میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:-

"آپ کہتی ہیں کہ دُنیا کو ایک خدائے خیر نے پیدا کیا ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن زندگی کے حقائق تو کسی اور ہی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ عقل انسانی کی رُو سے دیکھا جائے تو یزدان کی نسبت ایک ابدی قادر مطلق اہرمن پر ایمان لانا زیادہ آسان نظر آتا ہے"۔

ازدواجی زندگی کی یہ ناآسودگیاں پہلی بیوی سے مستقلاً کنارہ کشی پر منتج ہوئی اور اس آسودگی کے حصول کے لیے اقبال کو دو اور شادیاں کرنا پڑیں۔ یہ شادیاں ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں ہوئیں۔ عبدالمجید سالک نے ان شادیوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے[۱] جبکہ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے ان کا ذکر ۱۹۱۴ء کے تحت کیا ہے۔ بہرحال ان شادیوں کے بعد اقبال بروایت مرزا جلال الدین بالکل مطمئن تھے اور اپنے آپ کو جنت الفردوس[۲] میں خیال کرتے تھے۔ یہاں یہ بات واضح

لہ، ۲ے۔ ذکر اقبال۔ ص ۹۱ (ناشر چمن بک ڈپو دہلی)۔

کردینی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اقبال کا ذہنی اضطراب محض ازدواجی زندگی کی ناخوش گواری ہی کی وجہ سے نہ تھا۔ ایسا کہنا حقائق کی حد سے زیادہ سادہ تعبیر ہوگی حقیقت یہ ہے کہ جو تزلزل ذہنی اور کرب عطیہ فیضی کے نام خطوط میں ملتا ہے خاص طور پر متذکرہ بالا خط میں' اس کے لیے محض ازدواجی تلخی کو ذمہ دار ٹھہرانا صحیح نہیں ہے۔ اس کے پیچھے بعض پیچیدہ عناصر اور ان کی آویزش اور کشمکش کارفرما تھی۔ یہ کشمکش وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مدھم پڑ گئی۔ اس میں اس خود اعتمادی اور توازن پسندی نے ان کی مدد کی جو اقبال کے مزاج اور شخصیت کی شان تھی۔ ان کے مزاج کی اسی توازن پسندی اور خود اعتمادی نے انہیں احساس نامرادی اور محرومی کی تلخیوں سے بچا کر ان میں ایک طرح کی دلسوزی اور دردمندی پیدا کی جو اپنے سوز و گداز کے باوصف صحت مند اور رجائی تھی۔ اور پھر یہ بھی ہوا کہ وقت کے ساتھ ساتھ انھوں نے عشق رسول، عشق ملت، عشق انسانیت اور عشق باری تعالیٰ کی تمام ضروری اور حیات بخش منزلیں طے کیں اور ان کا قلب ان تمام لطیف اور نازک کیفیات سے آشنا ہوا جنہیں بجا طور پر انسانیت کی ایک معراج قرار دیا جاسکتا ہے۔"[۱]

عطیہ بیگم کے نام اقبال کے خطوط سے اقبال اور عطیہ بیگم کے آپسی تعلقات کے بارے میں بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے لیکن محض انہی کو بنیاد بنا کر قطعی اور حتمی طور پر کچھ کہنا دیانت کے خلاف ہوگا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کا مطالعہ کئی طرح کے پریشان کن سوالات کو ابھارتا ہے۔ جن کی طرف یہاں صرف اشاروں پر ہی اکتفا کیا جائے گا۔ ایک یہ کہ اقبال اور عطیہ بیگم کی خط و کتابت ۲۶ سال کے عرصے پر محیط ہے۔ پہلا خط کیمبرج سے ۱۹۰۷ء میں لکھا گیا ہے اور آخری خط لاہور سے ۱۹۳۳ء میں۔ تعلقات کی نوعیت کا جو اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے۔ اُن کے پیش نظر یہ باور کر لینا مشکل ہوتا ہے کہ اقبال نے صرف یہی دس خط لکھے ہوں گے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ عطیہ بیگم کے نام باقی خط مصلحت کی نذر ہو گئے ہوں۔ دوسرے یہ کہ سوائے ایک کے یہ بھی خط ۱۹۱۱ء ہی تک لکھے گئے ہیں اور ایک اور خط جو اس مجموعے میں شامل نہیں ہے، ۱۹۳۳ء میں لکھا گیا ہے۔ اس عرصے میں یعنی ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۳ء تک اقبال نے عطیہ فیضی کو کوئی

---

[۱] بحوالہ پروفیسر محمد عثمان ۔ حیات اقبال کا ایک جذباتی دور (حیات اقبال) ص ۱۴۹ - ۱۵۰۔

خط نہیں لکھا۔ اگر واقعی ایسا ہے تو اس طرح تعلقات کو بیک قلم منقطع کرنے کی وجہ کیا تھی۔ تیسرے یہ کہ یہ خط عطیہ فیضی نے ۱۹۴۷ء میں یعنی اقبال کی وفات کے تقریباً ۹ سال بعد شائع کئے۔ اس تاخیر میں تو خیر عطیہ فیضی کا اعتذار قبول کیا جا سکتا ہے لیکن عطیہ بیگم نے جو خط اقبال کو لکھے ہیں وہ آج تک چھپنا تو درکنار دستیاب بھی نہیں ہو سکے ہیں۔ کیا اقبال نے انہیں خود ضائع کر دیا؟ اقبال کا خطوط کو پڑھ کر ضائع کر دینے کی شہادت تو موجود ہے لیکن عطیہ فیضی کو تو اقبال نے ایک خط میں یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ اس کے خط ایک مخصوص ڈیسک میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ محفوظ کر لینے اور دوسروں کی نظروں سے چھپائے رکھنے کی یقین دہانی کہیں اس لئے تو نہیں کرائی گئی ہے کہ عطیہ فیضی کھل کر بات کر سکیں؟ میرا اپنا خیال ہے کہ اقبال نے کچھ دیر کے بعد (غالباً ۱۹۱۱ء میں) یہ خطوط خود اپنے ہاتھوں تلف کر دیئے ہیں کیوں کہ ایک تو اقبال نے اپنے اضطراب اور کرب پر اس وقت تک تھوڑا بہت قابو پا لیا تھا اور پھر ایک عظیم انسان کی طرح اس بے چینی اور شکستِ آرزو کو اپنے علمی، شعری اور قومی مشاغل کی راہ میں رکاوٹ بنتے دیکھ کر حالات اور ملول سے ایک حد تک سمجھوتہ بھی کر لیا تھا۔ اس خیال کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ اسی زمانے میں یعنی ۱۹۱۱ء کے وسط میں انہوں نے اپنا بہت سا شعری کلام بھی خود ہی ضائع کر دیا اور محض اس وجہ سے ضائع کر دیا کہ ان کی نوعیت بقول اقبال حد درجہ پرائیویٹ تھی چنانچہ ۷ جولائی ۱۹۱۱ء کے خط میں عطیہ فیضی ہی کو لکھتے ہیں:-

> "گزشتہ پانچ سال سے میری نظمیں زیادہ تر پرائیویٹ نوعیت کے حامل ہیں اور میں سمجھتا ہوں پبلک کو انہیں پڑھنے کا حق نہیں بعض تو میں نے خود تلف کر ڈالی ہیں تاکہ کوئی انہیں چرا کر شائع نہ کرا دے۔" [۱]

شاعری کے بارے میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ یہ ایک تمثیلی فن ہے اور اس میں مشاہدۂ حق کی گفتگو میں بادہ و ساغر کہے بغیر نہیں بنتی تو جب اس ضمن میں بھی اقبال نے اس قدر احتیاط سے کام لیا تو ظاہر ہے خطوط کے معاملے میں وہ کس قدر محتاط رہے ہوں گے۔ یقیناً انہوں نے عطیہ فیضی کے خط ضائع کئے

---

[۱] اقبال نامہ۔ جلد دوم۔ ص ۱۴۸۔

ہوں گے۔ بہرحال عطیہ فیضی نے اقبال کے یہ چند خطوط شائع کر کے اقبال کے قارئین پر احسان کیا ہے کہ ان سے بھی بڑی حد تک اقبال کی شخصیت کے کچھ اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ذیل میں ان خطوط سے چند اقتباسات بدونِ شرح دیئے جاتے ہیں کہ بقول کسے "یہ شراب جام بلور کے باہر بھی عکس ریز ہونے لگتی ہے۔"

"افسوس ہے مجھے دوسروں کی خاطر آپ کے لطفِ صحبت سے محروم ہونا پڑ رہا ہے۔" [۱]

"ملامت نامہ کے لیے جس سے میں بے حد لذت اندوز ہوا سراپا سپاس ہوں۔ ایک دوست کی ملامت سے زیادہ لطف کسی دوسری چیز میں نہیں۔" [۲]

"شومیِ قسمت سے میں اپنے تعلقِ خاطر کے اظہار و اعلان کا عادی نہیں لیکن اسی عدمِ اظہار کی بدولت میرے تعلقِ خاطر میں ایک گہرائی اور گرم جوشی پائی جاتی ہے، مگر دنیا یہ سمجھتی ہے کہ میں ایک بے حس انسان ہوں۔" [۳]

"مجھے اندیشہ ہے کہ آپ میری نیت اور میرے عمل کے متعلق ایک افسوسناک غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اس کا تدارک بلا ملاقات ممکن نہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے تعلقات کے پیشِ نظر اب ہماری ملاقات لابد ہو چکی ہے لہٰذا میں اس کے لیے ضرور وقت نکالوں گا۔" [۴]

"ان دنوں کی یاد میں جو بیت چکے ہیں مگر جن کی یاد میرے قلب میں تازہ ہے۔" [۵]

"آپ جانتی ہیں کہ میں آپ سے کوئی بات چھپانا نہیں، ایسا کرنا گناہ سمجھتا ہوں۔" [۶]

"آپ کی خواہشات کا احترام میں نے ہمیشہ ملحوظِ نظر رکھا ہے۔" [۷]

ممنونیت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، آپ کی مسرت ہی میرا صلہ ہے۔" [۸]

یہ اقتباسات منہ بولتی تصویریں ہیں۔ انہیں پڑھ کر اور کچھ تو نہیں لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اقبال اور عطیہ فیضی ایک دوسرے کے بہت قریب تھے اور اس قربت میں کئی طرح کے امکانات پوشیدہ تھے یہ اور بات ہے کہ یہ امکانات صرف امکانات ہی رہے اور حقیقت سے ہم آغوش نہ ہو سکے۔ اس کی ذمہ داری

---

[۱] تا [۸] اقبال نامہ جلد دوم۔ ص۔ ۱۱۶، ۱۳۴، ۱۳۶، ۱۳۹، ۱۴۵، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۸

کمزوری پر عاید ہوتی ہے وثوق اور یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے تاہم چند اقتباسات اور ملاحظہ کیجئے :-

"غزلوں کا مجموعہ جلد شائع کرنے کا آرزو مند ہوں۔ یہ مجموعہ ہندوستان میں طبع ہوگا، جرمنی میں جلد بندھے گی اور ایک "ہندوستانی خاتون" کے نام سے فخر انتساب حاصل کرے گا۔"

(۱۳ر جنوری ۱۹۰۹ء)

یہاں اقبال نے خاتون کو quality کیا ہے اسے مدِنظر رکھیئے۔

"لیکن مجھ میں اب شاعری کے لیے کوئی ولولہ باقی نہیں رہا۔ ایسا محسوس کرتا ہوں کسی نے میری شاعری کا گلا گھونٹ دیا ہے اور میں محروم تخیل کر دیا گیا ہوں۔" (۷ر اپریل ۱۹۱۰ء)۔

—— یہ کون تھا جس نے اقبال کی شاعری کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اس کی وضاحت ایک اور خط میں کر دی ہے یہاں لگتا ہے کہ اقبال کا قلم ضبط و احتیاط کی پابندیوں کے خلاف کم از کم ایک بار بغاوت کر گیا ہے :-

"ابھی چند روز ہوئے مجھے ایک اطالوی شہزادی کا خط آیا تھا جس میں اس نے میری چند نظمیں معہ انگریزی ترجمہ کے طلب کی تھیں لیکن شاعری کے لیے میرے دل میں کوئی ولولہ موجود نہیں اور اس کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔"[1]

—— اس کے بعد اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ معاملہ بالکل واضح ہے۔ اقبال کے ایک قریبی دوست مولانا گرامی نے ان کے بارے میں کہا ہے ع۔ پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

بھلے ہی اقبال کو پیغمبر نہ کہا گیا ہو لیکن اقبال پرستوں کے ایک گروہ نے ان کے ساتھ جس طرح کا پیغمبرانہ تقشف وابستہ کر دیا ہے اس نے اقبال کی شخصیت کے کچھ انسانی پہلوؤں پر ایسے دبیز پردے ڈال رکھے ہیں کہ ان کی شخصیت کا مکمل عرفان قریب قریب ناممکن سا بن گیا ہے اور یہ پردے اٹھاتے ہوئے لہجے میں خواہ مخواہ اعتذار کا رنگ اور دلائل و براہین میں دفاعی انداز پیدا ہو جاتا ہے۔

جن دنوں اقبال حصول تعلیم کے سلسلے میں یورپ میں تھے تو ہائڈل برگ جرمنی میں جہاں کچھ وقت کے لیے انہوں نے اپنے تحقیقی مقالے پر کام کیا' ان کا واسطہ کئی اساتذہ سے پڑا۔ ان میں سے دو

---

[1] اقبال نامہ۔ جلد دوم۔ ص ۱۴۱؛

خواتین میں ویگناسٹ اور مس سینئے شل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ اقبال کے ساتھ خاصے دوستانہ تعلقات تھے ویسے بھی ہائیڈل برگ کی یونیورسٹی میں اساتذہ اور طلباء میں آپس میں خاصی بے تکلفی ہوا کرتی تھی۔ اقبال کا قیام ہائیڈل برگ میں اواخر جولائی ۱۹۰۷ء سے اوائل اکتوبر ۱۹۰۷ء تک یعنی تقریباً تین ماہ کا رہا۔ اس دوران میں اقبال جرمن زبان سیکھ رہے تھے اور اس سلسلے میں مس ویگناسٹ اُن کی اُستاد تھیں۔ مس ایما ویگناسٹ کا تذکرہ سب سے پہلے عطیہ فیضی نے اپنی کتاب ——— 'IQBAL'S LETTERS TO ATTIYA BEGUM' میں کیا۔ عطیہ بیگم نے لکھا ہے کہ مس ویگناسٹ ایک خوبصورت اور جوان خاتون تھیں اور حد درجہ ذہین اور قابل اور یہ کہ اقبال اس سے خاصے متاثر تھے اور اسے بہت پسند کرتے تھے۔ عطیہ بیگم فیضی کے نام ایک خط میں اس کے بارے میں اقبال ایک جگہ لکھتے ہیں "میرے پاس آپ کی دوست لڑکی ویگناسٹ کا خط آیا تھا۔ میں اس لڑکی کو بے حد پسند کرتا ہوں وہ کتنی اچھی اور سچی ہے۔" (اقبال از عطیہ بیگم ص ۳۸) اقبال جب اوائل اکتوبر ۱۹۰۷ء میں جرمنی سے لندن واپس آئے تو مس ایما ویگناسٹ سے ان کی مراسلت کا آغاز ہوا۔ اور یہ سلسلہ ۱۹۳۳ء تک جاری رہا۔ ابھی تک مس ویگناسٹ کے نام اقبال کا صرف ایک خط شائع ہوا تھا جو لندن سے ۱۶ نومبر ۱۹۰۷ء کا لکھا ہوا ہے۔ یہ خط ایک پوسٹ کارڈ پر لکھا گیا ہے اور بہت ہی مختصر ہے۔ اس کا عکس فقیر وحید الدین کی کتاب 'اقبال ان پکچرز' میں شائع ہوا۔ روح مکاتیب اقبال میں بھی یہ خط شامل ہے۔ خط کی عبارت اس طرح ہے:

"مجھے آپ کا خط مل گیا ہے لیکن میں ابھی تک جم کر نہیں بیٹھ سکا ہوں، ٹھہر کر لکھوں گا۔"

"دلی نیک تمنائیں۔ اقبال"

اس خط سے بھی اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ ان دونوں کے درمیان مراسلت اور مکاتبت کا سلسلہ تھا لیکن ابھی تک متذکرہ بالا خط کے علاوہ اور کوئی خط دستیاب نہیں ہو سکا تھا لیکن اب مس ویگناسٹ کے نام اقبال کے مزید ۲۶ خط مل چکے ہیں اور اس طرح سے ان مکاتیب کی تعداد ۲۷ ہو جاتی ہے۔ ان میں سے ۱۷ خطوط جرمن زبان میں لکھے گئے ہیں اور باقی دس خط انگریزی میں۔ یہ خطوط اُردو ترجمے کی صورت میں پہلی بار مئی ۱۹۸۳ء کے ماہنامہ افکار کراچی میں شائع ہوئے ہیں۔

ان خطوط کے بارے میں ڈاکٹر سعید اختر درانی نے جنہوں نے ان خطوط کا ترجمہ کرایا اور انہیں افکار میں شائع کرانے کا اہتمام کیا، پس منظر کے طور پر ایک تعارفی نوٹ بھی لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ان خطوط کا کھوج جناب ممتاز حسن مرحوم اور جناب امان اللہ ہوبوہم نے ۱۹۵۹ء کے دورہ جرمنی کے دوران نکالا تھا۔ اس دورے میں اگرچہ ان حضرات کی ملاقات مس ویگے ناست سے نہیں ہو سکی تھی تاہم ممتاز حسن مرحوم نے مس ویگے ناست کے ساتھ خط و کتابت کی جس کے نتیجے میں خاتون موصوفہ نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل یعنی ۱۹۶۰ء کی دہائی کے اوائل میں اپنے نام اقبال کے سارے خطوط پاکستان جرمن فورم کے حوالے کر دیئے لیکن کسی وجہ سے یہ خطوط ابھی تک شائع نہیں ہو سکے۔ ممتاز حسن مرحوم نے اس مجموعہ خطوط کی ایک مکمل فوٹو کاپی امان اللہ ہوبوہم کے سپرد کر دی تھی چناں چہ موجودہ ترجمہ اسی نقل سے کیا گیا ہے۔ امان اللہ ہوبوہم نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ پچھلے بیس برس کے دوران میں ممکن ہے کچھ خطوط کی فوٹو کاپیاں گم ہو گئی ہوں کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ خطوط کی کل تعداد تقریباً چالیس تھی اور اس کے علاوہ کچھ تصاویر بھی تھیں۔ ان خطوط کی اطلاع ڈاکٹر سعید اختر درانی کو ۱۹۶۸ء میں ہوئی۔ چناں چہ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:۔

"ان خطوط کی موجودگی کی اطلاع مجھے پہلے پہل ۱۹۶۸ء میں ہوئی جب میرے ایک کزن کیپٹن (اب کرنل) اسد درانی نے جو جرمنی میں ان دنوں ایک اسٹاف کورس کر رہے تھے، برمنگھم میں ایک ملاقات کے دوران مجھے بتایا کہ جرمنی میں وہ ایک نومسلم جناب ہربرٹ جناب امان اللہ ہوبوہم سے کئی دفعہ مل چکے ہیں جو اس سے پہلے پاکستان جرمن فورم کے ساتھ وابستہ تھے اور اب جرمنی میں آنے والے پاکستانی فوج کے افسروں کے ساتھ کسی سرکاری ادارے (غالباً جرمن زبان کی تعلیم کے لیے) سے وابستہ تھے... کرنل اسد درانی نے مجھے بتایا کہ جناب ہوبوہم کے پاس علامہ اقبال کے چند خطوط موجود ہیں جو انہوں نے اپنی جرمن اُستانی کے نام لکھے تھے۔"[1]

امان اللہ ہوبوہم سے یہ خطوط ڈاکٹر سعید اختر درانی کو ۱۹۸۲ء میں لندن میں ملے اور انہوں نے

---

[1] افکار (کراچی) مئی ۱۹۸۳ء - ص ۱۸+

اپنی جرمن نژاد بیوی اور اپنی بیٹی کی مدد سے ان کی تہذیب و تصحیح کی اور اردو میں ترجمہ کیا۔

اقبال کی جرمن دانی بالکل واجبی تھی! انہوں نے صرف چار پانچ مہینے اس زبان کے سیکھنے میں صرف کئے تھے اور جیسا کہ خطوط سے بھی ظاہر ہے جرمن زبان میں اُن کی استعداد بہت مبتدیانہ تھی اور اس بات کا خود انہیں بھی شدت سے احساس تھا اور اس بات کا اظہار اقبال نے بار بار اپنے اِن خطوط میں کیا ہے جو انہوں نے جرمن زبان میں مس ویگناسٹ کو لکھے ہیں۔ اپنے پہلے ہی خط میں جو انہوں نے میونخ (جرمنی) سے ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو لکھا، اس بات کا افسوس کرتے ہیں کہ زبان کی محدود واقفیت کے باعث وہ اپنے خیالات اور جذبات کا کما حقہٗ اظہار نہیں کر پائے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

"اگر میرے خطوط مختصر ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ میرے پاس لکھنے کو کچھ نہیں ہے بل کہ یہ کہ میرا ذریعہ اظہار ناقص ہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ اپنی ٹوٹی پھوٹی جرمن سے آپ کی طبیعت خراب کروں لیکن یہ رُکاوٹ آپ کے لیے موجود نہیں۔ چناں چہ مجھے آپ سے مکمل اظہار کی اُمید ہے۔"[1]

—— ایک دوسرے خط میں بھی (مؤرخہ ۲ دسمبر ۱۹۰۷ء) جرمن زبان میں اپنی عجز بیانی پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں:

"یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ میں اپنی جرمن بھول گیا ہوں۔ میں بہت مصروف تھا اور زیادہ نہ سیکھ سکا۔ آپ انگریزی کیوں نہیں سیکھ لیتیں۔ میرے لئے آپ کو لکھنا اور اپنے دل کی بات کہنا بہت آسان ہو جائے گا۔"[2]

اسی طرح سے انہوں نے تقریباً ہر اس خط میں جو انہوں نے جرمن زبان میں لکھا ہے اس زبان میں اپنے عجز اظہار کا ذکر کیا ہے اور مس ویگناسٹ کو انگریزی زبان سیکھنے کی ترغیب دی ہے بہرحال ۴ جولائی ۱۹۱۲ء تک اقبال نے انہیں جرمن زبان میں ہی خط لکھے اور اس کے بعد باقی سارے خط انگریزی میں لکھے گئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان خطوط میں وہ عجز بیانی اب باقی نہیں رہی

---

[1]، [2]۔ افکار (کراچی) مئی ۱۹۸۳ء۔ ص۔ ۲۰، ۲۳؎

ہے جس کے اقبال شاکی تھے، چنانچہ یہ خطوط نسبتاً تفصیلی ہیں۔

اقبال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شگفتہ جبین، خوش کلام، بذلہ سنج اور خوش وضع انسان تھے لیکن ان کے بے تکلف دوستوں کا حلقہ بہت ہی محدود تھا۔ عام ملاقاتیوں اور شناساؤں سے بھی اگرچہ وہ بے تکلف ملتے تھے تاہم ایک خاص قسم کا وقار اُن کے اور ملنے والے کے درمیان حجاب اکبر سا بن جاتا تھا۔ ان کی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی صرف کچھ مخصوص دوستوں کے حلقے میں ہی ظاہر ہوتی تھی دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کی افتادِ طبع ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ نہ تو جلدی بے تکلف ہوتے تھے اور نہ کسی کو جلدی دوست بناتے تھے اور نہ ہر ایک بے باکانہ ہنسی مذاق کی باتیں کرتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ دیر آشنا تھے لیکن عطیہ بیگم کی روایت اور خود اقبال کے مکاتیب کے مطالعہ سے جو انہوں نے عطیہ بیگم اور مس ویگناسٹ کے نام لکھے ہیں، یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال ان دو خواتین سے اس قدر متاثر تھے کہ انہیں اپنا دوست اور رفیق شمار کرتے تھے اور اُن کی موجودگی میں اقبال کی شگفتگی طبع بذلہ سنجی کا بھرپور اظہار ہوتا تھا۔ عطیہ بیگم فیضی نے ایسے کئی واقعات نقل کئے ہیں جن سے اس بات میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔

مس ویگناسٹ کے نام خطوط کے مطالعے سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اقبال ویگناسٹ سے بے حد متاثر تھے اور تین چار ماہ کے مختصر عرصے میں ہی دونوں میں ایک خاص طرح کی ذہنی رفاقت پیدا ہو چکی تھی۔ اقبال جب جرمنی سے واپس لندن آتے ہیں تو انہیں مس ویگناسٹ کی جدائی بُری طرح کھلتی ہے اور اپنے ۲ر دسمبر ۱۹۰۷ء کے خط میں لکھتے ہیں:۔ (افکار، کراچی مئی ۱۹۸۳ء ص ۲۳)

"میں زیادہ لکھ یا کہہ نہیں سکتا۔ آپ تصور کر سکتی ہیں کہ میری رُوح میں کیا ہے۔ میری بہت بڑی خواہش یہ ہے کہ میں دوبارہ آپ سے بات کر سکوں اور آپ کو دیکھ سکوں لیکن میں نہیں جانتا کہ کیا کروں جو شخص آپ سے دوستی کر چکا ہو اس کے لیے ممکن نہیں کہ آپ کے بغیر وہ جی سکے۔ براہ کرم میں نے جو لکھا ہے اس کے لیے مجھے معاف فرمائیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس قسم کے اظہارِ جذبات کو پسند نہیں کرتیں۔"

اس خط کا آخری جملہ بھی خاصا معنی خیز ہے اور شکایت کا یہ انداز تعلقات کی گہرائی پر دال ہے:۔

"براہِ کرم جلد لکھئے اور سب کچھ، یہ اچھا نہیں ہے کہ کسی شخص کا کچھ بگاڑا جائے جو آپ کا کچھ نہیں بگاڑتا۔"

مس ویگناسٹ نے اپنی دو تصویریں اقبال کو بھیجیں تو اقبال نے ان الفاظ میں شکریہ ادا کیا:۔

"میں آپ کی تصاویر کے لیے ہزار گونہ شکریہ ادا کرتا ہوں جو کل شام مجھے موصول ہوئیں، یہ آپ کی بڑی کرم فرمائی ہے۔ دونوں تصویریں بڑی خوبصورت ہیں اور وہ ہمیشہ میرے مطالعے کے کمرے میں میری میز پر رہیں گی لیکن یہ مت یاد کیجئے کہ وہ صرف کاغذ ہی پر نقش ہیں بلکہ وہ میرے دل میں بھی محفوظ ہیں اور تا حیات وہیں پر رہیں گی۔" ۱؎

ان خطوط کے مطالعہ سے خاص طور پر ابتدائی دور کے خطوط سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ مس ویگناسٹ کے تئیں اقبال کے جذبات خاصے شدید تھے اور ان کا دل ہمہ وقت مس ویگناسٹ کے خوبصورت خیالات اور ہائیڈل برگ میں اس کی قربت میں گذرے ہوئے لمحات کی یاد سے معمور رہتا تھا چنانچہ ان مکاتیب میں اقبال زبردست قسم کے NOSTALGIA کے شکار نظر آتے ہیں۔ منتشر خطوط سے یہ اقتباسات اس بات کا بیّن ثبوت ہیں:۔

"میں ہمیشہ آپ کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں اور میرا دل ہمیشہ بڑے خوبصورت خیالوں سے معمور رہتا ہے ... ایک شرارے سے ایک شعلہ اٹھتا ہے اور ایک شعلے سے بڑا الاؤ روشن ہو جاتا ہے لیکن آپ تغافل کیش ہیں غفلت شعار ہیں۔ آپ جو جی میں آئے کیجئے، میں بالکل کچھ نہ کہوں گا اور ہمیشہ صابر و شاکر رہوں گا۔" ۲؎

یہ جملے اور ان جملوں کا لب و لہجہ ہمیں مانوس سا لگتا ہے۔ اس لئے کہ یہ غزل کی زبان ہے اور غزل کے عاشق کا لہجہ۔ اب اور اقتباسات دیکھیے:۔

۱؎، ۲؎۔ افکار (کراچی) مئی ۱۹۸۳ء۔ ص ۲۳، ۲۴

"آپ کی تصویر میز پر رکھی ہے اور ہمیشہ مجھے ان سہانے دنوں کی یاد دلاتی ہے جو میں نے آپ کے ساتھ گزارے تھے۔"[1]

"براہ کرم جلد لکھئے اور مجھے بتایئے کہ آپ کیا کر رہی اور سوچ رہی ہیں۔ آپ میرے خط کا انتظار کیوں کرتی ہیں..... یہ میری بہت بڑی تمنا ہے کہ میں ہندوستان لوٹنے سے پہلے آپ سے ملاقات کر سکوں، بے رحم نہ بنئے۔ پلیز جلد خط لکھئے اور تمام احوال بتایئے۔ میرا جسم یہاں ہے میرے خیالات جرمنی میں ہیں۔ آج کل بہار کا موسم ہے، سورج مسکرا رہا ہے لیکن میرا دل غمگین ہے۔ میرے دل غمگین میں آپ کے لیے بڑی خوبصورت سوچیں ہیں۔ اور یہ خاموشی سے ایک کے بعد ایک آپ کی طرف روانہ ہوتی ہیں۔"[2]

اقبال کسی وجہ سے ہندوستان آنے سے پہلے مس ویگے ناسٹ سے نہ مل سکے۔ وہ پیرس ہوتے ہوئے ہندوستان چلے آئے اور اس سلسلے میں ایک خط میں جو انہوں نے سیالکوٹ سے ۳ ستمبر ۱۹۰۸ء کو لکھا، افسوس کا اظہار کیا۔ خط و کتابت کا سلسلہ ہندوستان آکر بھی جاری رہا۔ چنانچہ ۱۱ جنوری ۱۹۰۸ء کو اقبال نے لاہور سے مس ویگے ناسٹ کو جو خط لکھا اس میں علاوہ اور باتوں کے یہ بھی لکھا کہ:-

"براہ کرم اپنے اس دوست کو مت بھولئے جو آپ کو ہمیشہ اپنے دل میں رکھتا ہے اور جو آپ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ہیڈل برگ میں میرا قیام ایک خوبصورت خواب سا لگتا ہے اور میں اس خواب کو دہرانا چاہتا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے؟ آپ خوب جانتی ہیں۔"[3]

اقبال نے بیشتر خطوط میں جرمنی اور خاص طور پر ہیڈل برگ آنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ ان دنوں بھی جب وہ لندن میں تھے اور پھر ہندوستان واپس آکر بھی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران خطوط کے تبادلے کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۴ء کے بعد اقبال کا جو خط ویگے ناسٹ کے

---

[1]، [2]، [3]: افکار۔ کراچی۔ مئی ۱۹۸۳ء۔ ص ۲۵، ۲۵-۲۶، ۲۸

نام ملتا ہے وہ ۱۹۱۹ء کا ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظِ نظر رہے کہ جنگ اگرچہ نومبر ۱۹۱۸ء میں ہی ختم ہوئی تاہم انگلستان اور جرمنی میں صلح نامے پر دستخط ۲۸ جون ۱۹۱۹ء کو ہوئے۔ اس کے بعد اگلا خط ۱۹۳۱ء کا ہے، اور یہ لندن سے لکھا گیا ہے۔ اقبال جب دوسری گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے لندن گئے تو انہیں ویگناست کا پتہ معلوم ہوا اور انہوں نے ویگناست کے نام خط لکھا جس میں اس بات کا ذکر کیا کہ وہ واپسی پر جرمنی آکر ان سے مل لیں گے لیکن کچھ دنوں کے بعد انہیں ویگناست سے معذرت کرنا پڑی کہ اب کی بار وہ جرمنی نہ آسکیں گے۔ اسی طرح جب اقبال ۱۹۳۲ء کے اواخر میں تیسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں ایک بار پھر لندن گئے تو وہاں سے انہوں نے پھر ویگناست کو لکھا وہ جرمنی آکر ان سے مل لیں گے لیکن اس دفعہ بھی حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ وہ باوجود خواہش کے نہ جا سکے، اس دفعہ انہوں نے ٹکٹ بھی خرید رکھے تھے جو انہیں منسوخ کرانے پڑے۔ اس بات کی اطلاع میڈرڈ سپین سے انہوں نے مس ویگناست کو دی۔

"میں جنوبی ہسپانیہ کے دورے کے بعد آج میڈرڈ واپس پہنچا ہوں۔ افسوس کہ میرے لئے اس مرتبہ ہائیڈل برگ آنا ناممکن ہوگا۔ مجھے وہ سارے ٹکٹ منسوخ کرنے پڑے جو میں نے لندن میں خریدے تھے۔"[1]

یہ اقبال کا آخری سفرِ یورپ تھا۔ اس کے بعد اگرچہ انہیں لارڈ لوتھین کی طرف سے آکسفورڈ یونیورسٹی میں RHODES LECTURES دینے کی دعوت ملی تھی جو اقبال نے قبول کی تھی بلکہ اس سلسلے میں لیکچر کے لیے مواد وغیرہ بھی اکٹھا کیا تھا لیکن صحت کی مسلسل خرابی کے باعث وہ یہ لیکچر نہ دے سکے اور اس طرح سے اکتوبر ۱۹۰۷ء کے بعد وہ زبردست خواہش کے باوجود دوبارہ جرمنی جا کر مس ویگناست سے نہ مل سکے۔

ان خطوط میں نہ علمی مباحث ہیں اور نہ فلسفیانہ مسائل نہ مذہبی فکر ہے اور نہ مابعد الطبیعاتی الجھنیں۔ یہ سیدھے سادے اور پیارے خط ہیں جن کے ایک ایک لفظ سے محبت اور خلوص

---

[1] "افکار" کراچی۔ مئی ۱۹۸۳ء۔ ص ۳۶ (مؤرخہ ۲۱ جنوری ۱۹۳۳ء)

ٹپکتا ہے۔ یہ ایسی ہستی کے نام لکھے گئے ہیں جسے اقبال اپنا دوست اور مخلص ہمنوا سمجھتے تھے جس کے ساتھ گزارے ہوئے کچھ وقت کی خوبصورت یادیں وہ آخیر وقت تک اپنے سینے سے لگائے رہے۔ ویگیناسٹ کی ذات میں اقبال نے وہ رفیق، ہمنوا، ہم خیال اور مخلص دوست دیکھا جس کی تمنا ہر انسان کو عموماً اور فن کار کو خصوصاً رہتی ہے۔ اس کی رفاقت کو وہ مغتنمات میں سمجھتے تھے۔ ان کے ساتھ مل کر اقبال نے ہائنے اور گوئٹے کو پڑھا تھا اور ان دنوں کی یاد انہیں بہت دیر تک آتی رہی اور ان بیتے لمحات کا جب بھی ذکر کرتے ہیں تو ان کے لہجے میں کس قدر حسرت ہوتی ہے۔

"مجھے وہ وقت بخوبی یاد ہے جب میں نے گوئٹے کی شاعری آپ کے ساتھ پڑھی اور مجھے امید ہے کہ آپ کو بھی وہ اچھے دن یاد ہوں گے۔ جب ہم روحانی طور سے ایک دوسرے کے اس قدر قریب تھے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم اب بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔" [۱]

"اگلے روز میں ہائنے کا مطالعہ کر رہا تھا اور مجھے وہ پُرمسرت دن یاد آ گئے جب ہائیڈل برگ میں محترمہ پروفیسر صاحبہ کے یہاں ہم دونوں اس کو ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے۔" [۲]

یہ اقتباس ۱۹۱۳ء کے خط سے تھا۔ ۱۹۳۱ء میں بھی یہ یادیں ان کے دل میں تازہ تھیں اور ان یادوں کو تازہ کرنے کے وہ بے حد خواہش مند تھے۔ چنانچہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء کے خط میں لکھتے ہیں:۔

"مجھے اب تک دریائے نیکر یاد ہے جس کے کنارے پر ہم دونوں ایک ساتھ گھوما کرتے تھے... مجھے یہ کہنے کی بالکل ضرورت نہیں کہ میری یہ بڑی آرزو ہے کہ میں پھر آپ سے ملوں اور ان پُرمسرت دنوں کی یادیں تازہ کروں جو افسوس کہ اب ہمیشہ کے لیے گزر چکے ہیں۔" [۳]

ان مکاتیب کے کچھ حصے ایسے ہیں جن سے افسردگی، حرماں اور احساس تنہائی کا اظہار ہوتا

۱، ۲، ۳۔ افکار، کراچی، مئی ۱۹۸۳ء ص۔ ۳۱، ۳۳۔

ہے۔ اور اس معاملے میں مجموعی طور پر ان مکاتیب کی کیفیت بالکل ویسی ہی ہے جیسی کہ عطیہ بیگم فیضی کے نام خطوط کی ہے۔ دونوں میں بڑی مماثلت ہے اور دونوں مکتوب الیہا کے نام خطوط کی بیشتر تعداد تقریباً ایک ہی دَور سے تعلق رکھتی ہے۔ اور دونوں کے نام خطوط میں وہ ہیجان جوش، احساسِ حرمان اور احساسِ تنہائی کا اظہار ہوا ہے جو اقبال کی ذات میں سیل بلا بن کر موجزن تھا۔ مس ویگیناسٹ کے نام خط کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے جس کے ایک ایک لفظ سے حرمان و تنہائی کا احساس چھلکا پڑتا ہے:

"میرے یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں ہے کہ ان تمام برسوں میں میں نے آپ کو کبھی فراموش نہیں کیا اور میرے دل میں ہمیشہ یہ تمنا زندہ رہی ہے کہ میں دوبارہ آپ سے ملوں گا لیکن جیسا کہ بختِ تیرہ کو منظور تھا اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ ان دنوں کی یاد جب ہم گوئٹے کا 'فاوسٹ' ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے ہمیشہ ایک غم انگیز مسرت کے ساتھ میرے دل میں آتی رہتی ہے۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو بتاؤں کہ ان تمام برسوں کے دَوران میں کیا کرتا اور سوچتا رہا ہوں تو سنئے۔ میں نے بہت کچھ لکھا ہے اور وہ تمام چیزیں جو میں نے بطورِ شاعری اور فلسفے کے لکھی ہیں وہ میں نے شایع کر دی ہیں تاہم میرے ذہن نے ہمیشہ ایک کمی سی محسوس کی ہے اور خود کو اپنے ان ہندی گرد و نواح میں تنہا سا پایا ہے۔ جوں جوں میری عمر بڑھ رہی ہے اس تنہائی کا احساس بھی فزوں تر ہوتا جاتا ہے لیکن سوائے تسلیم و رضا کے ہمارے لئے اور کوئی چارہ نہیں اور میں نے بھی پوری تسکینِ دل کے ساتھ اپنی قسمت کو قبول کیا ہے۔"[۱]

یہ خط اس دَور کا نہیں ہے جب اقبال ذہنی طور پر ایک ہیجانی دَور سے گزر رہے تھے اور جو دَورِ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد یورپ سے واپسی پر شروع ہوتا ہے اور تقریباً ۱۹۱۲ء تک جاری رہتا ہے جس دَور میں کبھی وہ خودکشی کی سوچتے ہیں کبھی ہجرت کی اور کبھی شراب سے رجوع کرنے کی۔ یہ خط جنوری ۱۹۳۲ء کا ہے۔ جب اقبال شاعر اور مفکر کی حیثیت سے برِصغیر میں سب سے زیادہ قد آور شخصیت کے

۱۔ افکار، کراچی۔ مئی ۱۹۸۳ء۔ ص ۳۴

طور پر مصروف تھے اور جب ان کی بیشتر کتابیں نظم و نثر کی شائع ہو چکی تھیں اور بحیثیت مجموعی ایک آسودہ حال زندگی گزار رہے تھے۔ اقبال نے اس خط کے لکھنے سے بہت پہلے اپنے احساسِ حرماں کا ترفع کر لیا تھا، گو تنہائی کا نہ صرف احساس ساری زندگی باقی رہا بل کہ فزوں تر ہوتا رہا تاہم اس طرح کے احساسات کی انہوں نے شعوری طور پر تنقیح اور تہذیب کی تھی اور اس طرح سے اپنے احساسِ حرماں اور احساسِ تنہائی میں بھی ایک خاص کیفیت پیدا کی تھی جسے نشاطِ غم انگیز کا نام دیا جا سکتا ہے اس کیفیت میں کسک، تپش، سوز و ساز اور تسکین و اضطراب ایک ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ غالب نے اسی کیفیت کے بارے میں کہا ہے:

مرداں کہ در ہجوم تمنا شود ہلاک ! از رشک فتنہ کہ بدریا شود ہلاک

غم لذتے است خاص کہ طالب ز ذوق آں پنہاں نشاط ورزد و پیدا شود ہلاک

اس کیفیت کے حامل اشعار کی تلاش کلامِ اقبال میں ایک دلچسپ موضوع ہو سکتا ہے اور اس طرح کے اشعار اقبال کی شاعری میں جا بجا نظر آئیں گے جہاں حرماں اور ناکامی ہی کو محبت کا معیار یا خاصہ قرار دیا گیا ہے۔

مرا ز دیدۂ بینا شکایتے دگر است کہ چوں بہ جلوہ درآئی حجابِ من نظر است

اگر نہ بوالہوسی با تو نکتۂ گویم ! کہ عشقِ پختہ تر از نالہ ہائے بے اثر است

بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم غزل سرایم و پیغامِ آشنا گویم

سرمایۂ درد تو غارت نتواں کردن اشکے کہ ز دل خیزد در دیدہ شکستم من

شروع میں اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اقبال ہندوستان کی سیاست اور خاص طور پر مسلمانوں کی سیاست سے دلچسپی رکھتے تھے بل کہ بعد میں عملاً بھی اس سے وابستہ تھے۔ ابتداء میں اقبال سیاست سے بیزار تھے ؎ یہ عقدہ ہائے سیاست تجھے مبارک ہوں

کہ فیضِ عشق سے ناخن مرا ہے سینہ خراش

لیکن بعد میں دوستوں اور عقیدت مندوں کے اصرار پر اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی کی اور سیاسی مسائل اور معاملات میں دلچسپی لینا شروع کی چناں چہ انہوں نے پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے انتخابات میں حصہ لیا اور

منتخب ہوگئے۔ اصل میں ۱۹۲۳ء سے ہی بلکہ اس سے پہلے بھی اقبال پر زور ڈالا جارہا تھا کہ وہ عملی سیاست کے میدان میں آئیں چناں چہ اس سلسلے میں ۲۵ مئی ۱۹۲۳ء کو اقبال نے خان محمد نیاز الدین خان کو لکھا:۔

"مجھ سے بعض لوگ کہہ رہے ہیں کہ لاہور کی نیابت کونسل میں کروں لیکن اور امیدوار بھی ہیں اور میں یہ بات خلافِ انصاف تصور کرتا ہوں کہ اُن سے کہوں کہ تم میری خاطر امیدواری سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ وعدۂ امداد کے لیے شکرگزار رہوں مگر غالباً میں کھڑا نہ ہوں گا۔ ہاں اگر لاہور کے لوگوں نے مجبور کیا تو یہ بوجھ سر پر اٹھانا ہوگا"[1]

ایک مہینے کے بعد انہیں پھر لکھتے ہیں:۔

"شاید آپ نے کسی گزشتہ خط میں مجھ سے کونسل کی امیدواری کے متعلق دریافت کیا تھا، سو عرض ہے کہ لاہور کے مسلمانوں نے مجھ سے بہت کہا مگر میں نے انکار کر دیا لیکن اب تک اُن کا اصرار جاری ہے، تقریباً ہر روز ان کا ایک ایک وفد آجاتا ہے"[2]

اقبال سیاست میں بھی اعلیٰ اخلاقی معیار کے قائل تھے چناں چہ وہ محض اس وجہ سے الیکشن کے جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہتے تھے کہ ان کے ایک دیرینہ دوست سا مقابلے میں تھے اور اس چیز کو خلافِ مروت سمجھتے تھے چناں چہ ۲۰ جولائی ۱۹۲۳ء کو خان محمد نیاز الدین خان ہی کو لکھتے ہیں:۔

"غالباً میں الیکشن کے ہنگامے میں نہ پڑوں گا۔ لاہور کے لوگ مجبور کرتے ہیں اور بہت سے ڈیپوٹیشن ان کے آچکے ہیں مگر میاں عبدالعزیز سے مقابلہ کرنا میں نہیں چاہتا ان سے دیرینہ تعلقات ہیں۔ اگرچہ مقابلے کے بعد انتخاب ہو جانا یقینی ہے تاہم یہ بات میرے نزدیک مروت کے خلاف ہے کہ ایک موہومی دنیوی فائدے کی خاطر دیرینہ تعلقات کو نظر انداز کر دوں"[3]

آخرکار میاں عبدالعزیز نے انتخاب سے دستبرداری کا اعلان کیا جس کے بعد ۲۰ جولائی ۱۹۲۶ء کو اقبال نے اپنی امیدواری کا باقاعدہ اعلان کیا اور اس سلسلے میں ایک بیان بھی دیا اور جوائس روز

---

[1]، [2]، [3]۔ مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان - ص ۲۵، ۲۶، ۴۶

اخباروں میں شائع ہوا جس میں انہوں نے میاں عبدالعزیز کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی اپنا نقطۂ نظر بھی واضح کر دیا۔ ۶ دسمبر ۱۹۲۶ء کو اقبال نے اس انتخاب میں کامیابی حاصل کی۔ یہ انتخاب تین سال کے لیے ہوا تھا اور اس طرح سے اقبال کی عملی سیاست کا آغاز ہوا۔

ہماری جدوجہد آزادی میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک کا زمانہ کئی وجوہات کی بنا پر بڑا اہم رہا ہے۔ اسی زمانے میں کانگریس نے سول نافرمانی اور ستیہ گرہ کی تحریکیں شروع کیں۔ اسی زمانے میں صوبہ سرحد میں خدائی خدمت گاروں کی تنظیم اور پنجاب میں مجلس احرار اسلام کی شروعات ہوئیں۔ گول میز کانفرنس کا انعقاد بھی اسی زمانے میں ہوا اور پارلیمنٹ نے اسی زمانے میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ بھی منظور کیا۔ غرض یہ زمانہ سیاسی طور پر اس لئے بھی اہم ہے کہ اسی زمانے میں جو واقعات درپیش آئے وہ بہت ہی دور رس نتائج کے حامل تھے۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء میں اقبال نے اپنا تاریخ ساز خطبہ پڑھا۔ اس خطبے کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ عام طور اسے تقسیم ہند اور قیام پاکستان کا پیش خیمہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ اقبال نے اس خطبے میں دو قوموں کے نظریے اور ہندوستان کے سیاسی نفاق کا تجزیہ یوں کیا ہے:۔

"تجزیہ بتلاتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف مذاہب اور مختلف جاتیوں میں اس قسم کا کوئی رجحان موجود نہیں کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت کو ترک کر کے ایک وسیع جماعت کی صورت اختیار کر لیں، ہر گروہ اور ہر مجموعہ مضطرب ہے کہ اس کی ہیئت اجتماعیہ قائم رہے لہٰذا اس قسم کا اخلاقی شعور جو رعنائی کے لیے کسی قوم کی تخلیق کے لیے ناگزیر ہے، ایک ایسی عظیم قربانی کا طالب ہے جس کے لیے ہندوستان کی کوئی جماعت تیار نہیں، قومیت ہند کا اتحاد ان تمام جماعتوں کی نفی میں نہیں بلکہ ان کے تعاون و اشتراک اور ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ صحیح تدبر کا تقاضا ہے کہ ہم حقائق کا، خواہ وہ کیسے ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں اعتراف کریں۔ حصول مقاصد کی عملی راہ یہ نہیں ہے کہ ایک ایسی حالت کو فرض کر لیا جائے جو واقعتاً موجود نہ ہو، ہمارا طریق کار یہ ہونا چاہیئے کہ ہم واقعات کی تکذیب کی بجائے

ان سے جہاں تک ہو سکے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ میری رائے میں ہندوستان اور ایشیاء کی قسمت صرف اس بات پر مبنی ہے کہ ہم قومیت ہند کا اتحاد اسی اصول پر قائم کریں۔

"جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مجھے یہ اعلان کرنے میں مطلق تامل نہیں کہ اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائیدار تصفیئے کے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانان ہندوستان کو اپنی روایات و تمدن کے تحت اس ملک میں آزادانہ نشو و نما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ یہ اصول کہ ہر فرد و جماعت اس کی مجاز ہے کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق آزادانہ ترقی کرے کسی تنگ نظر فرقہ واری پر مبنی نہیں۔"

آگے چل کر اسی بنیاد پر اقبال نے وہ تجویز پیش کی جس سے کہ نظریہ پاکستان اخذ کیا گیا ہے:۔

"مغربی جمہوریت کا اصول ہندوستان پر فرقہ واری گروہوں کی اہمیت تسلیم کئے بغیر منطبق کیا جا سکتا۔ اس لئے مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان قائم کیا جائے بالکل حق بجانب ہے۔"

اس کی توضیح کرتے ہوئے اقبال نے کہا:۔

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس کے باہر..... مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔ اسلام اس ملک میں بحیثیت ایک تمدنی قوت کے جب ہی زندہ رہ سکتا ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں مرکزیت قائم کر لے۔"[1]

مختصر یہ کہ اقبال ہندوستان کے مسئلے کو قومی نہیں بل کہ بین الاقوامی مسئلہ سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں چوں کہ بہت سی ملتیں آباد ہیں اس لئے ان میں سے دو بڑی قوموں ہندو

---

[1] ترجمے کے الفاظ سید نذیر نیازی کے ہیں۔ "مضامین اقبال"۔ ص ۱۱۵-۱۱۶۔

اور مسلمان کے لیے جداگانہ حقِ خود ارادیت ضروری ہے۔ محمد علی جناح کے نام جو خط اقبال نے وقتاً فوقتاً لکھے انہیں شائع کراتے ہوئے جناح نے جو دیباچہ لکھا اسے انہوں نے اِن الفاظ پر ختم کیا ہے:-

"اُن کے (اقبال کے) خیالات حقیقی طور پر میرے اپنے خیالات سے ہم آہنگی رکھتے تھے اور بالآخر میں بھی بڑی احتیاط، تجزیے اور ہندوستان کے دستوری مسائل کے مطالعے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا۔ یہ نتیجہ مسلم ہندوستان کے اس اجتماعی ارادے میں وقت پر ظاہر ہوا جو آل انڈیا مسلم لیگ کے لاہور ریزولیشن یا جیسا کہ وہ عام طور پر مشہور ہے پاکستان ریزولیشن میں موجود ہے اور جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو پاس کیا گیا۔"

آخری چار برس اقبال بیمار رہے۔ اس علالت کی تفصیلات کے لیے وہ خطوط قابلِ لحاظ ہیں جو انہوں نے سید نذیر نیازی کو لکھے ہیں اور جو مکتوباتِ اقبال کے عنوان کے تحت خود سید نذیر نیازی نے مرتب کئے ہیں۔ ان خطوط میں علاوہ اور باتوں کے اقبال نے اپنے مختلف عوارض اور علاج کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ ان خطوط میں یہ تفصیل اس لئے دی گئی ہے کہ اقبال حکیم نابینا کے زیرِ علاج تھے، اور چونکہ حکیم صاحب موصوف دہلی میں رہتے تھے اور سید نذیر نیازی ان دنوں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں بحیثیتِ استاد کام کرتے تھے لہٰذا ان کی وساطت سے اقبال اپنی بیماری کا حال حکیم صاحب تک پہنچا دیتے تھے۔ بیماری کے اس طویل اور تکلیف دہ دور میں بھی اقبال برابر اپنے احباب سے سلسلۂ مراسلت جاری رکھے ہوئے تھے۔ گو خطوط کے جوابات میں اب پہلی جیسی مستعدی باقی نہیں رہی تھی۔ اسی زمانے میں ایک اور افتاد پر آ پڑی کہ ان کی آنکھ میں پانی اتر آیا۔ ایک آنکھ بچپن ہی سے خراب تھی چنانچہ اب اُن کے لیے زیادہ لکھنا پڑھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس معذوری کا ذکر کئی خطوط میں ملتا ہے۔ مثلاً ۸۔ نومبر ۱۹۳۵ء کے خط میں لکھتے ہیں:-

"آپ کا خط مل گیا۔ اس سے پہلے بھی ایک خط موصول ہوا تھا۔ مگر افسوس کہ علالت کی وجہ سے خطوط کا جواب لکھنے میں بہت سست ہو گیا ہوں۔" (انوارِ اقبال۔ ص ۱۶)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

"افسوس ضعفِ بصارت کی وجہ سے ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا ہے اس لئے یہ خط میں اپنے ہاتھ سے نہیں لکھ سکا۔ اپنے لڑکے جاوید سے لکھوایا۔ معاف کیجئے گا۔"[1]

آخر میں وہ دوسروں سے بھی خطوط لکھواتے تھے اور انہیں سن کر ان پر دستخط کر دیتے تھے ان تمام خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے اپنی بیماری کو انتہائی صبر و استقلال سے برداشت کیا اور باوجود سخت جسمانی اذیت کے انہوں نے صبر و سکون کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

والٹ وٹمین (WALT WHITMAN) نے شاعرانہ تعلی سے کام لیتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے: "I AM LARGE, I CONTAIN MULTITUDES"

کچھ ایسی ہی کیفیت مکاتیبِ اقبال کی بھی ہے۔ موضوعات کے تنوع نے انہیں وسعت اور ہمہ گیری بخشی ہے اور یہ مکاتیب ان کی پہلودار اور ہمہ گیر شخصیت کا عکس ہیں۔ ان مکاتیب سے جس طرح اقبال کی شخصیت کا کھرا پن ظاہر ہوتا ہے وہ اتنی صفائی کے ساتھ ان کے کلام میں بھی نظر نہیں آتا۔ اور صرف یہی بات ان کے خطوط کی مستقل اہمیت اور افادیت کی ضامن بھی ہے۔

---

[1] انوار اقبال۔ ص ۲۹۴

کلامِ اقبال۔ خطوط کی روشنی میں

"شاعر کے لٹریری اور پرائیویٹ خطوط سے اس کے کلام پر روشنی پڑتی ہے اور اعلیٰ درجے کے شعراء کے خطوط شائع کرنا لٹریری اعتبار سے مفید ہے۔" [۱]

اقبال نے یہ رائے اپنے ایک مکتوب میں ظاہر کی ہے جو ۲۹ مارچ ۱۹۱۹ء کو انہوں نے حاجی محمد احمد خان سیتاپوری کے نام تحریر کیا تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ بات خود کہاں تک اقبال کے کلام اور ان کے خطوط پر صادق آتی ہے۔ اقبال کے مکاتیب جو اب تک شائع ہوئے ہیں، ان میں پرائیویٹ نوعیت کے خطوط کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ البتہ ایسے خطوط کی تعداد کافی ہے، جن میں اقبال نے اپنی تخلیقی کاوشوں کے بارے میں کچھ لکھا ہے یا اپنا شعری نصب العین بیان کیا ہے یا پھر اپنے پر کی گئی تنقید پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ یہ خطوط اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان سے کلامِ اقبال کے مختلف پہلوؤں پر نہ صرف روشنی پڑتی ہے بلکہ کہیں واضح طور پر اور کہیں بین السطور کلامِ اقبال کی تفہیم کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "اقبال کے خطوط کلامِ اقبال کی اچھی شرح ہیں"۔ بات اگرچہ موصوف نے کسی اور سیاق و سباق میں کہی ہے تاہم حقیقت پر مبنی ہے۔

---

[۱] انوارِ اقبال۔ کراچی ۱۹۶۷ء۔ ص ۱۱

اقبالؔ کے مکاتیب سے ان کے نظریہ فن کے متعلق بیش قیمت مواد فراہم کیا جاسکتا ہے۔ اقبالؔ نے قدیم یونان اور جدید مغرب کے تمام فلاسفر کے ساتھ ساتھ ان کے فنی نظریوں کو بھی غور سے پڑھا تھا، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جو نظریہ فن پیش کیا اور اپنایا اس میں زبردست شادابی اور توانائی ملتی ہے اور ان کے ادبی اور تنقیدی نقطہ نظر میں شروع سے آخر تک زندگی، تازگی اور انفرادیت ملتی ہے۔ اقبالؔ اس ادب کے قائل تھے جو زندگی کو سنوارنے میں انسان کا مددگار ہو۔ وہ فن برائے فن کے نظریئے کے مخالف ہیں اور صرف اس آرٹ کو وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں جو انسان کی سوئی ہوئی قوت عمل کو بیدار کرے اور مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا حوصلہ عطا کرے۔ اقبالؔ کے نزدیک بنیادی چیز افادیت ہے۔ فن برائے فن کے پیروکار ادب میں حسن آفرینی پر زور دیتے رہے ہیں اس تحریک کی قیادت فرانس میں فلابیئر اور بودلیئر روس میں پشکن، انگلستان میں والٹر پیٹر اور آسکر وائلڈ اور امریکہ میں ایڈگر ایلن پو کر رہے تھے۔ انیسویں صدی کے وسط میں یورپ کے تمام ادبی حلقوں میں فن برائے فن اور فن برائے زندگی کے مسئلے پر زور و شور سے بحثیں ہو رہی تھیں اور دونوں طرف سے دلائل و براہین پیش کئے جا رہے تھے۔ اس کے بعد کلایو بیل (CLIVE BELL) اور راجر فرائی (ROGER FRY) کے زمانے میں آرٹ برائے آرٹ کی جگہ آرٹ برائے فارم کا نظریہ پیش کیا جانے لگا:۔

"تم جو کچھ کہتے ہو وہ قابل توجہ نہیں جو شے قابل توجہ اور قابل دید ہے وہ یہ کہ تم کس طرح اپنی بات کو ادا کر رہے ہو۔ تمہارا پیغام اچھا ہو یا برا سچا ہو یا جھوٹا، اس سے کوئی سروکار نہیں آرٹ صرف تمہارے طریق اظہار یعنی FORM سے متعلق ہے۔"[1]

اقبالؔ کے نزدیک حسن آفرینی ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے، چناں چہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حسن حسن ہے خواہ اس کے نتائج مفید ہوں خواہ مضر تو خواجہ حافظ دنیا کے بہترین شعراء میں سے ہیں۔"[2]

---

[1] مجلہ اقبالؔ۔ جلد ۷، نمبر ۱-۴، ۵۹-۱۹۵۸ء، ص ۱۵۱ (مضمون اقبالؔ اور آرٹ، فرمان فتحپوری)۔
[2] اقبالؔ نامہ جلد ۱، ص ۵۳۔

یہاں یہ بات ملحوظِ نظر رہنی چاہیئے کہ اپنی ابتدائی شاعری میں (یعنی جو دور ۱۹۰۸ء کے لگ بھگ ختم ہو جاتا ہے) کچھ تو وجودی فکر کے زیرِ اثر اور کچھ فارسی اور اردو شاعری کی روایات کے مطابق وہ اس خیال کے حامی نظر آتے ہیں کہ فطرت کا حسن قائم بالذات اور لائقِ تحسین ہے۔ اسے اقبال حسنِ قدیم اور کبھی حسنِ ازل کہتے ہیں اور حسن سے ایک طرح کی روحانی ہم آہنگی پیدا کر کے اپنے آپ کو اس میں گم کر دینا اپنی شخصیت کی تکمیل اور کمالِ انسانیت سمجھتے ہیں۔ ۱۹۰۸ء تک کی شاعری میں ان کے یہاں اس طرح کے اشعار بہت ملتے ہیں۔ اس ضمن میں خاص طور پر بانگِ درا کی چند نظمیں مثلاً 'سلیمیٰ'، 'جگنو'، 'بچہ اور شمع' قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۰۸ء کے بعد ان کے تصورِ حسن میں بتدریج تبدیلیاں ہوئیں۔ 'حقیقتِ حسن' میں انہوں نے اپنے پرانے تصورِ حسن کو نہ صرف رد کیا بلکہ اسے تضحیک و طنز کا نشانہ بنایا۔

اس کے بعد اقبال کی شاعری اور ان کے ذہنی ارتقا کا وہ دور شروع ہوا جس میں انہوں نے خودی کے حوالے سے ایک نئے فلسفۂ حیات کی تخلیق کی۔ یہ فلسفۂ حیات جیسا کہ پہلے بھی ذکر آیا ہے، قوت و عمل کا فلسفہ ہے۔ پہلی بار یہ فلسفۂ حیات 'اسرارِ خودی' میں پیش ہوتا ہے اور اسی میں انہوں نے ایک باب 'درحقیقتِ شعر و اصلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ' میں اپنے تصورِ فن کو بصراحت بیان کیا اور اپنے فلسفۂ خودی کے مطابق فن اور شعر کے مقصد اور ان کے حدود کا تعین کر دیا۔

اقبال نے فن کے بارے میں بڑی شدت سے اس رائے کا اظہار کیا کہ فن کو بہرحال بامقصد ہونا چاہیئے، اسے زندگی کے اعلیٰ اور ارفع نصب العین کے حصول میں معاون ہونا چاہیئے۔ اسے قوت کا مظہر، خودی کا محافظ اور زندگی کا نقیب ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حافظ کی شاعری کو ناپسند کرتے ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک یہ شاعری زندگی کو بے حقیقت بناتی ہے اور انسان کو جینے کا حوصلہ نہیں دیتی۔ حافظ کے خلاف اقبال کا احتجاج اس لئے زیادہ شدید تھا کہ وہ اسے عجمی تصوف کی فکری ہلاکت آفرینیوں کا نمائندہ اور کامل ترین مظہر تصور کرتے تھے۔ ایک اور خط میں اقبال نے فن برائے فن کے نظریئے پر سختی سے نکتہ چینی کی ہے۔

"مصوّرِ فطرت کو اپنی رنگکار نگار آرائیوں کا اعجاز دکھانے کے لیے رقیبوں کی چشمک سے احتراز واجب ہے، یہ پیش پا افتادہ فقرہ جس سے ہمارے کانوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ کمالِ صنعت اپنی غائت آپ ہے' انفرادی اور اجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ حیلہ ہے جو اسی لئے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکا دے کر چھین لی جائے۔" لہ

اقبال اس بات سے آگاہ تھے کہ ادب و فن میں ذوقِ جمال اور احساسِ جمال بڑی اہمیت رکھتے ہیں، حُسن کے بارے میں اقبال کا تصور ایک جُداگانہ کیفیت کا حامل ہے۔ ان کے نزدیک حسین و جمیل کی نمود بھی 'فرازِ خودی' کی مرہونِ منت ہے۔

جہاں خودی کا بھی ہے صاحبِ فراز و نشیب	یہاں بھی معرکہ آرا ہے خوب سے ناخوب
نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو وہ جمیل	جو ہو نشیب میں پیدا قبیح و نامحبوب

پروفیسر نکلسن کے نام ایک خط میں اپنے فلسفۂ خودی کی تشریح کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:۔

"شخصیت یا مسلسل جدوجہد کی حالت انسان کا سب سے بڑا کمال ہے۔ جو شے شخصیت کو مسلسل جدوجہد کی طرف مائل کرتی ہے' وہ ہمیں بقائے دوام کے حصول میں مدد دیتی ہے۔ لہٰذا وہ اچھی ہے اور جو شے شخصیت کو کمزور کرے وہ بری۔ گویا ہماری شخصیت جملہ اشیائے کائنات کے حسن و قبیح کا معیار ہے۔ مذہب اخلاق اور آرٹ کو اسی معیار پر پرکھنا چاہیے۔"

خودی کی بلندی اور پستی کی صورت میں خوب و ناخوب کا معرکہ اقبال کے تصورِ ادب و فن کے لحاظ سے بے حد اہم ہے۔ یہاں یہ بات ملحوظِ نظر رہنی چاہیے کہ اقبال نے ہمیشہ ادب اور فن کے مقاصد کو اجتماعی نقطۂ نظر سے دیکھا اور اسی نقطۂ نظر سے ان کی اہمیت کا تعین کیا:۔

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن	یہ نکتہ ہے تاریخِ امم جس کی ہے تفصیل

لہ۔ اقبال نامہ۔ جلد ۱۔ ص ۸ ۔ ۱۰۹

وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

اقبال چوں کہ عمل اور جدوجہد کے شاعر ہیں لہٰذا اس ادب اور فن کی مذمت کرتے ہیں جس سے بے عملی کا فروغ ہو، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مختلف مواقع پر انداز اور اسلوب بدل بدل کر فن کے حیات بخش اور حیات پرور کردار پر زور دیا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں اقبال نے کابل کی ایک ادبی انجمن میں جن خیالات کا اظہار کیا ان کی روشنی میں اقبال کے مخصوص نظریۂ شعر کی تفہیم کا مسئلہ آسان ہو جاتا ہے:۔

"میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا شاعری یا مصوری یا موسیقی یا معماری ان میں سے ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمت گزار ہے۔ اسی بناء پر میں آرٹ کو ایجاد و اختراع سمجھتا ہوں، نہ کہ محض آلۂ تفریح۔ شاعر قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد بھی کر سکتا ہے اور برباد بھی۔ شعراء پر لازم ہے کہ وہ نوجوان قوم کے سچے راہنما بنیں۔ زندگی کی عظمت اور بزرگی کی بجائے موت کو زیادہ بڑھا کر نہ دکھائیں، چوں کہ جب آرٹ موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کو بڑھا چڑھا کر دکھاتا ہے اس وقت وہ سخت خوفناک اور برباد کن ہو جاتا ہے اور حسن قوت سے خالی ہو وہ محض پیام موت ہے۔

دلبری بے قاہری جادوگری است دلبری با قاہری پیغمبری است"[1]

اقبال کے نزدیک فن کا مقصد زندگی کو خوشگوار بنانا ہے اور اس کی محرومیوں، تلخیوں اور ناکامیوں کو روشنی میں بدل دینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال چاہتے ہیں کہ فن کار افکار و تخیل کی گدائی کے بجائے مقاصدِ حیات کو بنیادی اہمیت دے جو فن کی نوعیت، افادیت اور معیار کو جانچنے کی کسوٹی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"تمام انسانی سرگرمیوں کا انتہائی مقصد زندگی ہے۔ پُرشوکت، پُرقوت، مالا مال زندگی، تمام انسانی آرٹ کے پیشِ نظر یہی مقصد ہونا چاہیئے اور ہر چیز کی قدر اس کی حیات بخش قابلیت کے مطابق مقرر کی جانی چاہیئے۔ بلند ترین آرٹ وہ ہے جو

---

[1] مضامین اقبال۔ مرتبہ تصدق حسین تاج۔ ص ۲۰۲۔

ہماری سوئی ہوئی قوتِ ارادہ کو بیدار کرے اور جو زندگی کے امتحانات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ہم میں قوت پیدا کرے۔ ہر وہ چیز جو نیند لاتی ہے، جو ہماری آنکھیں بند کر دیتی ہے اور ہمیں آس پاس کی چیزیں دیکھنے نہیں دیتی جس کو قابو میں لانے ہی پر زندگی کا انحصار ہے، زوال اور موت کا پیغام ہے۔ آرٹ کی خاطر آرٹ کا واہمہ متنزل ادبار کی ایک عیارانہ ایجاد ہے جو زندگی اور قوت کی طرف سے بہکا کر ہمیں دوسری جانب لے جاتی ہے۔" ؎

'ادب برائے ادب' کے نظریے کی مخالفت کوئی نئی بات نہیں تھی، اقبال سے پہلے سرسید احمد خان اور اُن کی تحریک سے وابستہ ادیب اور شاعر بالخصوص مولانا حالی نے بے مقصد ادب سے بیزاری کا اظہار کیا تھا بلکہ ہمعصر ادبی رجحانات پر تنقید بھی کی۔ سرسید اس حقیقت کو پا چکے تھے کہ اعلیٰ ملی مقاصد اور قومی مفادات کے حصول میں ادب کو ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ حالی نے اپنے مقدمہ شعر و شاعری میں انہی خیالات کو ادبی اصولوں کا درجہ دیا اور متغیر حالات میں نئے ادب کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کی۔ حالی نے اس بات پر خاصا زور دیا کہ ادب کے ذریعے قومی سطح پر اعلیٰ تر اخلاق کی ترویج سے قومی فلاح اور ملی بہبود کا کام لیا جا سکتا ہے۔ حالی اور شبلی نے سوانح نگاری کے لیے بھی ایسی ہی شخصیتوں کا انتخاب کیا جو کسی نہ کسی لحاظ سے مسلمانوں کے لیے روشن مثال بننے کی اہلیت رکھتی تھیں لیکن بایں ہمہ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ اقبال نے جس شدت سے شاعری میں موضوع کی اہمیت کو جتلایا اور شاعری کے لیے حیات بخشی کو لازمی قرار دیا، اس سے پہلے اتنی شدت سے یہ باتیں نہیں کہی گئیں تھیں۔

اقبال ادب کو ایک حرکی عمل سمجھتے ہیں۔ ایسا عمل جو مردہ اور بے عمل قوم میں زندگی کی لہر پیدا کرے اور جس ادب میں وہ اس طرح کی صفت نہیں پاتے تھے، اسے بے کار اور قابلِ اصلاح سمجھتے ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

میرا تو یہی عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا لٹریچر تمام ممالک اسلامیہ میں قابلِ اصلاح ہے۔

؎ بحوالہ اقبال کی شاعری میں آرٹ کا تصور۔ شیخ اکبر علی مشمولہ اقبالیات کے نقوش۔ ص ۵۴۵۔

PESSIMISTIC LITERATURE کبھی زندہ نہیں رہ سکا۔ قوم کی زندگی کے لیے اس کا اور اس کے لٹریچر کا OPTIMISTIC ہونا ضروری ہے۔"[۱]

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جدید تنقید PESSIMISTIC LITERATURE والے نظریئے کو اب قبول نہیں کرتی۔ چناں چہ سارتر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "افسردہ ادب قسم کی کوئی شے نہیں کیوں کہ زندگی کی خواہ کتنے ہی سیاہ رنگوں سے تصویر کشی کیوں نہ کی جائے، یہ تصویر کشی صرف اسی مقصد کی خاطر ہوتی ہے کہ آزاد انسان اس سے روشناسی میں اپنی آزادی محسوس کر سکے۔"[۲] دراصل اقبال نے اپنے ادب کے حوالے سے ان عصری رجحانات پر نکتہ چینی کی تھی جو فرانس کے زوال پسند ادیبوں کی خصوصیت سمجھے جاتے ہیں اور جو رجحانات اس وقت مغربی دنیا میں بڑی تیزی کے ساتھ مقبولیت حاصل کر رہے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں جب اقبال کو سر کا خطاب ملا۔ تو اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ کی طرف سے دیئے گئے ایک عصرانے میں تقریر کرتے ہوئے اقبال نے کہا کہ قوموں کے اخلاق کو پستی کی طرف لے جانے والی چیزوں میں نہایت خطرناک بل کہ مہلک چیز وہ نظریہ ہے جسے "فن برائے فن" کہتے ہیں۔ اس نظریئے سے مراد یہ ہے کہ جمالیات کا ہر شعبہ صرف اپنے اصولوں کو ہی اپنا معیارِ صحت اور نصب العین مقرر کرے۔ اپنے ان اصولوں سے ہر کوئی اصول (مثلاً اخلاقیات یا روحانیات کا کوئی اصول) اس فن کی رہبری کا حقدار نہ ہو۔ وہ فن خود اپنا راہبر ہو۔ اس کی ترویج یا تربیت یا اس کا ارتقا کسی فوق الفن اصول کے تحت نہ ہو وغیرہ۔ مختصر یہ کہ حسن خود اپنا معیار ہے اور اپنے سے بالاتر کسی معیار یا مدعا یا نصب العین کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ یہ نظریہ آج کل مغربی دنیا میں بہت مقبول ہے اور اس کی مقبولیت کی رفتار اگر اسی طرح تیز رہی تو مجھے یقین ہے کہ وہ ان اقوام کو گرا کر رہے گا۔ میں نے اپنے کلام میں اس مہلک نظریہ کے خلاف جہاد کیا ہے۔"[۳] اقبال نے ایک خط میں بے خودی کی دو اقسام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ایک وہ جو LYRIC POETRY کے پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس قسم سے

---

[۱] اقبال نامہ۔ جلد ۲۔ ص ۵۶؛ [۲] WHAT IS LITERATURE? ص ۲۲۵

[۳] اقبال۔ "چند جواہر ریزے" از پروفیسر خواجہ عبدالحمید۔ معارف اعظم گڑھ ۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء ص ۲۶۶

ہے جو افیون و شراب کا نتیجہ ہے۔"[۱]

اس کے ساتھ ہی سراج الدین پال کے نام ایک خط سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:۔

"یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو پھر اس قوم کا نکتہ نگاہ بدل جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی اور کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع للبقاء میں ہو چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کی ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔"[۲]

یہی خیالات انہوں نے مہاراجہ سرکشن پرشاد کے نام ایک خط میں اس طرح سے ظاہر کئے ہیں:۔

"..... خواجہ حافظ کی شاعری کا میں معترف ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ایسا شاعر ایشیا میں آج تک پیدا نہیں ہوا اور غالباً پیدا بھی نہیں ہوگا لیکن جس کیفیت کو وہ پڑھنے والے کے دل پر پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ کیفیت قوائے حیات کو کمزور و ناتوان کرنے والی ہے۔ میں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کی گذشتہ دماغی تاریخ اور موجودہ حالت پر بہت غور کیا ہے جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ ان دونوں قوموں کے طلبا کو اپنے اپنے مریض کا اصلی مرض اب تک معلوم نہیں ہو سکا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ان کا اصلی مرض قوائے حیات کی ناتوانی اور ضعف ہے اور یہ ضعف زیادہ تر ایک خاص قسم کے لٹریچر کا نتیجہ ہے جو ایشیا کی بعض قوموں کی بدنصیبی سے ان میں پیدا ہو گیا جس نقطۂ خیال سے یہ قومیں زندگی پر نگاہ ڈالتی ہیں وہ نقطۂ خیال صدیوں سے مضعف مگر حسین و جمیل ادبیات سے محکم ہو چکا ہے۔ اور اب حالات حاضرہ اس امر کے مقتضی ہیں کہ نقطۂ خیال میں

---

[۱] "اقبال۔ چند جواہر ریزے"۔ پروفیسر خواجہ عبدالحمید۔ معارف اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۳۸ء۔ ص ۲۶۰۔

[۲] اقبال نامہ۔ جلد ۱۔ ص ۴۴۔ ۴۵۔

اصلاح کی جائے۔"[1]

اقبال ہر اس چیز کے مخالف ہیں جو کسی قوم میں قوتِ حیات میں اضافے کی بجائے اس میں پست ہمتی پیدا کر کے مصافِ زیست میں اس کی ناکامی کا باعث ہو۔ تصوف کو بہ حالتِ موجودہ مسلمانوں کے لیے مضر سمجھتے ہیں اور اسے مسترد کرتے ہیں۔ خاص طور پر اس نام نہاد متصوفانہ شاعری کی وہ شدت سے مخالفت کرتا ہے جو ترکِ دنیا کی تعلیم دیتے ہوئے ناتوانی کو حسین و جمیل بنا کر پیش کرتا ہے، حافظ کو اس کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔

"...... جو کیفیت خواجہ حافظ اپنے ریڈر کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں، وہ قوتِ حیات کو ضعیف و ناتوان کرنے والی ہے۔"[2]

—— اقبال اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ فن جیسا بھی ہو، اچھا ہو یا برا، صحت مند یا مہلک، بہر صورت افراد کی انفرادی زندگی پر ہی نہیں بلکہ قوم و ملت کی اجتماعی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں :-

"آرٹ اقوامِ عالم کی زندگی کا عکس ہے، کسی قوم کے آرٹ کو دیکھ کر اس قوم کی نفسیاتی کیفیتوں کا صحیح نقشہ کھینچا جا سکتا ہے۔"[3]

—— اور یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک ایک فن کار کا فرضِ منصبی یہ ہے کہ وہ اپنے آرٹ کو صحیح طور پر استعمال کرے، وہ کہتے ہیں :-

"آرٹ زندگی کا مظہر ہی نہیں، زندگی کا آلہ کار بھی ہے اور سچا آرٹسٹ وہ ہے جو اپنے کمال کو بنی نوعِ انسان کی بہتری کے لیے وقف کر دے۔"[4]

زندگی اور آرٹ کے اس رشتہ میں اقبال نے زندگی کو جو بلند مقام دیا ہے اس کا احساس ان کے تصورِ حیات و کائنات کی بنیاد بھی ہے اور ان کے نظریہ فن کا مرکزی نقطہ بھی۔ دوسرے لفظوں میں اقبال

---

[1]، [2] "اقبال کے چند غیر مطبوعہ اور نایاب خطوط" - ادبی دنیا۔ اقبال نمبر ۱۹۷۱ء (خط مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۱۶ء)

[3] - نظریاتِ اقبال - کلیم نشتر - مکتبہ عالیہ لاہور، ص ۱۲۲

[4] - نظریاتِ اقبال - کلیم نشتر - مکتبہ عالیہ لاہور، ص ۱۲۲

فن کو زندگی تغیر سمجھتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک فن کار کے فن میں اگر زندگی کی تڑپ پیدا کرنے کی خوبی نہیں ہے اور یہ خواب آوری کا سامان بن جاتی ہے تو ایسے فن کار کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ فن کا مظاہرہ ہی نہ کرے جس طرح بعض عناصر فن یا ہنر کو فروغ دینے کا باعث بنتے ہیں۔ اسی طرح بعض اس کو تباہ کاری کی طرف لے جاتے ہیں، غلامانہ ذہنیت اور نقالی کو اقبال فن کی ترقی میں ایک بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں غلام فن کار کا ہنر اور فن زندگی کی عظمتوں سے ناآشنا ہوتا ہے اور اس کا بیمار تخیل انسان کو ناتوان اور مریض بنا دیتا ہے اور بحیثیت مجموعی اسے زندگی سے بیزار کر دیتا ہے اقبال کہتے ہیں:۔

"اعلیٰ ترین فن وہ ہے جو ہماری جبلی قوتِ ارادی کو بیدار کرے اور ہمیں مصافِ زندگی میں مردانگی سے مقابلہ کرنے کی طاقت بخشے۔ تمام خواب آور اثرات جو حقیقت (REALITY) سے گریز کرنے کی تعلیم دیں۔ فی نفسہٖ ایک پیغام انحطاط و ممات ہیں۔ ادبیات کو دنیائے افیون خوردہ کے نقوش سے مبرا ہونا چاہیئے۔ فن برائے فن کا اصول زمانۂ تنزل کی ایجاد ہے جس کا مقصد ہمیں ذوقِ حیات اور جذبۂ عمل سے محروم کر دینا ہے۔" [۱]

____ فن اور زندگی کے باہمی تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے اقبال ایسے فن کو جو زندگی کے لیے کسی بھی صورت میں ضرر رساں ہو قابل مذمت قرار دیتے ہیں:۔

"آرٹ جو زندگی کے لیے مفید ہو اچھا اور جائز ہے جو زندگی کے خلاف ہو یعنی جس سے ہمتیں پست ہوں اور جذبات عالیہ مردہ ہوں وہ قابلِ نفرت ہے۔ اس کی ترویج حکومت کی طرف سے ممنوع قرار دی جانی چاہیئے۔" [۲]

غرض اقبال کے نزدیک شاعری ایک مخصوص مقصد کے حصول کا ذریعہ تھی مقصود بالذات نہیں تھی۔ اس لئے بعض اوقات انہوں نے شعر کے فنی لوازم کو اس قدر درخورِ اعتنا نہیں سمجھا کہ انہیں اپنے مقصد کے اظہار و ابلاغ میں رکاوٹ پیدا کرنے دیتے۔ چناں چہ خطوط میں بعض ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جن

۱۔ نظریاتِ اقبال ۔ کلیم نشتر ۔ مکتبۂ عالیہ، لاہور، ص ۱۲۳؛

۲۔ ملفوظاتِ اقبال ۔ "یادِ ایام" ۔ بروایتِ خواجہ عبدالرحیم ۔ ص ۱۷۸ ۔ ۱۷۹؛

میں اقبالؔ "زبان دان شاعروں" کے مقابلے میں اپنے آپ کو ممتاز رکھنا چاہتے ہیں۔ شوکت حسین کو لکھتے ہیں :۔

"شعر محاورہ اور بندش کی درستی اور چستی ہی کا نام نہیں۔ میرا ادبی نصب العین نقاد کے ادبی نصب العین سے مختلف ہے۔ میرے کلام میں شعریت ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور میری ہرگز یہ خواہش نہیں کہ اس زمانے کے شعرا میں میرا شمار ہو۔"[۱]

غالباً اسی اندازِ نظر کے باعث وہ بعض اوقات کسی نظم کی خامیوں کے احساس کے باوجود بھی اسے دُور کرنے میں تساہل اور لاپروائی سے کام لیتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"نظم انتقام سے بَری نہیں لیکن اب اس طرف توجہ کے لیے فرصت کہاں۔ ایک پرانی نظم کو آراستہ کرنے سے ایک نئی نظم تیار کرنا مقابلتاً آسان ہے۔"[۲]

سید سلیمان ندوی کے نام کئی خطوط میں بھی اسی طرح کا اندازِ نظر ظاہر ہوتا ہے :

"قوافی کے متعلق جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا بالکل بجا ہے مگر چوں کہ شاعری اس مثنوی سے مقصود نہ تھی اس واسطے میں نے بعض باتوں میں عمداً تساہل برتا۔"[۳]

"کلام کا بہت سا حصہ نظرِ ثانی کا محتاج ہے لیکن اور مشاغل اتنی فرصت نہیں چھوڑتے کہ ادھر توجہ کر سکوں۔ تاہم جو کچھ ممکن ہے کرتا ہوں۔"[۴]

عمداً تساہل برتنے کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ تھی کہ اقبالؔ کے نزدیک ان کے افکار ہی بنیادی اہمیت رکھتے تھے۔ جن کی ترسیل کے لیے انہوں نے شاعری کو استعمال کیا۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر انہوں نے اپنے ایک مکتوب بنام سید سلیمان ندوی میں شاعری کو اپنے لئے تہمت قرار دیا۔ لکھتے ہیں :۔

"میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں

۱، ۲۔ اقبال نامہ۔ جلد ۲، ص ۲۵۴۔ ۲۵۵؎

۳، ۴۔ اقبال نامہ۔ جلد ۱۔ ص ۸۵۔ ۸۶، ۱۰۸؎

بعض مقاصدِ خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رُو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کیا ہے ورنہ

"نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست — کہ برمن تہمت شعر و سخن بست" [1]

اسی طرح کے خیالات کا اظہار انہوں نے ۱۹۲۱ء کے ایک خط میں عشرت رحمانی کے نام کیا ہے لکھتے ہیں:-

"آپ کا حسنِ ظن میری نسبت بہت بڑھ گیا ہے، حقیقت میں میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی نسبت دنیائے شاعری سے کچھ بھی نہیں اور نہ کبھی میں نے SERIOUSLY اس طرف توجہ کی ہے۔" [2]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

"میرا ادبی نصب العین نقاد کے نصب العین سے مختلف ہے۔ میرے کلام میں شعریت ایک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔" [3]

اِن بیانات کے باوصف یہ بات اپنی جگہ نہ صرف دلچسپ ہے بل کہ بڑی اہم بھی ہے کہ وہ ساری عمر شاعری کرتے رہے۔ اس طرح کے بیانات کی کیا وجوہات تھیں اور ان کی کیا توجیہ کی جائے اُس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔ یہاں جس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اقبال ایک پیام پیش کر رہے تھے اور اسی لئے وہ بار بار کوشش کرتے ہیں کہ لوگ ان کی شاعری کو نہ دیکھیں بل کہ اس شاعری کے ذریعہ سے جو بات کہی گئی ہے اس کی طرف توجہ دیں۔ یہ نہ دیکھیں کہ بات کیسے کہی گئی ہے بل کہ یہ دیکھیں کہ بات کیا کہی گئی ہے اور جب وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ کچھ لوگ اب بھی اُن کے پیام سے صرفِ نظر کر کے محض ان کی شاعری پر ہی اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں تو میر امم کو اس بات کی دہائی دیتے ہیں اور اُن سے شکایت کرتے ہیں:-

من اے میرِ امم داد از تو خواہم — مرا یاراں غزل خوانے شمردند

۱، ۲۔ اقبال نامہ، جلد اول۔ ص ۱۹۵؛ ۳۔ اقبال نامہ، حصہ دوم، ص۔ ۲۳؛

یہاں اس بات کا اظہار بھی مناسب بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کلام اقبال کے غایر مطالعے سے یہ دلچسپ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ اقبال نے ہر ممکن طریقے سے اپنے کلام کی تزئین کی ہے۔ یہ جو انہوں نے کہا ہے کہ :-

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرم راز درونِ مے خانہ

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری — وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

تو یہ باتیں انہوں نے از راہ انکسار کہی ہیں۔ ان سے یہ نتیجہ اخذ کرنا وہ فی الواقعہ رموزِ شاعری سے باخبر نہ تھے یا یہ کہ انہوں نے الفاظ و تراکیب کے استعمال میں تساہل برتا ہے اور ایک مقصد کی وجہ سے اپنے فن کو اہمیت نہیں دی ہے تو یہ درست نہ ہوگا۔ اقبال جیسے قادر الکلام اور رموزِ فن سے آگاہ شاعر کم از کم اردو شاعری میں انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اقبال کے یہاں تخلیقِ فن کا جیسا مکمل ادراک و شعور ملتا ہے ان کے ہمعصروں میں کم از کم یہ بات ہمیں نظر نہیں آتی، ان کا لسانی تصور نہ صرف انفرادی حیثیت کا حامل ہے بلکہ اقبال کو اس دائرے میں اجتہاد کا حوصلہ بھی تھا۔ وہ لاکھ کہیں کہ شاعری سے ان کی "غرض زباندانی کا اظہار نہیں" اور "حقیقت میں فن شاعری اس قدر دقیق اور مشکل ہے کہ ایک عمر میں بھی انسان اس پر حاوی نہیں ہو سکتا" لیکن ایک ماہرِ فن صناع کی طرح وہ شاعری کے تمام اوزاروں کے استعمال سے واقف تھے اور ان اوزاروں کی مدد سے انوکھے اور تازہ کار پیکر تراشنے پر قادر تھے۔ سید عابد علی عابد جنہوں نے اس نقطۂ نظر سے کلامِ اقبال کا مطالعہ کیا ہے[۱]، اس قسم کی بے شمار مثالیں پیش کی ہیں۔ سید عابد علی عابد لکھتے ہیں :-

"صنائع لفظی و معنوی آج کل کچھ ایسی ہو گئی ہیں کہ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ اقبال ابلاغ و اظہار مطالب کے لیے انہیں بہت چابکدستی اور ہنرمندی سے استعمال کرتے ہیں تو اکثر

۱۔ پروفیسر مسعود حسین خان کی کتاب "اقبال کی نظری و عملی شعریات" بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جس میں پروفیسر صاحب موصوف نے اقبال کے فن کے عناصر اور زبان و بیان کے مختلف پہلوؤں کا بڑی دقتِ نظر اور تجزیاتی انداز میں مطالعہ کیا ہے۔ یہ کتاب اسی سال یعنی ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی ہے۔

پڑھنے والے تعجب کا اظہار کریں گے۔"[۱]

"اقبال کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے صنائع لفظی و معنوی سے اس طرح کام لیا ہے کہ پڑھنے والے کی توجہ مطالب و مفہوم کی طرف رہتی ہے ..... اقبال کے کلام میں کم و بیش تمام صنائع معنوی بڑی ہنرمندی اور چابکدستی سے استعمال ہوئی ہیں لیکن تضاد، تلمیح مراعات النظیر، حسن تعلیل ایہام، تضاد اور ایہام تناسب سے انہوں نے زیادہ کام لیا ہے کہ ان کی مدد سے معانی کی تمام دلالتیں روشن ہو جاتی ہیں۔"[۲]

بایں ہمہ اہم بات یہ ہے کہ اقبال کے یہاں ان صنعتوں کا استعمال معانی کی تمام دلالتوں کو روشن اور واضح کرنے کے لیے ہی ہوا ہے لیکن ساتھ ہی اقبال کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ ذریعہ اظہار لفظ ہوں یا سنگ، رنگ ہو یا صوت، بہر حال خون جگر کے بغیر چارہ نہیں:

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اقبال دراصل اُن شعراء میں سے ہیں جو نہ صرف اپنے مطالب معانی کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت اور مقام کے حامل ہیں بلکہ جو اپنے کلام کی ادبی اور فنکارانہ خوبیوں کی وجہ سے بھی جاذب توجہ ہوتے ہیں اور ان کے اس بیان کے باوصف کہ "فنِ شاعری مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔"[۳] وہ نہ صرف اس فن سے بخوبی واقف تھے اور اس پر مکمل طور پر حاوی تھے بلکہ اس کے حصول پر انہوں نے کافی وقت صرف کیا تھا، اس کا اندازہ اُن کی ابتدائی دور کی شاعری سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جس میں ابھی وہ اس مقصد کی تلاش میں ہی تھے جو بعد میں ان کی شاعری پر حاوی ہو گیا اور جس مقصد کی اشاعت اور جس کے ابلاغ کے لیے انہوں نے "اس ملک کے حالات و روایات کی رُو سے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا۔"[۴]

اس کے باوجود اقبال نے ایسی شاعری کی شدید مذمت کی ہے جو محض فنِ شاعری کے لوازمات کا مظاہر کرے اور زندگی کے حقائق سے دور رہتی ہو۔ محض تخیل کی کرشمہ سازی اور الفاظ

---

[۱]، [۲]۔ شعرِ اقبال ـ عابد علی عابد ـ ص ۵۵۷، ۵۶۸؛ [۳]، [۴]۔ اقبال نامہ ـ جلد اوّل ـ ص ۱۹۵؛

کی سلوری کو اقبال نے عجمیت کا نام دیا ہے۔ ضرب کلیم میں "شعر عجم" کے عنوان سے عجمی لَے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دلآویز — اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں — بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز
وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے — جس سے متزلزل نہ ہوئی دولتِ پرویز

اقبال باضابطہ ادب کے نقاد نہیں تھے انھوں نے محض اپنے تخلیقی وجدان اور شاعرانہ ذوق کی روشنی میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور ان تاثرات اور تنقیدات کا جائزہ لے کر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اُن کے خمیر میں مشرقی شعری روایات کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں لیکن انھوں نے ان روایات کو اس طرح برتا کہ جدید و قدیم کا امتیاز ہی اُٹھ گیا اور دیکھا جائے تو اسی میں اقبال کی عظمت کا راز مضمر ہے۔

یہاں اقبال کے تنقیدی نظریات کا جائزہ لینا باعث دلچسپی ہوگا۔ یہ نظریات ان کے مکاتیب میں بکھرے پڑے ہیں اور یہاں ان میں سے چند ایک کے جائزے پر ہی اکتفا کی جاتی ہے۔

ڈاکٹر محمد عباس علی خان لمعہ کے نام ایک خط سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اقبال کے زمانے میں شاعری میں جدید اور قدیم کی بحث شروع ہو چکی تھی کیوں کہ اقبال لکھتے ہیں:۔

"قدیم شاعری اور جدید شاعری کا سوال بھی سرمایۂ ادب کا ایک سبجیکٹ ہو گیا ہے۔ میں فقط فرسودہ مضامین کی حد تک جدید و قدیم کی بحث کو مانتا ہوں۔ شاعری کی جان تو شاعر کے جذبات ہیں۔ جذباتِ انسانی اور کیفیاتِ قلبی اللہ کی دین ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ طبع موزوں اس کے ادا کرنے کے لیے پُراثر الفاظ کی تلاش کرے۔" [1]

یہاں اقبال غالب کے ہم خیال معلوم ہوتے ہیں جو کہتے ہیں۔ ع

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

---

[1] اقبال نامہ، جلد اوّل، ص ۲۸۰+

——اور اس کے علاوہ صوفیوں کی طرح اس بات کے قائل معلوم ہوتے ہیں کہ قلب ہی شاعری کا مرکز ہے۔ اقبال در اصل اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے شاعرانہ جذب اور تخلیقی عمل کو الہام کی طرح محسوس کیا تھا۔ اس بات کی شہادت موجود ہے کہ اقبال نے کئی موقعوں پر اپنی گفتگو میں بھی اس بات پر زور دیا تھا کہ انہیں ایک خاص طرح کی کیفیت طاری ہو جانے پر اشعار کی آمد ہوتی تھی اور اسی عالم کیف میں وہ محو تخلیق ہوتے۔ تنقیدی لحاظ سے اگر اس نظریے کو پرکھنا چاہیں تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہ نظریہ اقبال سے پہلے بھی رائج رہا ہے اور خود افلاطون نے بھی یہ نظریہ پیش کیا تھا۔ انگریزی میں رسکن اسی نظریے کا حامی تھا کہ قلب کے گداز اور روح کی بالیدگی کے بغیر اعلیٰ فن پارے کی تخلیق ناممکن ہے۔ رسکن کے مطابق اعلیٰ فن کار کے لیے پاکیزگی اور روحانیت بھی ایک شرط تھی۔ اقبال نے بھی یہی بات ایک خط میں بیان کی ہے۔ عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں:۔

"میرے کلام کی مقبولیت محض فضل ایزدی ہے ورنہ اپنے آپ میں کوئی ہنر نہیں دیکھتا اور اعمال صالحہ کی شرط بھی مفقود ہی ہے۔" ۱؎

اقبال نہ صرف قدیم اصناف سخن کی تقسیم کو پسند کرتے تھے بل کہ اس بات پر بھی مصر تھے کہ انہیں بہر صورت برقرار رہنا چاہیے چناں چہ انہوں نے ان اصناف سے باہر آنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ انگریزی ادبیات کے زیر اثر نظم معریٰ (BLANK VERSE) جو خود انہی کے زمانے میں ابھری۔ اقبال اس کے بھی مخالف تھے۔ چناں چہ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اب کچھ عرصہ سے بلا ردیف و قافیہ نظمیں لکھی جاتی ہیں اور یہ انگریزی نظموں کی تقلید ہے جس کا نام انگریزی میں بلینک ورس ہے۔ جس کو نثر مرجز کہنا چاہیے۔ اگرچہ پبلک مذاق کچھ ایسا ہو چلا ہے مگر میرے خیال میں یہ روش آئندہ مقبول نہ ہوگی۔" ۲؎

یہ عجیب بات ہے کہ اقبال جو زندگی بھر تجدد پسند رہے اور اپنی شاعری اور فلسفہ کے ذریعے اس بات کی تلقین کرتے رہے کہ ہمیں آئین نو سے نہیں ڈرنا چاہیے اور نہ ہی طرز کہن پر اصرار کرنا چاہیے وہ شاعری

۱؎، ۲؎۔ اقبال نامہ۔ جلد دوم۔ ص ۲۳۵، ۲۷۹

میں ا[illegible]ے سلسلے میں کسی تجربے کے روادار نہیں تھے۔ تاہم ان کے یہاں اصناف کو اولی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ ان کے یہاں صورت کی تحریک و تشکیل تجربے کے تابع ہے۔ ان کے یہاں مروجہ اصناف تو ہیں لیکن انہوں نے ان کی قدیم معنوی اور ظاہری حد بندیوں کا لحاظ کم رکھا ہے سوائے ابتدائی زمانے کے جس میں ان پر روایتی طور طریقوں کا اثر تھا۔ دراصل اقبالؔ کے ہاں مثنوی، غزل، قطعہ، رباعی وغیرہ کی ظاہری شکلوں کی موجودگی سے یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ انہوں نے ان اصناف کی روایتی روح کا بھی التزام کیا ہے مثلاً یہ ضروری نہیں ہے کہ قصیدہ کے فارم میں انہوں نے قصیدہ کے مضامین ہی باندھے ہوں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے ایک مضمون 'اقبال کا ادبی فن' میں لکھتے ہیں:۔

"میرا خیال ہے کہ اقبالؔ کے یہاں اصناف کا محض اصناف کی حیثیت سے کوئی مقام نہیں۔ ان کے یہاں اصل شئے پیرایۂ بیان یا اسلوب اظہار ہے۔ انہوں نے اپنے پختہ دورِ شاعری میں بیان و اظہار ہی کو مرکزی چیز سمجھا ہے۔ اصناف کا لحاظ محض ضمنی سی چیز ہے یا ایک تابع حقیقت۔ اس لئے ان کی شاعری کے تبصرے میں غزل، رباعی اور مثنوی کے عنوان سے بحث کرنا لاحاصل اور شاید غلط بات ہوگی۔"[1]

الطاف حسین حالیؔ نے اپنے 'مقدمہ شعر و شاعری' میں قافیے کی اہمیت پر زیادہ زور دینے کو شاعری میں بہتر اظہار و ابلاغ کی راہ میں رکاوٹ کا باعث قرار دیا تھا لیکن اقبال اس پابندی کو لازمی سمجھتے ہیں:۔

"سنیئے غزل اور رباعی کے لیے قافیہ کی شرط تو لازمی ہے۔ اگر ردیف بھی بڑھا دی جائے تو سخن میں اور بھی لطف بڑھ جاتا ہے۔ البتہ نظم ردیف کی محتاج نہیں قافیہ تو ہونا چاہیئے۔"[2]

—— مولوی محمد صالح کے نام ایک خط میں اقبالؔ نے لکھا ہے کہ مختلف طبائع پر ایک ہی شعر کا اثر مختلف ہوتا ہے۔ اس میں قاری اور شاعر کے درمیان اس نفسی رابطہ کی طرف اشارہ ہے جو مؤثر الفاظ سے پیدا ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:۔

"ایک ہی شعر کا اثر مختلف قلوب پر مختلف ہوتا ہے بلکہ مختلف اوقات میں بھی مختلف ہوتا ہے

---

[1] مضمون مشمولہ 'اقبال بحیثیت شاعر' مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ص ۶۱ [2] اقبال نامہ جلد ۲ ص ۲۴۹

اس اختلاف کی وجہ قلوبِ انسانی کی ازلی فطرت اور انسانی تعلیم و تربیت اور تجربہ کا اختلاف ہے۔ اگر کسی شعر سے مختلف اثرات قلوب پر پیدا ہوں تو یہ بات اس شعر کی قوت اور زندگی کی دلیل ہے۔ زندگی کی اصل حقیقت تنوع اور گوناگونی ہے۔" ؎۱

انگریزی کے مشہور تنقید نگاروں آئی اے رچرڈز، ولیم ایمپسن اور کینتھ برک وغیرہ نے شاعری کے اس نفسیاتی پہلو پر بہت کچھ لکھا ہے جو کافی بصیرت افروز ہے۔ اقبال کو نفسیات سے کوئی دلچسپی تھی تاہم یہ نظریہ انہوں نے اپنے شاعرانہ وجدان سے ہی دریافت کیا تھا۔

اردو زبان سے اقبال کو محبت تھی اس کا اظہار انہوں نے عملاً اس طرح دیا کہ خود بھی اس زبان کو اپنی نظم و نثر کے لیے استعمال کیا اور دوسروں کو بھی اردو نثر میں علمی مضامین اور کتابیں لکھنے کی ترغیب دی۔ کچھ خطوط سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جامعہ عثمانیہ میں وضع اصطلاحات کا جو کام ہو رہا تھا اس میں بھی اقبال مدد دیتے رہے۔ ۲۰ جنوری ۱۹۲۲ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھتے ہیں:-

"— ادھر مولوی عبدالحق صاحب اصطلاحاتِ علمیہ کی ایک طویل فہرست ارسال کرتے ہیں کہ ان کے تراجم اردو پر تنقید کروں۔" ؎۲

مولوی عبدالحق صاحب کے نام ایک خط میں جو اردو کانفرنس میں دعوتِ شمولیت کے جواب میں لکھا گیا ہے، لکھتے ہیں:-

"— اگرچہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔" ؎۳

مولوی عبدالحق کے نام دو اور خطوط کے اقتباسات اردو زبان کے ساتھ ان کی شیفتگی کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں:-

"آپ کی تحریک اس تحریک سے کسی طرح کم نہیں جس کی ابتدا سر سید رحمۃ اللہ علیہ نے کی۔" ؎۴

"کاش میں اپنی زندگی کے باقی دن آپ کے ساتھ رہ کر اردو کی خدمت کر سکتا۔" ؎۵

؎۱۔ اقبال نامہ، جلد ۲، ص ۳۷۲؛ ؎۲۔ اقبال نامہ جلد ۲، ص ۱۹۱-۱۹۲؛
؎۳، ؎۴، ؎۵۔ اقبال نامہ جلد ۲۔ ص ۷۸-۸۱، ۸۱-۸۲، ۸۲-۸۳؛

اقبال کا نظریہ زبان صحت مند اور ترقی پسند نظریہ تھا۔ وہ زندہ زبانوں کے اس اصول سے واقف ہے کہ زبان ہمیشہ اپنے ارتقائی عمل میں مصروف ہوتی ہے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ ساتھ زبان میں بھی تبدیلیاں لازمی بن جاتی ہیں۔ سردار عبدالرب نشتر کے نام ایک خط میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"زبان کو میں ایک بُت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بل کہ اظہار مطالب کا ایک ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے۔ ہاں تراکیب کے وضع کرنے میں مذاقِ سلیم کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔" [1]

"تنقید ہمدرد" کے جواب میں اقبال نے "اردو زبان پنجاب میں" کے عنوان سے جو مضمون لکھا تھا۔ اور جو اکتوبر ۱۹۰۲ء کے "مخزن" لاہور میں چھپا تھا۔ اس سے اقبال کی غیر معمولی لسانی سوجھ بوجھ، اساتذہ کے کلام پر محاکمانہ نظر، لسانی رد ایت کے عرفان اور زبان کے معاملے میں ان کی مجتہدانہ بصیرت کی واضح تصویر اُبھرتی ہے۔ اور بقولِ پروفیسر مسعود حسین خان "اقبال نے اردو کے ارتقا کا جس مضبوط علمی گرفت کے ساتھ محاکمہ کیا ہے وہ ایک لسانی دستاویز کا حکم رکھتا ہے۔" [2] اس مضمون کا ایک اقتباس یوں ہے:۔

"جو زبان ابھی بن رہی ہو، اس کے محاورات وغیرہ کی صحت اور عدم صحت کا معیار قائم کرنا میرے خیال میں معاملات سے ہے۔ کیا تعجب کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس کے (اردو کے) زیر نگین ہو جائے۔ ایسی صورت میں ناممکن نہیں کہ جہاں جہاں اس کا رواج ہو وہاں کے لوگوں کا طریق معاشرت، ان کے تمدنی حالات، ان کا طرز بیان اس پر اثر کئے بغیر رہے۔ علم السنہ کا یہ مسلّم اصول ہے اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں نہیں ہے کہ اس اصول کے عمل کو روک سکے۔ تعجب ہے کہ میز، کمرہ، کچہری، نیلام وغیرہ

---

[1] اقبال نامہ۔ جلد دوم۔ ص ۵۶؛ [2] اقبال کی نظری و عملی شعریات۔ پروفیسر مسعود حسین خان، ص۔ ۲۵۔

اور فارسی اور انگریزی کے محاورات کے اردو ترجمے تو بلا تکلف استعمال کرو لیکن اگر
کوئی شخص اپنی اردو تحریر میں کسی پنجابی لفظ کا اردو ترجمہ یا کوئی پر معنی لفظ استعمال
کرے تو اس کو کفر و شرک کا مرتکب سمجھو۔"[۱]

یہ بات اب مسلمہ اصول بن چکی ہے اور اس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے کہ جن علاقوں میں کسی زبان کا چلن ہوتا ہے وہاں کے لوگوں کا طرز معاشرت ان کے تمدنی حالات اور ان کا طرز بیان اس پر یقیناً اثر انداز ہوتا ہے۔ اقبال کے لسانی شعور کی ترتیب و تشکیل کا ایک اہم پہلو مروجہ لسانی روایت کی مکمل گرفت سے ان کی آزادی اور لسانی مراکز سے ان کی دوری ہے۔

اقبال کے مکاتیب میں جابجا ان کے کلام کے بارے میں ان کے تاثرات، تصانیف کا پس منظر بعض منظومات یا اشعار کی شان نزول اور اس طرح کی بہت سی مفید باتیں ملتی ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ اپنی فارسی مثنوی اسرار خودی کے بارے میں مولانا گرامی کو ۱۳ جولائی ۱۹۱۴ء کو لکھتے ہیں:۔

"گذشتہ سال ایک مثنوی لکھنی شروع کی تھی ہنوز ختم نہیں ہوئی۔"

۶ فروری کو اس کے بارے میں خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں کہ مثنوی اب تقریباً تیار ہے اور مثنوی کے موضوع کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں خودی کی حقیقت اور استحکام پر بحث کی ہے منشی سراج الدین پال کو اسرار خودی کی تخلیق کے مختلف مراحل اور اس ضمن میں اپنی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے ۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء کے خط میں لکھتے ہیں:۔

"یہ مثنوی گزشتہ دو سال کے عرصے میں لکھی گئی ہے مگر اس طرح کہ کئی ماہ کے وقفوں کے
بعد طبیعت مائل ہوتی رہی۔ چند اتوار کے دنوں اور بعض بے خواب راتوں کا نتیجہ ہے
موجودہ مشغل وقت نہیں چھوڑتے اور جوں جوں اس پروفیشن میں زمانہ زیادہ ہوتا
جاتا ہے، کام بڑھتا ہی جاتا ہے۔ لٹریری مشاغل کے امکانات کم ہوتے جاتے ہیں
اگر مجھے پوری فرصت ہوتی تو غالباً اس موجودہ صورت سے یہ مثنوی بہتر ہوتی۔ اس کا

---

[۱]۔ اقبال کے نثری افکار۔ عبدالغفار شکیل۔ ص ۳۴۔۳۵۔

دوسرا حصہ بھی ہوتا، جس کے مضامین میرے ذہن میں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حصہ اس حصے سے زیادہ لطیف ہوگا، کم از کم مطالب کے اعتبار سے، گو تخیل کے اعتبار سے میں نہیں کہہ سکتا کہ کیسا ہوگا۔ یہ بات طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے جو اپنے اختیار کی بات نہیں ہے۔“ [1]

مثنوی کے دوسرے حصے کے لکھنے میں تعویق کی وجہ بیان کرتے ہوئے خان محمد نیاز الدین خان کو ۱۳ فروری ۱۹۱۶ء کو لکھتے ہیں:۔

”مثنوی کا دوسرا حصہ لکھنا چاہتا تھا مگر خواجہ حسن نظامی نے بحث چھیڑ کر توجہ اور طرف منعطف کر دی ہے۔“ [2]

—— اس سلسلے میں یکم نومبر ۱۹۱۶ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کو اطلاع دیتے ہیں:۔

”مثنوی اسرار خودی کے حصہ دوم کا کچھ حصہ لکھا گیا اور ایک نظم کے خیالات یا پلاٹ ذہن میں آئے جس کا نام ہوگا اقلیم خوشاں۔“ [3]

مولانا گرامی کو ۲۱ مئی ۱۹۱۷ء کو رموز بے خودی کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

”مثنوی کا دوسرا حصہ قریب الاختتام ہے۔ تقریظ موعودہ لکھیے۔“

خان محمد نیاز الدین خاں کو ۲۷ دسمبر ۱۹۱۷ء کو اطلاع دیتے ہیں:۔

”مثنوی کل سنسر کے محکمے سے واپس آگئی ہے۔ ان شاء اللہ آج کاتب کے حوالے کی جائے گی۔“ [4]

اس طرح کی بہت سی مثالیں مکاتیب اقبال سے پیش کی جا سکتی ہیں جن سے ان کی تصانیف اور مختلف نظموں کے بارے میں بعض مفید اور کارآمد باتیں ملتی ہیں۔ اسی طرح وہ مکاتیب بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں جو انہوں نے کچھ ایسے دوستوں کے خطوط کے جواب میں لکھے ہیں جو اپنے خطوط میں کلام اقبال پر اپنی رائے ظاہر کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے حضرات بھی تھے جن کی تنقید اور رائے کے اقبال نہ

---

[1] اقبال نامہ جلد ا ص ۲۳-۲۴ ؛ [2] مکاتیب اقبال - ص ۱۰۳ ؛ [3] شاد اقبال ص ۳۰۴ ؛ [4] مکاتیب اقبال - ص ۱۹

صرف منتظر رہتے تھے بل کہ جنہیں وہ خود بھی اس کی تحریک دیتے تھے۔ ان میں سید سلیمان ندوی، منشی سراج الدین، مولوی حبیب الرحمان شیروانی، مولانا گرامی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سید سلیمان نے رموز بے خودی پر معارف میں تبصرہ کیا۔ تو اس میں الفاظ و محاورات کی صحت کے بارے میں شکوک کا اظہار کیا تو اقبال نے انہیں خط لکھا کہ ان لغزشوں سے انہیں آگاہ کیا جائے۔ بعد میں جب سید سلیمان ندوی نے ایسے الفاظ و محاورات کی نشاندہی کی تو اقبال نے اپنے متعدد خطوط میں ان کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کیا اور جہاں کہیں موقع ملا، اساتذۂ فن کے کلام سے اسناد بھی پیش کیں۔ جن سے ایک طرف زبان اور شاعری کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر بھی سامنے آتا ہے اور دوسری طرف ان کے وسیع مطالعہ کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اس ضمن میں چند خطوط سے جستہ جستہ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:۔

"اصول تشبیہہ کے متعلق کاش آپ سے زبانی گفتگو ہو سکتی، قوت واہمہ کے عمل کے رُو سے بیدل اور غنی کا طریق زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ گو کتب بلاغت کے خلاف ہے، زمانۂ حال کے مغربی شعراء کا بھی طرز عمل یہی ہے۔" [1]

"خیمہ بر زد از حقیقت در مجاز" کے متعلق آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ از میں تجاوز کا مفہوم نہیں ہے کیوں کہ خیمہ بر زدن کے معنی قیام کرنے کے ہیں۔ میں تلاش میں تھا کہ کوئی سند مل جائے، جیسا کہ میں نے گذشتہ خط میں بھی عرض کیا تھا آج کلیات سعدی میں وہ سند مل گئی جو ارسال خدمت ہے:۔

صوفی از صومعہ گو خیمہ بزن در گلزار
وقت آن نیست کہ در خانہ نشینی بیکار [2]

'سیر' فارسی میں ان معنوں میں آتا ہے۔ 'سیر کردن' 'سیر زدن' 'سیر داشتن' بل کہ 'سیر دیدن' بھی

عمر ہا صائب بشہر عقل بودم کوچہ بند
ملتے ہم با غزالاں سیر صحرا می زنم [3]

"دشت اور بیشہ مرادف بھی آتے ہیں اور دشت کے لیے ضروری نہیں کہ بالکل خشک ہو۔

میرس از آب و رنگ کوہسار خش

---

[1]، [2]، [3]۔ اقبال اور سید سلیمان ندوی۔ طاہر تونسوی، ص ۴۳، ۴۴، ۴۴، ۴۵۔

ہزاراں دشتِ لالہ داغدارش ۔۔ یحییٰ شیرازی۔[۱]

اس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے ان سے صرف نظر کرکے صرف ان خطوط کی نشاندہی کی جاتی ہے جن میں مثنوی رموزِ بے خودی کے بارے میں اقبال کے خیالات مندرج ہیں۔ دیکھئے خط نمبر ۵، ۷، ۸، ۹، ۱۰، اور ۱۱، مندرجہ "اقبال اور سید سلیمان ندوی" مرتبہ طاہر تونسوی (مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۷۷ء)۔

اقبال نے ۱۹۲۲ء کے جلسہ انجمن حمایت اسلام لاہور اپنی نظم خضر راہ سنائی۔ اس نظم پر سید سلیمان ندوی نے اپنے مجلہ معارف میں ایک نوٹ لکھا جس میں اس نظم کی بڑی تعریف و تحسین کی لیکن اس نظم میں جوشِ بیان کی کمی کا ذکر بھی کردیا مولانا کا جملہ یوں ہے :۔

"..... ڈاکٹر اقبال کی یہ نظم گو جوشِ بیان میں ان کی پچھلی نظموں سے کم نہیں لیکن اس کی حیثیت سے تعقید اور فارسیت میں بھی کمی ہے۔" [۲]

۲۹ مئی ۱۹۲۲ء کے خط میں معارف کے اس نوٹ کے بارے میں شکریہ ادا کرتے ہوئے اقبال نے سید صاحب کو لکھا۔

"جوشِ بیان کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا صحیح ہے مگر یہ نقص اس نظم کے لیے ضروری تھا (کم از کم میرے خیال میں) جناب خضر کی پختہ کاری ان کا تجربہ اور واقعات و حوادث عالم پر ان کی نظر ان سب باتوں کے علاوہ ان کا انداز طبیعت جو سورہ کہف سے معلوم ہوتا ہے اس بات کا متقضی تھا کہ جوش اور تخیل کو ان کے ارشادات میں کم دخل ہو۔ اس نظم کے بعض بند میں نے خود نکال دیئے محض اس وجہ سے کہ ان کا جوشِ بیان بہت بڑھا ہوا تھا اور جناب خضر کے اندازِ طبیعت سے موافقت نہ رکھتا تھا۔ یہ بند اب کسی اور نظم کا حصہ بن جائیں گے۔" [۳]

---

[۱]۔ اقبال اور سید سلیمان ندوی۔ طاہر تونسوی۔ [۲]۔ معارف مئی ۱۹۲۲ء ص۔ ۳۷۸ - ۳۸۱۔

[۳]۔ خط نمبر ۲۵۔ اقبال اور سید سلیمان ندوی مرتبہ طاہر تونسوی۔

اسی طرح ضربِ کلیم کے بارے میں کچھ حضرات کو شعریت اور جوشِ بیان کی کمی کی شکایت تھی۔ ان شکایتوں کے بارے میں سر راس مسعود کے نام ایک مکتوب میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"باقی رہی کتاب۔ سو یہ ایک TOPICAL چیز ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ بعض خاص خاص مضامین پر میں اپنے خیالات کا اظہار کروں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ ایک اعلانِ جنگ ہے زمانۂ حاضر کے نام اور ناظرین سے میں نے خود کہا ہے۔ ع۔

میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

'نوائے چنگ' یہاں موزوں نہیں اس کتاب کا REALISTIC ہونا ضروری ہے اور نوائے چنگ کی تلافی EPIGRAMMATIC STYLE سے کی گئی ہے۔"[۱]

جاوید نامہ کے متعلق ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"آخری نظم 'جاوید نامہ' جس کے دو ہزار شعر ہوں گے ابھی ختم نہیں ہوئی ممکن ہے مارچ تک ختم ہو جائے یہ ایک قسم کی کامیڈی ہے اور مثنوی مولانا روم کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس کا دیباچہ بہت دلچسپ ہوگا اور اس میں غالباً ہندو ایران بلکہ تمام دنیائے اسلام کے لیے نئی باتیں ہوں گی۔ ایرانیوں میں حسین ابن منصور حلاج، قرۃ العین، ناصر خسرو وغیرہ کا نظم میں ذکر آئے گا۔ جمال الدین افغانی کا پیغام مملکت روس کے نام ہوگا۔"[۲]

اقبال جب دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن گئے تو واپسی پر سپین بھی گئے، وہاں مسلمانوں کے زمانے کی کچھ عمارات کی زیارت کی۔ ان عمارتوں میں قرطبہ کی مسجد بھی تھی جس پر انہوں نے ایک نظم لکھی جو اردو میں اقبال کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں ایک خط میں شیخ محمد اکرام کو لکھتے ہیں:۔

"ہسپانیہ پر نظم یوں تو تمام پرسوز ہے لیکن طارق سے متعلق اشعار بالخصوص دل گداز

---

[۱]، [۲]۔ اقبال نامہ۔ جلد اول۔ ص ۳۸۱، ۲۰۶

ہیں۔ میں اسے محفوظ رکھوں گا اور کوشش کروں گا کہ یہ اشعار اردو میں منتقل ہو سکیں۔ میں اپنی سیاحت اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا ہوں۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجد قرطبہ پر لکھی جو کسی وقت شائع ہوگی۔ الحمرا کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔"[۱]

اور جذبات کی یہ رفعت ان کی نظم "مسجد قرطبہ" میں بھی منتقل ہوئی ہے جس نے اسے اردو ادب کی ایک لافانی نظم بنا دیا ہے۔

---

[۱] اقبال نامہ۔ جلد دوم۔ ص ۳۲۱۔ ۳۲۲۔

فکرِ اقبال — خطوط کی روشنی میں

اقبال ایک عظیم شاعر ہی نہیں ایک سربرآوردہ مفکر بھی تھے۔ ہند و پاک کے بیشتر اقبال شناسوں نے ان کی فکر کے مختلف پہلوؤں پر خاصی تفصیل سے لکھا ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ضمن میں ان کی شاعری پر ہی زیادہ توجہ دی ہے اور فکر کے مختلف پہلوؤں کی توضیح و تعبیر میں اکثر شاعری کے حوالے ہی سے مدد لی گئی ہے۔ ان کے خطبات کو جو بلاشبہ اقبال کے علمی، تاریخی، مذہبی اور مابعد الطبیعاتی فکر کا خزینہ ہے، ابھی تک اس درجہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔ مکاتیب کا بھی یہی حال ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کا خاصا حصہ کاروباری نوعیت کے مکاتیب پر مشتمل ہے، تاہم ان کا ایک معتد بہ حصہ ایسا بھی ہے جن میں کہیں کسی قدر تفصیل کے ساتھ، اکثر اجمالاً اور بیشتر محض اشارتہً اقبال نے اُن مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جن سے انہیں ساری عمر شغف رہا ہے جن پر ان کی شاعری اور نثر دونوں کی اساس قائم ہے اور جنہیں فکرِ اقبال میں مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ فلسفۂ خودی، نظریۂ زمان و مکان، تصوف، فقہِ اسلامی، یہ وہ موضوع ہیں جن کی اہمیت مطالعۂ اقبال کے سلسلے میں مسلّم ہے۔ زیرِ نظر باب میں مختلف ذیلی عنوانات کے تحت انہی موضوعات اور مسائل کے بارے میں اقبال کے نقطۂ نظر کو ان کے مکاتیب کی روشنی میں ابھارنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فلسفۂ خودی:- فلسفۂ خودی اقبال کی فکر کا محور ہے اور یہی وہ موضوع ہے جو اقبال کی نظم و نثر پر حاوی ہے۔ اقبال نے جب زندگی اور کائنات کے بارے میں سوچنا شروع کیا اور جب ان کے ذہن میں ذات اور کائنات کے بارے میں مختلف سوالات ابھرے تو انہی سوالات کا جواب تلاش کرتے کرتے وہ فلسفۂ خودی تک پہنچ گئے جسے انہوں نے اپنا پیغام یا دوسرے لفظوں میں اپنا فلسفۂ حیات بنا دیا۔ کائنات کی اصل کیا ہے؟ انسان کیا ہے؟ اور انسانی زندگی کیا ہے؟ کیا یہ کائنات اور انسانی زندگی محض ایک فریب نظر ہے؟ یہ اور اس طرح کے اور بہت سے سوالات شروع ہی سے انسانی ذہن کو سرگرداں رکھے ہوئے ہیں، اور دیکھا جائے تو یہی وہ بنیادی سوالات ہیں جنہوں نے وقتاً فوقتاً دنیا میں مختلف نظام ہائے فکر کو جنم دیا، ان کی آبیاری کی اور انہیں ترویج دی چناں چہ یونانی مفکرین اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کائنات اور انسانی وجود محض ایک دھوکا ہے اور یہ کہ "بہترین زندگی عمل اور مقاصد آفرینی کی زندگی نہیں بل کہ عقل کا تماشائی ہونا ہے۔ خدا جو تمام وجود کا ماخذ اور نصب العین ہے وہ بھی غیر متحرک اور غیر فاعل ہے دُنیا کی زندگی سایہ ہے۔"[1] بہت دیر تک مشرق و مغرب کے حکما اور فلاسفر کی تحریروں میں انہی خیالات کی بازگشت سنائی دی۔ نفیِ ذات کا یہ فلسفہ کمزور قوموں کو مایوسی اور شکست خوردگی کے کرب سے نجات دلاتا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس فلسفے کو حرزِ جان بنا لیا۔ مسلمانوں نے بھی اپنے سیاسی اور معاشی اُدبار کے زمانے میں ہی اس فلسفہ کو اپنا لیا اور اس طرح سے عملی زندگی سے کنارہ کش ہو کر اور سعی و عمل سے منہ موڑ کر ایسی خانقاہی زندگی کو اپنا شعار بنا لیا جو غلامی و محکومی کو نہ صرف گوارا بنا لیتی تھی بلکہ اسے اپنا وسیلۂ نجات تصور کرتی تھی۔

"مغرب میں سب سے پہلے جس شخص نے اس افلاطونی نظریئے کو رد کیا وہ ڈیکارٹ تھا جس کا یہ قول بڑا مشہور ہے کہ دنیا کے متعلق تو خیر سوچا جا سکتا ہے کہ ہے یا نہیں ہے لیکن مجھے اپنے وجود پر شبہ نہیں ہو سکتا۔"[2] اقبال نے بھی اس نقطۂ نظر کو اپنایا اور نہ صرف اس نقطۂ نظر پر اپنے جملہ افکار کی عمارت کھڑی کر دی بل کہ اس کے انتھک مفسر بھی بن گئے۔ شیخ محمود شبستری کے "گلشن راز" کے طرز پر لکھے گئے

---

[1] فکر اقبال - خلیفہ عبدالحکیم - ص ۲۸۳ (ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۷ء)

[2] بحوالہ فکر اقبال - مرتبہ غلام دستگیر رشید - ص ۱۳۲ (نفیس اکیڈمی حیدرآباد دکن ۱۹۴۴ء)

"گلشن راز جدید" میں انہوں نے زندگی کی نفی کرنے والوں اور اس کائنات کو فریب نظر سمجھنے والوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:۔

توان گفتن جہانِ رنگ و بو نیست — زمین و آسمان و کاخ و کو نیست
توان گفتن کہ خوابے یا فسون است — حجاب چہرۂ آن بے چگون است
توان گفتن ہمہ نیرنگِ ہوش است — فریب پردہ ہائے چشم و گوش است

' میں یہ مان سکتا ہوں اس جہان رنگ و بو اور زمین آسمان کا وجود نہیں ہے۔ یہ بھی مان سکتا ہوں کہ یہ محض ایک خواب اور حقیقت پر ایک طرح کا پردہ ہے اور یہ بھی تسلیم کر سکتا ہوں کہ جو کچھ دیکھ اور سُن رہا ہوں وہ میرے چشم و گوش کا فریب اور ہوش و حواس کا فتور ہے لیکن یہ کیسے مان لوں کہ میں نہیں ہوں۔ اگر میں یہ سمجھ لوں کہ میرا وجود محض وہم ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ میرے اندر وہ کون ہے جو مجھے اپنے وجود کے انکار کا احساس دلا رہا ہے۔ یہ احساس اس امر کا ثبوت ہے کہ میں موجود ہوں اور میری روح یا میری انا یا میری خودی ساری کائنات سے زیادہ یقینی اور قطعی ہے' اس قسم کے سوالات اور شاعروں نے بھی اٹھائے تھے۔ اس ضمن میں خاص طور پر غالب کا نام لیا جا سکتا ہے۔ تاہم غالب کے یہاں ان کی حیثیت زیادہ اہم نہیں ہے اور نہ ان کی بنا پر کسی طرح کا فلسفہ غالب سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

اقبال نے البتہ ان سوالوں کے جواب میں محض وجدان پر ہی تکیہ نہ کیا بلکہ منطقی دلائل و براہین سے کام لے کر اسے ایک مستقل فلسفہ زندگی میں ڈھال دیا۔

اگر گوئی کہ من وہم و گماں است — نمودش چوں نمودِ ایں و آں است
بگو با من کہ دارائے جہاں کیست — یکے در خود نگر آں بے نشاں کیست

اس فلسفے میں خدا بینی اور خود بینی دونوں پر یکسان زور دیا گیا ہے۔ خودی کا احساس ذات خداوندی کا ادراک ______ خودی کے احساس کا اثبات ہے۔ خدا کو فاش دیکھنے کے لیے خود کو فاش تر دیکھنا ایک ضروری امر قرار پاتا ہے۔

اگر خواہی خدا را فاش دیدن — خودی را فاش تر دیدن بیاموز

خودی کا لفظ اقبال کے ہاں ان معنوں میں استعمال نہیں ہوا ہے جن میں یہ عام طور پر اردو اور فارسی میں مروج تھا۔ اقبال کے یہاں خودی کا لفظ وسیع تر مفہوم کے ساتھ آیا ہے اور اقبال نے اس کی تعبیر و تشریح میں اردو اور فارسی میں سینکڑوں شعر کہے ہیں۔ اقبال کے نزدیک خودی زندگی کی ابتدا، وسط اور انجام سبھی کچھ ہے۔ فرد اور قوم کی ترقی و پستی، خودی کی ترقی و پستی پر انحصار رکھتی ہے۔ خودی کا تحفظ اور اس کا استحکام خود زندگی کا تحفظ اور استحکام ہے اور خودی کی کارفرمائی ازل سے ابد تک قائم ہے:-

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات ۔۔۔ خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے ۔۔۔ نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

—— لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا اصل راز خودی ہے۔ توحید خودی کی تلوار کو آبدار بناتی ہے اور خودی توحید کی محافظت کرتی ہے۔

خودی کا سرِ نہاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ ۔۔۔ خودی ہے تیغ فساں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

—— خودی اور خدا۔ اگر وجود کو لازم و ملزوم بنا کر وجود کی تعریف یہ کی ہے کہ جوہر خودی کی نمود کا دوسرا نام وجود ہے۔

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود ۔۔۔ مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا!
وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود ۔۔۔ کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

خودی کی تعبیر و تشریح اور اس کے اوصاف میں اقبال کے بے شمار اشعار ان کے کلام میں جابجا بکھرے پڑے ہیں۔ ان کے یہاں اس کا اظہار جذبات کے لمحاتی جوش پر مبنی نہیں ہے بلکہ انسان کے نفس اور اس کی تہذیبی زندگی پر کامل غور و فکر کا نتیجہ ہے اور اس غور و فکر کی ابتدا اسرارِ خودی کی اشاعت (۱۹۱۵ء) سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ خودی کے اس فلسفے کے بنیادی خط و خال ۱۹۰۸ء سے پہلے ہی ظاہر ہونے لگے تھے[1]۔ ۱۹۰۸ء میں انگلستان سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس کی طرف خاص توجہ کی اور اسی دوران میں انہوں نے اسے ایک باضابطہ فلسفے کی صورت دینے پر غور کرنا شروع کیا جس کا بین

---

[1] روزگارِ فقیر۔ ص ۳۴۔

ثبوت اُن شذرات سے ملتا ہے جو ان کی بیاض میں جا بجا نظر آتے ہیں، یہ بیاض اقبال نے ۱۹۱۰ء میں قلمبند کی تھی[1]۔ اس کے علاوہ ان کے تحقیقی مقالے "فلسفۂ عجم" میں بھی بعض اجزاء ایسے ہیں جو اس فلسفے کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں[2]۔ "اسرارِ خودی" کا دیباچہ جو بعد میں کتاب سے خارج کیا گیا، اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اقبال نے دُنیا کی تہذیبی تاریخ کا عمیق مطالعہ کیا تھا اور برسوں کے تفکر کے بعد اپنے فلسفے کو تشکیل دی تھی۔ اس دیباچے[3] میں انہوں نے وحدت الوجود کے عقیدے کے حوالے سے خودی اور خدا کے ان تصورات کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے جو ایک مدت سے جنوبی ایشیا میں مروج تھے اور جنہوں نے ان کے باشندوں سے قوتِ عمل چھین لی تھی۔

یہ بات اب عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ اقبال نے مشرق و مغرب کے سربرآوردہ مفکروں اور فلسفیوں کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا تھا اور اپنے نظریۂ حیات کی ترتیب میں خذ ما صفا ودع ما کدر کے مطابق ردّ و قبول سے کام لیا۔ اس نظریۂ حیات میں جہاں قرآنی تعلیم اور صوفیوں کے رُوحانی تجربات خاص طور پر مولانا رومی کی تاویلات کے عناصر شامل ہیں وہاں وہ مغربی مفکرین خاص طور پر نطشے، فشتے اور برگساں سے بھی متاثر ہیں اور "ان سب سے کسی ایک پہلو میں متفق ہیں اور کسی دوسرے یا اسی پہلو میں شدید اختلاف رائے بھی رکھتے ہیں[4]۔"

مولانا رومی سے اقبال معنوی اور روحانی اعتبار سے بہت ہی قریب ہیں۔ وہ رومی کو اپنا روحانی پیشوا سمجھتے ہیں، چناں چہ جاوید نامہ میں خاص طور پر انہوں نے سیرِ افلاک میں رومی ہی کو اپنا راہبر بنایا۔ مولانا رومی نے غالباً پہلی بار لفظ خودی کو عام مروجہ معنوں سے ہٹ کر استعمال کیا اور اس میں احساسِ نفس، ہوشیاری اور خودداری کے معنی بھی سمو دیئے، جس کی کچھ مثالیں ان کی شہرہ آفاق مثنوی میں ملتی ہیں چناں چہ وہ کہتے ہیں:۔

---

[1] شذرات اقبال۔ ص ۷۶، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۶۔ [2] فلسفۂ عجم۔ ص ۱۸، مترجمہ میر حسن الدین ۱۹۳۶ء۔
[3] دیباچہ مثنوی اسرار خودی۔ مشمولہ اقبال کے نثری افکار مرتبہ عبد الغفار شکیل۔ ص ۸۶۔۹۱، (انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۱۹۷۷ء)۔ [4] فکر اقبال۔ خلیفہ عبد الحکیم۔ ص ۲۸۷ (۱۹۷۷ء)۔

با خودی تو لیک مجنون بے خود است   در طریقِ عشق بیداری بد است [۱]

با خودی با بے خودی دو چار زد   بیخود اندر دیدۂ خود خار زد [۲]

می گریزند از خودی در بے خودی   یا بہ مستی یا بہ شغل اے مہتدی [۳]

گو مولانا نے خودی کو تکبر، غرور اور نخوت کے عام معنوں میں بھی استعمال کیا ہے [۴]۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ مولانا کے یہاں معنوی طور پر خودی کا تصور پایا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود شناسی اور خود داری کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں مثنوی مولانا رومی سے یہ اشعار ملاحظہ ہوں :-

صد ہزاراں فصل داند از علوم !   جانِ خود را می نداند آں ظلوم

داند او خاصیتِ ہر جوہری   در بیانِ جوہرِ خود چوں خری

قیمتِ ہر کالہ می دانی کہ چیست   قیمتِ خود را ندانی ز احمقیست [۵]

بایں ہمہ مولانا کا عام رجحان وحدت الوجود کی طرف تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں 'خودی' کا یہ مفہوم اس قدر عام نہ تھا اور وہ خودی کی بجائے بے خودی ہی کو زیادہ پسند کرتے تھے، لیکن یہ ضرور ہے کہ نظریہ خودی کے اجاگر کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے میں اقبال پر مولانا کا اثر پڑا۔ اور اقبال نے اس نظریئے کی تفہیم و ترسیل میں اپنی تمام تر قوتیں صرف کر کے اسے اپنی نظم و نثر کا محور بنا دیا۔ اقبال نے جب یہ نظریہ پیش کیا تو متوقع طور پر اس کی مخالفت ہوئی کیوں کہ لوگ عام طور پر اس لفظ کے مروجہ معنوں ہی سے مانوس تھے۔ اگرچہ پیش بندی کے طور پر اقبال نے اسرارِ خودی کے دیباچے میں اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا :

" ہاں لفظ خودی کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بمعنیٰ

۱۔ مثنوی مولانا رومی، دفتر اول ص ۱۱ + ۲۔ مثنوی مولانا رومی، دفتر چہارم ص ۲۴۹ + ۳۔ مثنوی مولانا رومی، دفتر ششم ص ۳۵۵

۴۔ پس خودی را سر برباد و انفقار   بیخودی شوفانی و درویش وار (مثنوی مولانا رومی دفتر ششم ص ۳۷۵) +

۵۔ مثنوی مولانا رومی۔ دفتر سوئم ص ۱۷۹ +

غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساس نفس یا تعین ذات ہے۔" ۱؎

لیکن اس پیش بندی کے باوجود بھی بہت سے لوگوں کو اس لفظ سے دھوکا ہوا اور اس طرح سے انہوں نے اقبال کے نظریے سے غلط قسم کے نتائج مستنبط کیے۔ یہ غلط فہمی اقبال کی زندگی میں بھی قائم رہی اور کچھ حلقوں میں ابھی تک PERSIST کر رہی ہے۔ اقبال ۱۲ مئی ۱۹۳۷ء کو قاضی نذیر احمد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"اسرار خودی اور رموز بے خودی دونوں کا موضوع یہی مسئلہ خودی ہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے آپ کو اطمینان ہو جائے گا۔ اگر ان دونوں میں یا (میری) کسی اور کتاب میں آپ کو کوئی ایسا شعر ملے جس میں خودی کا مفہوم تکبر یا نخوت لیا گیا ہو تو اس سے مجھے آگاہ کیجئے گا۔" ۲؎

خودی کو وہ عرفان نفس اور خود شناسی کے مفہوم میں استعمال کرتے تھے اور اس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اسی کی بدولت انسان کی زندگی سنورتی ہے اور اس کو خدا کی عطا کی ہوئی عظمت و شوکت دوبارہ حاصل ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خودی کے تحفظ اور اس کے استحکام پر جگہ جگہ زور دیتے ہیں اور اس کی بقا کا راز بھی سمجھاتے ہیں۔ ۳؎ خودی اقبال کے نزدیک ایک ایسی مخلوق ہے جو عمل سے لازوال ہو سکتی ہے۔ خالق اور مخلوق میں جو مغائرت ہے اس کے پیش نظر مخلوق اپنی ہستی کو فنا کر کے خالق کے ساتھ متحد نہیں ہو سکتا۔ معرفت خداوندی کے لیے اگر عارف اپنے آپ کو معروف کی ذات میں گم بھی کر دے تو بھی عارف و معروف میں فرق باقی رہ جاتا ہے اور یہ فرق اقبال کے نزدیک بہت ہی مستحسن ہے:

خودی را زندگی ایجاد غیر است — فراق عارف و معروف خیر است ۴؎

۱؎۔ دیباچہ مثنوی اسرار خودی مشمولہ اقبال کے نثری افکار مرتبہ عبدالغفار شکیل۔ ص ۹۱

۲؎۔ اقبال نامہ، حصہ دوم۔ ص ۲۳۸۔ ۲۳۹ (لاہور ۱۹۵۱ء)

۳؎۔ دیباچہ اسرار خودی مشمولہ اقبال کے نثری افکار۔ مرتبہ عبدالغفار شکیل۔ ص ۸۶

۴؎۔ زبور عجم۔ ص ۲۱۹، طبع چہارم

اقبال انفرادی حیات پر زور دیتے ہیں۔ حیاتِ کلی سے متعلق نہیں ہیں۔ خدا بھی ایک فرد ہے البتہ وہ یکتا ترین فرد ہے[1]۔ وحدت الوجود کے نظریے سے متاثر ہو کر جہاں دوسرے صوفیا اپنی خودی کو بحرِ وحدت میں گم کر کے معرفت کی منزل حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہاں اقبال اپنی خودی کو برقرار رکھ کر ہی حیاتِ جاودانی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ چناں چہ کہتے ہیں:۔

مسافر جاوداں زی جاوداں میر　　جہانی را کہ پیش آید فراگیر
ترجمہ　بہ بحرش گم شدن انجام ما نیست　　اگر او را تو در گیری فنا نیست
خودی اندر خودی گنجد محال است　　خودی را عین خود بودن کمال است [2]

اور اسی وجہ سے اقبال خدا سے وصال کی بجائے فراق چاہتے ہیں کہ مبادا وصال سے ان کی خودی فنا نہ ہو جائے

ترجمہ　وصل اگر پایانِ شوق است الحذر　　ای خنک آہ و فغانِ بے اثر [3]

فلسفۂ خودی کے سلسلے میں اقبال پر بعض نے اعتراضات بھی کیے۔ ایک اعتراض مثلاً یہ تھا کہ اقبال کے فلسفۂ خودی میں فرد کی خودی پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ اس سے یہ خوف پیدا ہو چلا ہے کہ شاید ان کے پیشِ نظر ملت کا وجود نہیں۔ یہ اعتراض بقول شیخ عبدالقادر، عبدالرحمن بجنوری کا تھا۔ اقبال کا بیان ہے کہ "میں نے اس کے بعد ضروری سمجھا کہ رموزِ بے خودی لکھ کر اس قسم کے اندیشوں کا ازالہ کر دوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر بجنوری کا مضمون نہ چھپتا تو رموزِ بے خودی لکھی جاتی یا نہ لکھی جاتی لیکن یہ واقعہ ہے کہ مجھے بجنوری کا مضمون پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ رموزِ بے خودی کا لکھا جانا بے حد ضروری ہے۔" [4]

چناں چہ رموزِ بے خودی میں جماعت یا ملت کی خودی پر بحث کی گئی ہے اور فرد اور جماعت کی خودی کے باہم رشتوں کو اجاگر کیا گیا ہے اور یہ کہ فرد کی خودی کی تربیت و استحکام کے ساتھ ساتھ لازم

۱۔ R. A. NICHOLSON — Secrets of the Self, INTRODUCTION — P XVII (2nd Edition, Lahore)

۲۔ زبورِ عجم۔ ص ۱۲۹، ۳۔ جاوید نامہ۔ ص ۹۹ — (طبع دوم ۱۹۴۷ء)

۴۔ نذرِ اقبال۔ مرتبہ محمد حنیف شاہد۔ ص ۱۸، ۱۹۷۲ء لاہور

آیا ہے کہ جماعت کی خودی کو بھی مرتب اور مستحکم بنایا جائے، جماعت کی خودی کو استحکام بخشنے کے لیے انہوں نے اس بات کی تلقین کی کہ فرد اپنی خودی کو جماعت کی خودی میں ضم کردے تاکہ اس کی خودی جماعت کی خودی کے تابع ہوجائے۔

فرد تا اندر جماعت گم شود　　　قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

اس میں بظاہر تضاد اور تناقض معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف تو وہ کہتے ہیں کہ فرد کو اپنی خودی کی حفاظت و تربیت اس طور پر کرنی چاہیئے کہ وہ ترقی کی انتہائی منزلوں تک پہنچ کر خدا کا نائب بن جائے دوسری طرف وہ فرد کی خودی کو ملت کی خودی میں ضم کر دینے پر زور دیتے ہیں۔ یہ اعتراض بقول شیخ عبد القادر[1] ناقدین کی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ رموزِ بے خودی کو غور سے پڑھنے سے یہ اعتراض رفع ہوجاتا ہے۔ پہلی بات یہ کہ رموزِ بے خودی میں کہیں بھی ان بنیادی اصولوں سے انحراف نہیں کیا گیا ہے جو اسرارِ خودی میں اصولِ زندگی قرار دیئے گئے تھے۔ دوسری بات یہ کہ جہاں افراد کے لیے خودی کو استواری کا ذریعہ ٹھہرایا گیا ہے وہیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انفرادی زندگی کے جُزو کو قومی زندگی کے کُل میں ضم کر دینا ملی ترقی و استحکام کے لیے بہت ضروری ہے۔ اسی کو اقبال بے خودی کہتے ہیں۔ اور یہ بے خودی اقبال کے مطابق اسی وقت پیدا ہوجاتی ہے جب انفرادی خودی تکمیل تک پہنچتی ہو۔ اکبر الہ آبادی کے نام اقبال نے ایک خط میں (مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۱۸ء) اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"آپ مجھے تناقض کا ملزم گردانتے ہیں، یہ بات درست نہیں، میں اس خودی کا حامی ہوں جو سچی بے خودی سے پیدا ہوتی ہے، یعنی جو نتیجہ ہے ہجرت الی الحق کرنے کا اور جو باطل کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح مضبوط ہوتی ہے مگر ایک اور بے خودی ہے جس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو عاشقانہ شاعری کے پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے، یہ اس قسم سے ہے جو افیون و شراب کا نتیجہ ہے۔ دوسری وہ بے خودی ہے جو بعض صوفیائے اسلامیہ اور تمام ہندو جوگیوں کے نزدیک ذاتِ انسانی کو ذاتِ باری میں فنا کردینے سے پیدا ہوتی ہے اور

---

[1] مخزن۔ لاہور۔ ستمبر ۱۹۱۸ء۔ ص ۹۳

یہ فنا ذات باری میں ہے نہ احکام باری تعالیٰ میں۔ پہلی قسم کی بے خودی تو ایک حد تک مفید ہو سکتی ہے مگر دوسری قسم کی بے خودی تمام مذاہب و اخلاق کی جڑ کاٹنے والی ہے۔ میں ان دو قسموں کی بے خودی پر معترض ہوں اور بس۔ حقیقی اسلامی بے خودی میرے نزدیک اپنے ذاتی اور شخصی میلانات و رجحانات و تخیلات کو چھوڑ کر اللہ کے احکام کا پابند ہو جانا ہے۔ یہی اسلامی تصوف کے نزدیک فنا ہے البتہ عجمی تصوف فنا کے کچھ اور معنی جانتا ہے۔" [1]

اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ جو پروفیسر آر۔ اے نکلسن نے کیا تھا SECRETS OF THE SELF کے نام سے جب انگلستان میں شائع ہوا تو اقبال پہلی بار بطور ایک شاعر اور فلسفی کے انگلستان میں متعارف ہوئے اور اس ترجمے پر وہاں کے جرائد میں ریویو بھی شائع ہوئے، جن میں اقبال کے نظریات کی تنقید بھی کی گئی تھی جن میں خاص طور پر یہ کہا گیا کہ اقبال کا تصورِ انسان کامل اور ان کا فلسفۂ سخت کوشی وغیرہ نطشے کا چربہ ہیں۔ انہیں فرقہ پرست اور طبقاتی منافرت کا داعی سمجھا گیا اور یہ بھی کہا گیا کہ خودی کی تبلیغ ان کے یہاں مسلمانوں کو جارحیت کی ترغیب ہے۔ ان کے جواب میں اب تک بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اس ضمن میں اقبال کا وہ خط بڑی اہمیت کا حامل ہے جو انہوں نے ۲۴ جنوری ۱۹۲۱ء کو ڈاکٹر نکلسن کے نام تحریر کیا ہے اور اس میں اقبال نے مغرب کے بعض مبصرین اور خاص طور پر پروفیسر ڈکنسن کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے ان کی بعض غلط فہمیوں کے دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کے انسان کامل اور نطشے کے 'فوق الانسان' کے بارے میں جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی اس سلسلے میں اس خط میں لکھتے ہیں:۔

" وہ انسانِ کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے خلط مبحث کر کے میرے انسانِ کامل اور جرمن مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔ میں نے آج سے تقریباً بیس برس قبل انسان کامل

---

[1] اقبال نامہ۔ حصہ دوئم۔ ص ۶۰۔

کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب نہ تو نطشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا نہ اس کی کتابیں میری نظر سے گزری تھیں یہ مضمون "انڈین انٹی کیوری" میں شائع ہوا۔ اور جب ۱۹۰۸ء میں میں نے ایرانی الٰہیات پر ایک کتاب لکھی تو اس مضمون کو اس میں شامل کر لیا گیا۔" [۱]

—— اقبال کے نظریہ الوہیت کے بارے میں جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی اس کے بارے میں اقبال اپنے انگریز قارئین کو مشورہ دیتے ہیں کہ میرے خیالات کو سمجھنے کے لیے جرمن مفکر کے بجائے ایک انگریز فلسفی الیگزنڈر کے افکار ہی کو اپنا راہنما بنائیں۔ چناں چہ اسی خط میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:۔

"جس کے (الیگزنڈر کے) گلاسگو والے خطبات پچھلے سال شائع ہو چکے ہیں، ان خطبات میں اس نے خدا اور الوہیت کے عنوان سے جو باب لکھا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ الیگزنڈر کے خیالات میرے عقائد کی نسبت زیادہ جسارت آمیز ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ کائنات میں جذبہ الوہیت جاری و ساری ہے لیکن الیگزنڈر کی طرح یہ نہیں مانتا کہ یہ قوت ایک ایسے خدا کے وجود میں جلوہ آرا ہو گی جو وقت کا تابع ہوگا۔ اس باب میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ یہ قوت ایک اکمل و اعلیٰ انسان کے پیکر خاکی میں ظاہر ہو گی۔ خدا کے متعلق الیگزنڈر کا عقیدہ میرے عقیدے سے مختلف ہے لیکن انگریز ان جزوی اختلافات سے قطع نظر کر کے انسانِ کامل کے تخیل پر اپنے ایک ہم وطن کے افکار کی روشنی میں نظر ڈالیں تو انہیں یہ عقیدہ اس قدر اجنبی اور غیر مانوس نہیں معلوم ہوگا۔" [۲]

مسٹر ڈکنسن کا اعتراض یہ تھا کہ اقبال جسمانی قوت کو منتہائے کمال قرار دیتے ہوئے اس بات کا اظہار۔ انہوں نے اپنے تبصرے میں بھی کیا تھا اور اقبال کے نام ایک خط میں بھی۔ چناں چہ اس سلسلے میں اقبال نے اپنے مندرجہ بالا مکتوب میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

---

[۱]، [۲] خط بنام پروفیسر نکلسن ۲۴ جنوری ۱۹۲۱ء مشمولہ اقبال نامہ حصہ اول ص ۴۵۷-۴۷۴

"انہیں (مسٹر ڈکنسن کو) اس بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں روحانی قوت کا تو قائل ہوں لیکن جسمانی قوت پر یقین نہیں رکھتا۔ جب ایک قوم کو حق و صداقت کی حمایت میں دعوتِ پیکار دی جائے تو میرے عقیدے کی رُو سے اس دعوت پر لبیک کہنا اس کا فرض ہے لیکن میں ان تمام جنگوں کو مردود سمجھتا ہوں جن کا مقصد محض کشور کشائی اور ملک گیری ہو۔"[۱]

اقبال کے فلسفۂ خودی کے سلسلے میں جو اعتراضات کئے گئے، یہاں ان کا جواب دینا یا اس فلسفے سے متعلق پیدا شدہ غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور[۲]، خلیفہ عبدالحکیم[۳]، شاہ معین الدین احمد، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور دوسرے ماہرینِ اقبالیات نے اقبال کے معترضین کو کو مدلل جواب دیئے ہیں۔ یہاں مقصود یہ ظاہر کرنا تھا کہ اقبال نے اپنے فلسفے کی تعبیر و تشریح میں جہاں نظم کا سہارا لیا وہاں اپنے مکاتیب میں بھی حسبِ ضرورت اس بات کو ملحوظ نظر رکھا۔

تصوف اسلامی و عجمی:۔ اقبال نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، اس میں تصوف کا گہرا اثر تھا، ان کے والد شیخ نور محمد اگرچہ رسمی تعلیم سے بہرہ مند نہ تھے لیکن اپنے شوق و ذہانت کی وجہ سے اس قدر استعداد پیدا کر دی تھی کہ اردو فارسی کی کتابیں بآسانی پڑھ لیتے تھے، اہلِ علم کی صحبت میں رہتے تھے اور اپنے مذہبی شغف اور اخلاقی پاکیزگی کے سبب قابلِ احترام سمجھے جاتے تھے۔ انہیں تصوف سے نہ صرف خاص لگاؤ تھا بلکہ تصوف کا رنگ ان پر بہت زیادہ غالب تھا۔ ان کے روحانی تجربوں کے بارے میں کئی باتیں مشہور ہیں۔ خود اقبال کا بیان ہے کہ:۔

"میں نے والدہ کی زبانی سنا ہے کہ ایک آدھ مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ والد کی موجودگی میں بے چراغ کمرے کے اندر تاریک رات میں عجیب و غریب قسم کا نور ظاہر ہوا۔

۱۔ خط بنام پروفیسر نکلسن، ۲۴ جنوری ۱۹۲۱ء، مشمولہ اقبال نامہ حصہ اول۔ ص ۴۷۰۔ ۴۷۲ء

۲۔ ملاحظہ ہو "اقبال اور اس کے نکتہ چین"۔ رسالہ اردو (اقبال نمبر)۔ ص ۳۴۵ء

۳۔ ملاحظہ ہو۔ فکر اقبال۔ ص ۶۲۹ء

۴۔ ملاحظہ ہو۔ معارف، اعظم گڑھ۔ جنوری، فروری، ۱۹۵۳ء

اور تاریک کمرے میں ایسا معلوم ہوا کہ سورج نکل آیا ہے۔"[۱]

شیخ نور محمد "دل بیار و دست بکار" پر کاربند تھے، ساری عمر اپنے ہاتھوں سے روزی پیدا کی اور زندگی کے روزمرہ فرائض سے بے نیاز بھی نہ تھے لیکن اکثر ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے اور تصوف کے مسائل سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے گھر میں تصوف سے متعلق مشہور کتابوں کی افہام و تفہیم کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ اقبال کم عمری میں ہی اس قسم کی مجالس میں شریک رہتے چنانچہ ۲۴ فروری ۱۹۱۶ء کو شاہ سلیمان پھلواری کے نام جو اس وقت برصغیر کے بلند پایہ عالم و صوفی تھے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"میرے والد کو فتوحات اور فصوص سے کمال توغل رہا ہے اور چار برس کی عمر سے میرے کانوں میں ان کا نام اور ان کی تعلیم پڑنی شروع ہوئی۔ برسوں تک ان دونوں کا درس ہمارے گھر میں رہا۔ گو بچپن کے دامن میں مجھے ان مسائل کی سمجھ نہ تھی تاہم محفل درس میں ہر روز شریک ہوتا۔"[۲]

—— اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط میں اقبال نے اپنے والد کے بارے میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے ان کے والد کے میلانِ طبع کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے:۔

"پرسوں شام کھانا کھا رہے تھے اور کسی عزیز کا ذکر کر رہے تھے جس کا حال ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ دوران گفتگو میں کہنے لگے معلوم نہیں بندہ اپنے رب سے کب کا بچھڑا ہوا ہے، اس خیال سے اس قدر متاثر ہوئے کہ قریباً بے ہوش ہو گئے اور رات دس گیارہ بجے تک یہی کیفیت رہی۔ یہ خاموش لیکچر ہیں۔ جو پیران مشرق ہی سے مل سکتے ہیں۔ یورپ کی درسگاہوں میں ان کا نشان نہیں۔"[۳]

—— رموز بے خودی میں اقبال نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دن ایک سائل ہمارے دروازے

---

[۱]۔ آثارِ اقبال ۔ غلام دستگیر رشید (۱۹۴۶ء) ص ۱۸۰ ؛ [۲] انوار اقبال ۔ ص ۱۷۷۔

[۳]۔ اقبال نامہ ۔ حصہ دوئم ۔ ص ۶۶۔

پر آ کر بار بار آواز لگا رہا تھا جس سے مجھے غصہ آ گیا اور ایام شباب کی ناعاقبت اندیشی سے میں نے اس کو مارا۔ میری اس حرکت سے والد سخت آزردہ ہوئے اور بڑے دردانگیز لہجے میں فرمایا:۔

گفت فردا امت خیر الرسلؐ — جمع گردد پیش آن مولائی کل

غازیان امت بیضائی او — حافظان حکمت رعنائی او

ہم شہیدانے کہ دیں را حجت اند — مثل انجم در فضائے ملت اند

زاہدان و عاشقان دل فگار — عالمان و عاصیان شرمسار

درمیان انجمن گردد بلند — نالہ ہائی این گدائی دردمند

ای صراطت مشکل از بے مرکبی — من چہ گویم چون مرا پرسد نبیؐ

حق جوانی مسلمی با تو سپرد — کو نصیبی از دبستانم نبرد

از تو این یک کار آسان ہم نشد — یعنی آن انبار گل آدم نہ شد[1]

پھر نرم لہجے میں فرمایا:۔

اندکی اندیش و یاد آر اے پسر — اجتماع امت خیر البشرؐ[2]

باز این ریش سفید من نگر — لرزۂ بیم و امید من نگر

بر پدر این جور نازیبا مکن — پیش مولا بندہ را رسوا مکن[2]

اسی طرح ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ اقبال نے خود بیان کیا ہے کہ جن دنوں وہ سیالکوٹ میں پڑھتے تھے تو صبح اٹھ کر روزانہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ ان کے والد اپنے اوراد و وظائف سے فرصت پا کر آتے اور انہیں دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک بار جب اقبال تلاوت میں مصروف تھے تو والد نے ان سے کہا کہ کبھی فرصت ہو تو ایک بات بتانی ہے۔ آخر ایک مدت کے بعد انہوں نے اقبال سے کہا:۔ بیٹا، کہنا یہ تھا کہ تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ قرآن تم ہی پر اترا ہے یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہمکلام ہے[3]۔ یہ بات اقبال

---

[1]، [2]۔ اسرار و رموز۔ ص ۱۰۱، ۲۰۲ (۱۹۴۸ء)

[3]۔ سیر افغانستان۔ سید سلیمان ندوی۔ ۱۹۴۵ء۔ ص ۱۷۹

کے دل پر نقش ہو گئی۔ چناں چہ بالکل اسی بات کو انہوں نے اپنی نظم و نثر میں کئی جگہ بیان کیا ہے۔ بالِ جبریل میں کہتے ہیں:۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب　　　گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

'الٰہیات کی تشکیلِ جدید' میں بھی انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

"بقولِ ایک مسلمان صوفی کے، قرآن مجید کی فہم ایک مومن کے لیے اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ اسی پر نازل ہوا ہے، جس طرح کہ پیغمبرِ خدا پر نازل ہوا تھا۔" [۱]

اقبال نہ صرف دوسروں کو یہ تلقین کرتے تھے بل کہ زندگی بھر خود بھی اس پر عامل رہے۔ مرزا جلال الدین جو اقبال کے قریبی دوستوں میں سے تھے، لکھتے ہیں:۔

"مطالب قرآنی پر ان کی نظر ہمیشہ رہتی تھی، کلام پاک کو پڑھتے تو اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے۔ بل کہ نماز کے دوران میں جب وہ باآوازِ بلند پڑھتے تو وہ آیاتِ قرآنی پر فکر کرتے اور ان سے متاثر ہو کر رو پڑتے۔" [۲]

اُن کی والدہ امام بی بی بڑی نیک سیرت خاتون تھیں۔ پرہیزگار اور نماز روزے کی پابند تھیں۔ کسبِ حلال کا خاص طور پر خیال رکھتی تھیں۔ اقبال نے ان کی وفات پر جو مرثیہ 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' لکھا ہے اس میں اس تربیت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، جو انہیں اپنی والدہ سے ملی تھی۔

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا　　　گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

——اکبر الٰہ آبادی اقبال کی عظمت میں ان کے والدین کے فیضِ تربیت کو بنیادی اہمیت دیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

حضرت اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظریں جو ان کی طرز کی شیدا ہوئیں

یہ حق آگاہی، یہ خوش گوئی، یہ ذوقِ معرفت　　　یہ طریقِ دوستی، یہ خودداری، باتمکنت

---

[۱] RECONSTRUCTION - ص ۱۸۰۔

[۲] ملفوظاتِ اقبال۔ مرتبہ محمود نظامی، طبع اول۔ ص ۷۸۔

اس کے شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
باخدا تھے اہلِ دل تھے صاحبِ اسرار تھے
جلوہ گر ان میں انہیں کا ہے یہ فیضِ تربیت
ہے ثمر اس باغ کا یہ طبعِ عالی منزلت [۱]

غرض انہیں وہ ماحول اور گھر ملا تھا جس کا مذاق عارفانہ تھا تعلیم کے سلسلے میں بھی انہیں مولوی میر حسن اور ٹامس آرنلڈ جیسے اساتذہ ملے جن کی صحبت سے اقبال کے دل میں نہ صرف حصول تعلیم کی خواہش تیز تر ہوئی بلکہ جن کے اثر سے انہیں اسلام اور اسلامیات کے مطالعے سے بھی شغف پیدا ہوا۔ اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کی ترتیب میں انہیں فارسی ادبیات کا گہرا اور وسیع مطالعہ کرنا پڑا۔ اور اس مطالعے کے دوران ان کو ایرانی متصوفین کے افکار و خیالات سے سابقہ پڑا۔ چناں چہ تصوف ان کی زندگی کا ایک اہم موضوع بن گیا جس کا اظہار انہوں نے اپنی شاعری کے علاوہ اپنی نثری تحریروں اور مکاتیب میں بھی کیا۔ اگرچہ ہم انہیں صوفیا کے زمرے میں شامل نہیں کر سکتے۔ تاہم ان کی زندگی صوفیانہ تھی بعض لوگ اقبال کے کلام کے سطحی مطالعے کے باعث یہ کہتے ہیں کہ اقبال تصوف کے مخالف تھے حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں نہ صرف تصوف سے شغف تھا بلکہ ان کو صوفیا کی ذات سے بھی بے حد عقیدت تھی اور مختلف درگاہوں پر حاضری دینے کے علاوہ اہلِ دل حضرات سے بھی ملتے تھے اور ان سے فیضیاب ہوتے تھے۔ بزرگانِ دین اور اہلِ دل سے اعتقاد کی نسبت کہتے ہیں:۔

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے   بوسہ زن بر آستانِ کاملے

ہندوستان کے چند مشہور صوفیوں کے بارے میں ان کی عقیدت کا جو حال ہے وہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے ان بزرگوں کی نسبت کہتے ہیں۔ حضرت شیخ علی ہجویری کے بارے میں کہتے ہیں:۔

سیدِ ہجویر مخدومِ اُمم   مرقدِ او پیرِ سنجر را حرم
عہدِ فاروق از جمالش تازہ شد   حق ز حرفِ او بلند آوازہ شد

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رح کی بابت لکھتے ہیں:۔

---

[۱] کلیاتِ اقبال - دیباچہ - ص ۲۰ (مرتبہ محمد عبد الرزاق حیدر آباد)۔

دل بیتاب جا پہنچے دیارِ پیرِ سنجر میں
میسر ہے جہاں درمانِ دردِ ناشکیبائی

بو علی شاہ قلندر کی نسبت کہتے ہیں:۔

با تو می گویم حدیثِ بو علی
در سوادِ ہند نامِ او جلی
آں نوا پیرائے گلزارِ کہن
گفت ما را از گلِ رعنا سخن

حضرتِ شیخ میاں میر ولی کے بارے میں کہا ہے:۔

حضرتِ شیخ میاں میر ولی
ہر خفی از نورِ جانِ او جلی
تربتش ایمانِ خاکِ شہرِ ما
مشعلِ نورِ ہدایت بہرِ ما

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر اقبال کئی مرتبہ حاضر ہوئے ہیں۔ جب اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ ولایت جا رہے تھے تو دہلی میں درگاہِ نظام پر حاضر ہو کر "التجائے مسافر" کے عنوان سے ایک نظم پڑھی، جس کے ایک ایک شعر سے عقیدت و احترام کے جذبات ٹپکتے ہیں۔ ۲۵ جولائی ۱۹۱۸ء کو اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"تعطیلوں میں انشاءاللہ دہلی جانے کا مقصد ہے کہ ایک مدت سے آستانۂ حضرتِ محبوبِ الٰہی پر حاضر ہونے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ کیا عجب ہے کہ ان گرما کی تعطیلوں میں اللہ اس ارادے کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔"[۱]

پھر ۲۹ مارچ ۱۹۱۹ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھتے ہیں:۔

"دہلی تو گیا تھا اور دو دفعہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ پر بھی حاضر ہوا تھا۔ مگر افسوس پیرِ سنجر کے دربار میں حاضر نہ ہو سکا۔ انشاءاللہ پھر جاؤں گا اور اس آستانہ کی زیارت سے شرف اندوز ہو کر واپس آؤں گا۔"[۲]

۱۹۳۲ء میں جب اقبال سید سلیمان ندوی اور راس مسعود کے ہمراہ افغانستان گئے تو واپسی پر غزنی اور قندھار بھی گئے۔ اور انہوں نے حکیم سنائی اور حضرت داتا گنج بخش کے والد ماجد کے مزارات پر

---

[۱]، [۲]۔ اقبال نامہ۔ حصہ دوم۔ ص ۶۳، ۱۹۴+

بھی حاضری دی۔ اور خراجِ عقیدت پیش کیا اور قندھار میں خرقۂ مبارک کے دیدار کی سعادت بھی حاصل کی[1]
سید سلیمان ندوی کی روایت کے مطابق اقبال حکیم سنائی کے مزار کے منظر سے نہایت متاثر ہوئے۔ "وہ (اقبال) حکیم ممدوح کے سرہانے کھڑے ہو کر بے اختیار ہو گئے اور دیر تک زور زور سے روتے رہے۔"[2]

اب ایسے شخص کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ تصوف کا مخالف تھا، ایک انتہائی لغو اور بے بنیاد بات ہے ہاں یہ صحیح ہے کہ اقبال کو تصوف کے بعض مسائل سے اختلاف تھا جس کا اظہار انہوں نے اپنے کلام میں بھی کیا ہے۔ انہوں نے غیر اسلامی تصوف پر جو بے عملی، ترکِ دنیا، رہبانیت اور کشمکشِ حیات سے گریز کی ترغیب دیتا ہے شدت سے تنقید کی ہے۔ اسلامی تصوف کے بارے میں اقبال کا خیال ہے کہ یہ دل میں قوت پیدا کرتا ہے اور پستی و دون ہمتی کو دور کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک اسلامی تصوف کا مقصد انسان کا صفاتِ الٰہیہ سے متصف ہو کر زیادہ سے زیادہ اپنی شانِ یکتائی کو نمودار کرنا ہے لیکن غیر اسلامی تصوف ایسا ہے کہ طبائع کو پست کرنے والا ہے۔"[3] اسلامی تصوف کے متعلق اقبال لکھتے ہیں:۔

"میرے خیال میں یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ قرآن و احادیثِ صحیحہ میں صوفیانہ نظریہ کی طرف اشارات موجود تھے لیکن وہ عربوں کی خاص عملی ذہانت کی وجہ سے نشو و نما پا کر بار آور نہ ہو سکے۔ جب ان کو ممالک میں غیر موزوں حالات میسر آ گئے تو وہ ایک جداگانہ نظریہ کی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔"[4]

تصوف میں بیعت پر بڑا زور دیا جاتا ہے بلکہ صوفیوں کے زمرے میں شامل ہونے کے لئے بیعت پہلا قدم ہے۔ اقبال بھی سلسلۂ قادریہ میں بیعت رکھتے تھے، جس کا ذکر انہوں نے خود کیا ہے۔ ۱۲ نومبر ۱۹۱۶ء کو سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"یہی حال سلسلۂ قادریہ کا ہے جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں۔"[5]

ان کی یہ بیعت اپنے والد کے وسیلہ سے تھی۔ ان کے والد کے پاس ایک درویش آیا کرتے

۱، ۲۔ سیرِ افغانستان۔ سید سلیمان ندوی۔ ص ۱۲۸، ۱۳۳ ۔ ۳۔ اقبال نامہ حصہ دوم۔ ص ۵۵
۴۔ فلسفۂ عجم۔ ص ۱۴۷ ۔ ۵۔ اقبال نامہ۔ حصہ دوم۔ ص ۷۹

تھے جو سلسلۂ قادریہ سے منسلک تھے اور اُن کے والد ان ہی درویش سے بیعت تھے۔ اقبال البتہ پیشہ ور پیروں اور صوفیوں کے مخالف تھے۔ اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"یہاں لاہور میں ضروریاتِ اسلام سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں ..... صوفیا کی دکانیں ہیں لیکن وہاں سیرتِ اسلامی کی متاع نہیں بکتی۔" [۱]

اقبال نے اپنی پہلی شعری تصنیف 'مثنوی اسرارِ خودی' میں چند صوفیانہ نظریات سے اختلاف کیا، مثنوی کے دیباچے میں مسئلہ وحدت الوجود کی نفی کرتے ہوئے شیخ محی الدین عربی اور مشہور شاعر خواجہ حافظ شیرازی کو برا بھلا کہا۔ مثنوی کا شائع ہونا تھا کہ ملک میں اقبال کے خلاف ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ خواجہ حافظ شیرازی کو ایران میں بل کہ سارے ہندوستان میں نہ صرف ایک شاعر کی حیثیت سے اہمیت حاصل تھی بل کہ لوگ انہیں ولی بھی سمجھتے تھے چناں چہ بہت سے لوگوں نے اور خاص طور پر ان لوگوں نے جنہیں تصوف سے شغف تھا۔ اقبال کی مخالفت کا سلسلہ شروع کیا جن میں خواجہ حسن نظامی اور پیرزادہ مظفر احمد (مصنف مثنوی رازِ بے خودی) پیش پیش تھے۔ اکبر الہ آبادی بھی متاثر ہوئے چناں چہ اس زمانے میں عبد الماجد دریا بادی کے نام لکھے گئے خطوط میں اکبر الہ آبادی نے اقبال کے خیالات پر شدید الفاظ میں تنقید کی:۔

"حضرت اقبال معلوم نہیں کیوں تصوف کے پیچھے پڑے ہیں" (۱۶ اگست ۱۹۱۷ء)

"اقبال صاحب کو آج کل تصوف پر حملے کا بڑا شوق ہے۔ لکھتے ہیں عجمی فلاسفی نے عالم کو خدا قرار دے رکھا ہے اور یہ بات غلط ہے خلافِ اسلام ہے" (یکم ستمبر ۱۹۱۷ء)

"اقبال صاحب نے جب سے حافظ شیرازی کو علانیہ برا کہا، میری نظر میں کھٹک رہے ہیں۔ ان کی مثنوی 'اسرارِ خودی' آپ نے دیکھی ہوگی۔ اب 'رموزِ بے خودی' شائع ہوئی ہے۔ میں نے نہیں دیکھی، دل نہیں چاہتا۔" (۱۱ جون ۱۹۱۸ء)

—— جیسا کہ اس سے قبل ذکر آچکا ہے اس مخالفت کا سبب ایک طرف تو مثنوی اسرارِ خودی کا دیباچہ تھا جو پہلے ایڈیشن میں شامل تھا اور بعد میں حذف کر دیا گیا اور وہ پینتیس ۳۵ اشعار جن میں خواجہ حافظ کا

---

[۱] اقبال نامہ، حصہ دوم۔ ص ۴۸

ذکر کیا گیا ہے۔ دیباچے میں جہاں نفیِ خودی کے نظریے کی ابتداء اور مسلمانوں میں اس کی ترویج پر بحث کی گئی ہے وہاں اس میں پیدا ہونے والے نتائج کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور اس نظریے کو مسلمانوں میں اسلام کی رُوح سے بیگانہ ہو جانے کا سبب بتایا گیا ہے۔ تصوف کا ذکر کرتے ہوئے اقبال اس دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"بنی نوع انسان کی ذہنی تاریخ میں سری کرشن کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا کہ اس عظیم الشان انسان نے ایک نہایت دلفریب پیرائے میں اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکارا کیا کہ ترکِ عمل سے مراد ترکِ کلّی نہیں ہیں کیوں کہ عمل اقتضائے فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے بلکہ ترکِ عمل سے مُراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے مطلق دلبستگی نہ ہو سری کرشن کے بعد سری رامانج بھی اسی راستے پر چلے مگر افسوس ہے کہ جس عروسِ معنی کو سری کرشن اور سری رامانج بے نقاب کرنا چاہتے تھے سری شنکر کے منطقی طلسم نے اسے پھر محجوب کر دیا اور سری کرشن کی قوم ان کی تجدید کے ثمر سے محروم رہ گئی۔"

"مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک بھی ایک نہایت زبردست پیغامِ عمل تھی گو اس تحریک کے نزدیک انا ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لازوال ہو سکتی ہے مگر مسئلہ انا کی تحقیق و تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے اور وہ یہ کہ جس نقطۂ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی، اسی نقطۂ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربیؒ اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم و فضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود، کو جس کے وہ انتھک مفسر تھے اسلامی تصوف کا ایک لاینفک جزو بنا دیا۔ اوحد الدین کرمانی اور فخر الدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے عام عجمی شعراء اسی رنگ میں رنگین ہو گئے.....؟

"مختصر یہ کہ ہندو حکمائے مسئلہ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا۔ مگر ایرانی شعرا نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی انہوں نے دل کو اپنی آماجگاہ بنایا اور ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر تقریباً تمام اسلامی اقوام کو ــــ ذوق عمل سے محروم کر دیا۔ علمائے قوم میں سب سے پہلے غالباً ابن تیمیہ علیہ الرحمہ اور حکما میں واحد محمود نے اسلامی تخیل کے اس ہمہ گیر میلان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی مگر افسوس ہے کہ واحد محمود کی تصانیف آج ناپید ہیں۔ ملا محسن فانی کشمیری نے اپنی کتاب دبستانِ مذاہب میں حکیم کا تھوڑا سا تذکرہ لکھا ہے جس سے اس کے خیالات کا پورا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ابن تیمیہ کی زبردست منطق نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا مگر حق یہ ہے کہ منطق کی خشکی شعر کی دلربائی کا مقابلہ نہیں کر سکتی" [۱]

حافظ شیرازی کے بارے میں جو شعر مثنوی میں تھے انہیں اقبال نے مخالفت کے باعث دوسرے ایڈیشن سے حذف کر دیا۔ یہ اشعار تعداد میں کل ۳۵ تھے ان میں سے چند ایک شعر درج کیے جاتے ہیں کہ یہ اندازہ ہو جائے کہ اقبال کس نوعیت سے حافظ کی تنقید کرتے ہیں:-

ہوشیار از حافظ صہبا گسار	جامش از زہر اجل سرمایہ دار
این ساقی خرقۂ پرہیزِ او	مے علاج ہول رستاخیز او
نیست غیر از بادہ در بازار او	از دو جام آشفتہ شد دستار او
آن فقیہہ ملت مے خوارگان	آن امام امت بے چارگان
گوسفند است و نوا آموخت است	عشوہ و ناز و ادا آموخت است
ضعف را نام توانائی دہد!	ساز او اقوام را اغوا کند!
حافظ جادو بیان شیرازی است	عرفی آتش بیان شیرازی است

۱۔ دیباچہ اسرار خودی، مشمولہ اقبال کے نثری افکار۔ عبدالغفار شکیل۔ ص ۸۶۔ ۸۹۔

این سوئے ملک خودی مرکب جہاند — آن کنار آب رکن آباد ماند
این قتیل ہمت مردانہ — آن ز زم زندگی بیگانہ
بادہ زن با عرفی ہنگامہ خیز — زندہ از صحبتِ حافظ گریز
محفل او درخور ابرار نیست — ساغر او قابلِ احرار نیست
بے نیاز از محفل حافظ گذر — الحذر از گوسفندان الحذر

اقبال جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے تصوف کے مخالف نہیں ہیں۔ البتہ انہیں چند ایک مسائل تصوف سے اختلاف تھا جن کی صوفیا قرآن سے حجت پیش کرتے تھے۔ اقبال کے نزدیک مسئلہ وحدت الوجود نہ تو قرآنی مسئلہ ہے اور نہ اسلامی تصوف کا جزو ہے۔ اپنے قیام یورپ کے دوران میں اقبال اس مسئلے کی تحقیق میں مصروف رہے۔ ٹرینٹی کالج کیمبرج سے انہوں نے ایک خط خواجہ حسن نظامی کو لکھا جس میں ان کی وساطت سے شاہ سلیمان پھلواری سے جو سوالات دریافت کئے۔ ان سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اس زمانے میں بھی وہ نظریہ وحدت الوجود کو قرآنی نظریہ تصور نہیں کرتے تھے۔ اس خط کے مندرجات ملاحظہ ہوں:۔

"اگر قاری صاحب موصوف کو یہ ثابت کرنا ہو کہ مسئلہ وحدت الوجود یعنی تصوف کا اصل مسئلہ قرآن کی آیات سے نکلتا ہے تو وہ کون سی آیات پیش کر سکتے ہیں اور ان کی کیا تفسیر کرتے ہیں؟ کیا وہ ثابت کر سکتے ہیں کہ تاریخی طور پر اسلام کو تصوف سے کیا تعلق ہے؟ کیا حضرت علی مرتضےٰ کرم اللہ وجہہ کو خاص پوشیدہ تعلیم دی گئی تھی؛ غرض کہ اس امر کا جواب معقولی اور منقولی اور تاریخی طور پر مفصل چاہتا ہوں۔ میرے پاس کچھ ذخیرہ اس کے متعلق موجود ہے مگر آپ اور قاری صاحب سے استصواب ضروری ہے۔" لہ

ـــــــ یہ خط ۱۹۰۵ء میں لکھا گیا ہے۔ شاہ سلیمان پھلواری کے نام اقبال کا ۹ مارچ ۱۹۱۶ء کا مکتوب بھی اس ضمن میں بڑا اہم ہے کہ اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اگرچہ ابتدا میں اقبال نے بھی نظریہ

لہ۔ اقبال نامہ۔ حصہ دوئم۔ ص ۳۵۳؛

وحدت الوجود کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ لیکن ان کے خیالات میں بتدریج تبدیلی واقع ہوتی گئی اور اُن میں یہ احساس پیدا ہوا کہ "یہ موضوع فلسفہ یا شاعری کا موضوع ہو سکتا ہے لیکن حقائق قرآنیہ میں اس کی قطعی طور پر کوئی گنجائش نہیں"[۱]۔ مذکورہ بالا خط کے درج ذیل جملے اس سلسلے میں بالکل غیر مبہم اور واضح ہیں:۔

"دیباچے کی بحث ایک علاحدہ بحث ہے اور وحدت الوجود کا مسئلہ اس میں ضمناً آگیا ہے اس مسئلے کے متعلق جو کچھ میرا خیال ہے وہ میں نے پہلے خط میں عرض کر دیا تھا۔ فارسی شعراء نے جو تعبیر اس مسئلے کی کی ہے اور جو نتائج اس سے پیدا ہوئے ہیں، ان پر مجھے سخت اعتراض ہے۔ یہ تعبیر مجھے نہ صرف عقاید اسلامیہ کے مخالف معلوم ہوتی ہے بل کہ عام اخلاقی اعتبار سے بھی اقوام اسلامیہ کے لیے مضر ہے۔ یہی تصوف عوام کا ہے اور شیخ علی حزیں نے بھی اسی کو مدنظر رکھ کر کہا تھا کہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است"[۲]۔

اسرار خودی اور رموز بے خودی کا دور اقبال کے یہاں وجودی تصوف کی شدید مخالفت کا دور ہے۔ اسرار ۱۹۱۵ء میں اور رموز ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۱۴ء میں امرتسر سے شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات بھی شائع ہو چکے تھے جن میں وحدت الشہود پر زور دیا گیا تھا، ان نظریات کا اقبال پر بہت گہرا اثر ہوا۔ اس دور میں اقبال نے نہ صرف وجودی مسلک کی مخالفت کی بل کہ بعض وجودی حضرات مثلاً مولانا جلال الدین رومی اور منصور حلاج کے نظریات کی نئی توجیہہ پیش کر کے انہیں وجودی دائرے سے باہر لانے کی کوشش بھی کی۔ خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں:۔

"حضرت! میں نے مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی کو بیداری میں پڑھا ہے اور بار بار پڑھا ہے، آپ نے شاید اس کو سکر کی حالت میں پڑھا ہے کہ اس میں آپ کو وحدت الوجود نظر آتا ہے۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سے پوچھئے وہ

---

[۱]۔ علامہ اقبال اور وحدت الوجود، حافظ عباد اللہ فاروقی۔ اقبال ریویو۔ کراچی شمارہ جنوری ۱۹۷۴ء۔ ص ۳۸+

[۲]۔ انوار اقبال۔ مرتبہ بشیر احمد ڈار۔ ص ۱۸۰، ۱۸۱، لاہور ۱۹۷۷ء+

اور تفسیر کس طرح کرتے ہیں۔ میں اس بارے میں انہیں کا مقلد ہوں۔" [1]

ایک جگہ اپنے وجودی نظریے کو ترک کر دینے کا صاف طور پر اعلان کرتے ہیں:۔

"مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں شرم نہیں کہ میں ایک عرصہ تک ایسے عقاید و مسائل کا قائل رہا جو بعض صوفیا کے ساتھ خاص ہیں اور جو بعد میں قرآن مجید پر تدبر کرنے سے قطعاً غیر اسلامی ثابت ہوئے، مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی کا مسئلہ قدم ارواح، مسئلہ وحدت الوجود یا مسئلہ تنزلات ستہ یا دیگر مسائل جن میں بعض کا ذکر عبدالکریم جیلی نے اپنی کتاب انسانِ کامل میں کیا ہے۔" [2]

خواجہ حسن نظامی کے نام ایک اور خط میں اپنے معتقدات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"۔۔۔ بل کہ مجھے ابھی سے یقین ہے کہ بالآخر آپ میرے ساتھ اتفاق کریں گے۔ میری نسبت بھی آپ کو معلوم ہے کہ مرا فطرتی اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی تیز ہو گیا تھا کیوں کہ یورپین فلسفہ بحیثیتِ مجموعی وحدت الوجود کی طرف رُخ کرتا ہے مگر قرآن میں تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا۔ اور اس مقصد کے لیے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک قلبی اور دماغی جہاد کرنا پڑا۔ میں شیخ محی الدین ابن عربی کی عظمت اور فضیلت دونوں کا قائل ہوں اور ان کو اسلام کے بڑے حکما میں سمجھتا ہوں۔ مجھے اُن کے اسلام میں بھی کوئی شک نہیں ہے کیوں کہ جو عقاید اُن کے ہیں (مثلاً قدم ارواح اور وحدت الوجود) انہوں نے ان کو فلسفہ کی بنا پر نہیں جانا بل کہ نیک نیتی سے قرآن حکیم سے مستنبط کیا ہے۔ پس ان کے عقاید صحیح ہوں یا غلط، قرآن کی تاویل پر مبنی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ جو تاویل انہوں نے

---

[1]، [2]۔ بحوالہ علامہ اقبال اور وحدت الوجود۔ حافظ عباد اللہ فاروقی، اقبال ریویو کراچی جنوری ۱۹۷۴ء۔ ص ۵۰، ۵۱

پیش کی ہے وہ منطقی یا معقولی اعتبار سے صحیح ہے یا غلط۔ اس لئے گو میں اُن کو ایک مخلص مسلمان سمجھتا ہوں مگر ان عقائد کا پیرو نہیں ہوں۔" لہ

نظریہ وحدت الوجود کو اقبال مسلمانوں کے حق میں سم قاتل سمجھتے تھے اور اُن کے خیال میں اسی تصور نے مسلمانوں سے قوت عمل چھین لی چنانچہ اسی بنا پر انہوں نے اس کی شدید مخالفت کی اور شیخ محی الدین ابن عربی اور اُن کے مویدین پر تلخ لہجے میں تنقید کی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے جس نے لمعات میں فصوص الحکم محی الدین ابن عربی کی تعلیمات کو نظم کیا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے فصوص میں سوائے الحاد اور زندقہ کے اور کچھ نہیں۔" ٹہ

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک خط میں جس کا حوالہ پہلے ہی دیا جا چکا ہے اقبال نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ لڑکپن میں ہی فصوص وغیرہ کے مضامین ان کے کانوں میں پڑنے شروع ہوئے تھے اور یہ کہ ان کے والد کو اس سے کمال توغل رہا تھا۔

اقبال تصوف کے اسی وقت مخالف بن جاتے ہیں جب تصوف میں فلسفیانہ موشگافیاں کی جاتی ہیں تصوف کو وہ عمل کے اخلاص کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور بس۔ مولانا اسلم جیراجپوری کو لکھتے ہیں۔

"تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے (اور یہی مفہوم قرون اولیٰ میں لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے ...... اور نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔" سہ

وحدت الوجودی نظریئے کے برخلاف اقبال نظریہ وحدت الشہود سے وابستہ تھے اور آخر دم تک وہ اسی مسلک پر قائم رہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے ان بزرگوں کے بارے میں بھی جن کا عقیدہ وحدت الوجود تھا

لہ، ٹہ۔ بحوالہ علامہ اقبال اور وحدت الوجود۔ حافظ عباد اللہ فاروقی۔ اقبال ریویو کراچی جنوری ۱۹۷۴ء ص ۳۱۔ ۵۱۔

سہ۔ اقبال نامہ۔ جلد اول۔ ص ۵۲۔

اقبال حسنِ ظن رکھتے تھے اور ان کا بڑا احترام کرتے تھے اور ان بزرگوں کا جب بھی ذکر کیا ہے ان کی دینی اور تصوف پر بے جا نکتہ چینی اور تنقید کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ محمد حسین عرشی اپنی ایک صحبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ایک صحبت میں، میں نے علامہ ابن جوزی کی "تلبیس ابلیس" کا ذکر کیا۔ اس میں مصنف نے کمال جرأت و بیباکی سے ابلیس کے ہتھکنڈوں اور مقدس مذہبی جماعتوں پر اس کے اثرات کی وضاحت کی ہے۔ اس ضمن میں صوفیا کے معائب بھی دل کھول کر بیان کئے ہیں۔ میں نے اس حصے کا کچھ ذکر کر کے علامہ کی رائے دریافت کی، آپ نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ میں نے کہا علامہ ابن تیمیہ کی روش بھی تصوف کے خلاف ابن جوزی سے کچھ کم نہیں۔ آپ نے اس پر بھی کچھ ایسے الفاظ ظاہر فرمائے جن کا خلاصہ یہ تھا کہ بعض لوگ حقیقت سے واقف نہیں ہوتے اور نظر بظاہر عیب چینی شروع کر دیتے ہیں۔"[1]

صوفیا سے اسی عقیدت کی بنا پر اور کچھ ان کی مجددانہ حیثیت سے متاثر ہو کر اقبال حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے زبردست معتقد تھے۔ بالِ جبریل میں انہیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند — اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات انہی دنوں شائع ہوئے جن دنوں اقبال اسرارِ خودی لکھ رہے تھے۔ مکتوبات میں شیخ سرہندی اپنے شہودی ہونے کا اقرار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مسئلہ توحید وجودی جس کے بارے میں میں پہلے متردد تھا اور فعلوں اور صفتوں کو اصل سمجھتا رہا جب حقیقت حال منکشف ہوئی تو تردد جاتا رہا اور ہمہ اوست کی جگہ ہمہ از وست کا پلہ بھاری رہا۔"[2]

وحدت الوجود میں جہاں سالک خدا کے سوا کسی کا وجود تسلیم نہیں کرتا وحدت الشہود میں اس کا مشہود صرف ایک ذات ہوتی ہے اور کائنات اسے نظر نہیں آتی۔ شیخ احمد سرہندی نے قرآنی استدلال سے بھی وحدت

---

[1] ملفوظات اقبال، مرتبہ محمود نظامی۔ ص ۵۳۔

[2] مکتوبات مجدد الف ثانی۔ ترجمہ محمد حسین، لاہور، ص ۴۶۔

الوجود کو غلط ثابت کیا اور اپنے کشف اور مشاہدے کی رو سے بھی۔ اپنے اس نظریے کے مطابق مجدد ذاتِ حق کو وراء الورا تسلیم کرتے ہیں جب کہ شیخ اکبر کائنات ہی کو خدا کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ شیخ مجدد سرہندی کا نظریۂ عبدیت اقبال کے اپنے مزاج اور فلسفے سے میل کھاتا ہے وہ نہ صرف اس کا اثبات کرتے ہیں بل کہ اسے اپنے فلسفے کا مرکزی تصور قرار دیتے ہیں۔ شیخ مجدد الف ثانی نے علمِ ظاہر اور باطن کا رُخ پھیر دیا اور براہِ راست حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی کو دین قرار دیا۔ ان کے نزدیک تصوف فقط تزکیہ اخلاق میں مدد دیتی ہے اور ایمان بالغیب ہی حق ہے۔ اتباعِ سنت ہی ارتقائے روحانی کی منزلِ آخر ہے[1]۔ اقبال بھی حضرت محمد سے وابستگی کو دین کی اساس سمجھتے ہیں۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

عشق رسول صلعم کو اقبال ایمان کا جزو لازم سمجھتے ہیں اور بقولِ ان کے مسلمان کو حقیقی عزت و آبرو اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب کہ وہ رسول اللہ صلعم سے محبت کرتا ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں۔

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروی ما ز نامِ مصطفیٰ است

اقبال کا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اب تک زندہ ہیں اور لوگ اب بھی آپ سے اسی طرح فیضیاب و مستفیض ہیں جس طرح صحابۂ کرامؓ ہوا کرتے تھے۔ چناں چہ نیاز الدین خان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میرا عقیدہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور اس زمانہ کے لوگ بھی اسی طرح مستفیض ہو سکتے ہیں جس طرح صحابہؓ ہوا کرتے تھے لیکن اس زمانہ میں تو اس قسم کے عقائد کا اظہار بھی اکثر دماغوں کو ناگوار ہوگا۔ اس واسطے خاموش رہتا ہوں۔"[2]

غرض عشق اقبال کے نزدیک اس قدر اہم ہے کہ اسلام کی تکمیل کا انحصار اسی پر ہے۔ ایک صاحبِ عشق کافر کا کفر بھی اسلام کا درجہ رکھتا ہے اور اگر مسلمان عشق کے جذبے سے عاری ہے تو اس کا اسلام بھی کفر کے برابر ہے۔

[1] حضرت مجدد کا نظریۂ توحید۔ ڈاکٹر برہان الدین احمد۔ ص ۹۱ [2] مکاتیب اقبال۔ لاہور۔ ص ۴۰

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی ! نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

خودی کے استحکام کے لیے اقبال عشق کو ایک ضروری عنصر سمجھتے ہیں اور عشق کی غایت کو وحدت الوجودیوں کے برخلاف وصال کے بجائے فراق گردانتے ہیں کہ اس طرح سے فرد اپنی خودی کی حفاظت کر سکتا ہے اور جزکل میں ضم ہونے سے بچا رہتا ہے۔ عشق و محبت کے عالم میں اگر فرد اپنی خودی کو گم کر دے اور اپنے آپ میں نہ رہے تو عمل کی دشوار گزار منزلیں طے کرنا اس کے لیے قریب قریب ناممکن ہو جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک "سکر" یے خودی، اختتام سفر کے بعد طاری ہو تو مفید ہے۔ چناں چہ مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:۔

کیفِ باطن میں بالخصوص آج کل "صحو" ہی کی ضرورت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کی تربیت اسی حال میں کی تھی۔ "سکر" کی حالت عملی کی دشوار گزار منزل کو طے کر لینے کے بعد ہو تو مفید ہے۔[1]

اقبال انسانی عظمت اور شرافت کو اجاگر کرنے کے لیے انسانی خودی کے مستقل وجود کے قایل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "فنا" اور "بقا" کی عام صوفیانہ تعبیر سے وہ متفق نہیں تھے۔ اقبال کے نزدیک "فنا" اور "بقا" ذاتِ الٰہی میں نہیں بل کہ احکامِ الٰہی کی مکمل پابندی میں ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

" حقیقی اسلامی خودی میرے نزدیک اپنے ذاتی اور شخصی میلانات، رجحانات و تخیلات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہ اس پابندی کے نتائج سے انسان بالکل لاپرواہ ہو جائے اور محض رضا و تسلیم کو اپنا شعار بنائے۔ یہی اسلامی تصوف کے نزدیک فنا ہے۔"[2]

یہی بات وہ مولوی ظفر احمد صدیقی کو بھی ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

" جب احکامِ الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو جائے،

---

[1] اقبال نامہ۔ حصہ اوّل۔ ص۔ ۱۰۰ ۔ [2] اقبال نامہ۔ حصہ دوم۔ ص۔ ۶۰ ۔

تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیائے اسلام نے فنا کہا ہے بعض نے اسی کا نام 'بقا' رکھا ہے۔" [۱]

احکامِ الٰہی کے برعکس خدا تعالیٰ کی ذات میں فنا ہونے کے متعلق وہ لکھتے ہیں:-

"دوسری وہ بے خودی ہے جو بعض صوفیائے اسلامیہ اور تمام ہندو جوگیوں کے نزدیک ذاتِ انسانی کو ذاتِ باری میں فنا کر دینے سے پیدا ہوتی ہے اور یہ فنا ذاتِ باری میں ہے، نہ احکام باری تعالیٰ میں۔" [۲]

اس طرح کی بے خودی یا فنا کو وہ مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے نہایت مُضر بتاتے ہیں۔ اور فنا اور بے خودی کی اس 'وحدت الوجودی' تعبیر کو وہ بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک [۳] سمجھتے ہیں چناں چہ اس تفسیر کے خلاف انہوں نے بغاوت کی۔

نظریۂ انسانِ کامل:- اقبال نے جس بُلند آہنگی کے ساتھ نظریۂ وحدت الوجود کی مخالفت کی اور خودی کا جو معرکتہ الآرا نظریہ پیش کیا، اس سے یقیناً تصوف کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ اس ضمن میں ان کا نظریہ انسان کامل بھی ہے اور چند اکابر صوفیا کی طرح انہوں نے بھی اس نظریے کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے اس کی تشکیل میں ایک اہم رول ادا کیا۔ اس سے قبل جن صوفیا نے یہ نظریہ پیش کیا، وہ سبھی وحدت الوجودی تھے، اس لئے اس نظریئے کی بنیاد بھی انہوں نے اسی وجودی مسلک ہی پر رکھی۔ ان میں محی الدین ابن عربی اور ان کے شاگرد عبدالکریم جیلی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اقبال نے انسان کامل کا جو تصور دیا، وہ ان کے نظریۂ خودی کا ایک لازمی نتیجہ تھا۔ وحدت الوجودیوں نے انسان کا ذاتِ خداوندی سے اتحاد و اتصال پیدا کر کے 'انسانِ کامل' کا نظریہ پیش کیا، اس کے برعکس اقبال نے انسان کی ہستی کو خدا کی ہستی سے الگ قائم کیا۔ اس کو عشق و محبت سے مستحکم کر کے تخلقوا باخلاق اللہ کی رو سے صفاتِ الٰہیہ سے متصف کرنے کی تلقین کی اور انسانی خودی کو ایک لائحہ عمل کے ماتحت تربیت دے کر انسان کامل کا نظریہ پیش کیا۔ منزل اگرچہ دونوں کی ایک ہے تاہم اس منزل تک پہنچنے کا راستہ اقبال کے

---

[۱]، [۲]، [۳]۔ اقبال نامہ حصہ اول و حصہ دوئم۔ ص ۲۰۲، ۶۰، ص ۶۲-۶۴۔

یہاں جدا گانہ ہے۔ اقبالؔ نے اسرارِ خودی میں اس بات کو منظم طریقے سے پیش کیا ہے۔ انسانِ کامل کے رتبے پر فائز ہونے کے لیے اقبالؔ نے جو تین مراحل بیان کئے ہیں۔ ان میں اطاعت پہلا مرحلہ ہے۔ قرآن مجید میں بھی آیا ہے:۔

یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم[۱] (اے ایمان والو اطاعت کرو تم اللہ کی اور اطاعت کرو تم رسولؐ کی اور تم میں سے جو صاحب امر ہے) دوسری جگہ قرآن حکیم میں آیا ہے: تلک حدود اللہ ومن یطع اللہ ورسولہ یدخلہ جنت تجری من تحتہا الانہار خالدین فیہا وذالک الفوز العظیم[۲]۔ (یہ اللہ کی حدود ہیں اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا۔ اللہ اس کو ایک ایسی بہشت میں داخل کرے گا جس کے نیچے سے نہریں جاری ہیں اس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔)

ان آیتوں سے اطاعت کا مطلب خدا اور اس کے رسولؐ اور احکامِ الٰہی کی اطاعت ہے۔ اطاعت کے سلسلے میں اقبالؔ اونٹ کی مثال پیش کرتے ہیں۔ بقول اُن کے یہ جانور اپنی طبع میں مطیع فرمانبردار اور محنت شعار ہوتا ہے۔ شتربان اسے جدھر چلاتا ہے بے چون وچرا صبر و استقلال کے ساتھ اطاعت کرتا ہے۔ انسان کو بھی چاہیئے کہ اسی طرح خدا، اس کے رسولؐ اور احکامِ الٰہی کی اطاعت کرے، اس لئے کہ اطاعت اور فرمان پذیری ہی سے وہ کمال کے درجے تک پہنچ سکتا ہے۔

دوسرا مرحلہ ضبطِ نفس ہے۔ اس مرحلے میں اقبالؔ اسلام کے ارکانِ خمسہ کی پابندی کو لازمی قرار دے کر ان ارکان کے مقاصد اور فوائد بیان کرتے ہیں، ان ارکانِ خمسہ کی پابندی ہی سے ضبطِ نفس یعنی حصولِ کمال کا دوسرا مرحلہ طے ہوجاتا ہے۔

پختہ محکم اگر اسلامِ تست[۳] ۔۔۔ این ہمہ اسبابِ استحکامِ تست

تیسرا مرحلہ نیابتِ الٰہی کا ہے اور اس مرحلہ پر پہنچنے کے بعد انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کا مستحق ہوجاتا ہے اور انی جاعل فی الارض خلیفۃ (بے شک میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں)،

۱۔ ۴۔۶۲۔ ۲۔ ۴۔۱۷۔ ۳۔ ایضاً۔ اسرار و رموز۔ (طبع سوئم ۱۹۴۸ء) ص ۔ ۴۴، ۴۸

کی قرآنی صداقت کا صحیح معنوں میں احساس کر سکتا ہے۔ اور جو نیابت الٰہی اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کا مستحق ٹھہرتا ہے وہی انسان کامل ہے۔

انسان کامل کا مرتبہ بہت ہی بلند ہے۔ یہ دراصل انسان کے رُوحانی ارتقا کا خلاصہ ہے۔ حیات مدتوں مسلسل جدوجہد کرتی ہے تو کہیں جا کر ایک انسان کامل پیدا ہوتا ہے۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں[1]

—— یہ دانائے راز حقیقت محمدیہ کی صورت میں جلوہ گر ہو چکا ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں۔

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت
تا چراغ یک محمدؐ بر فروخت[2]

اقبال بھی دیگر صوفیا کی طرح اس بات کے قائل تھے کہ حضرت محمدؐ چونکہ خاتم الانبیاء ہیں۔ اس لئے انسان کامل کا پیدا ہونا ہر دور میں لازمی ہے۔ پروفیسر نکلسن کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

"انسان کامل کے بغیر دنیا میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔ لیگیں، پنچایتیں اس مقصد کے لیے قطعی ناکافی ہیں۔ آئے دن اس قسم کی لیگیں اور پنچایتیں برابر ناکام ثابت ہو رہی ہیں۔"[3]

انسانِ کامل کی پیدائش سے قبل انسانیت کے لیے جسمانی اور رُوحانی حیثیتوں سے مدارج ارتقا کا طے کرنا شرط ہے۔ وہ ابھی ہمارے لئے ایک نصب العین ہے۔ اِس زمانے میں خارج میں اس کا کہیں وجود نہیں[4]۔ البتہ انسانیت کے تدریجی ارتقا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل میں ایک ایسی قوم پیدا ہو گی جس افراد کم و بیش ایسے یکتا ہوں گے کہ وہ انسانِ کامل بھی انہی میں پیدا ہو گا۔[5] چنانچہ وہ اس کے ظہور کے شدت سے متمنی ہیں:۔

---

[1]۔ زبور عجم۔ (۱۹۴۸ء) ص۔ ۱۰۳ ۔ [2]۔ اسرار و رموز۔ ص ۱۳۔
[3]۔ مکتوب بنام پروفیسر نکلسن اقبال نامہ جلد اول۔ ص ۴۵۷۔ ۴۷۴۔
[4]۔ مقدمہ اسرار خودی (انگریزی ترجمہ) نکلسن۔ ص XXVIII
[5]۔ اسرار و رموز۔ ص ۵۱۔

اے سوارِ اشہب دوراں بیا | ای فروغ دیدۂ امکاں بیا
رونق ہنگامۂ ایجاد شو | در سواد دیدہ ہا آباد شو
شورشِ اقوام را خاموش کن | نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن
باز در عالم بیار ایام صلح | جنگجویان را بدہ پیغام صلح [۱]

اقبالؔ کے عقیدے کے مطابق انسان کے اندر خدا کا نائب بننے کی صلاحیت بدستور موجود ہے اور اس کی بین دلیل خدا کا قول ۔ انی جاعل فی الارض خلیفہ (بے شک میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں) ہے۔

دُنیا میں انسانِ کامل خدا کا نائب اور انسانیت کا حکمران ہوگا۔ اس کی وجہ سے دوسروں کو دولتِ حیات ملے گی۔ جس قدر انسان ارتقاء کے مدارج طے کرتا جائے گا، اسی قدر وہ کمال کے درجہ تک پہنچتا جائے گا۔ [۲]

انسان کامل دراصل کامل ترین خودی ہے۔ ارتقائی مدارج کے طے کرنے میں جتنی بھی مشکلیں اور صعوبتیں پیش آئیں وہ صرف اسی نصب العین کے حصول کی خاطر گوارا ہو سکتی ہیں۔ انسان کامل موجودہ انسان کی رُوحانی اور جسمانی معراج کمال ہوگا۔ اس میں زندگی کی متضاد قوتیں باہم گر ہوں گی اور اس کے اندر علم اور قوت اپنے انتہائی مدارج کے ساتھ موجود ہوگا۔ [۳] انسان کامل تمام کائنات پر محیط ہوگا۔ بقولِ اقبال :۔

مومن کی یہ پہچان کہ گُم اس میں ہیں آفاق

مولانا رومی نے اپنی مثنوی میں پیغمبر اسلام صلعم کی حیات طیبہ کا ایک واقعہ بیان کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کامل کائنات میں گم نہیں ہو سکتا بلکہ کائنات خود اس کے اندر گم ہو جاتی ہے۔ آنحضرت

۱۔ اسرار و رموز۔
۲، ۳۔ مقدمہ اسرار خودی (انگریزی ترجمہ) نکلسن۔ ص۔ XXVII

کی رضاعی ماں حلیمہ سعدیہ ایک روز آپؐ کے ایام طفولیت میں آپؐ کو لے کر بیابان کی طرف گئی ہوئی تھی کہ اچانک آپؐ گم ہوگئے۔ حلیمہ آپؐ کو نہ پاکر بہت پریشان ہوئیں اور آپؐ کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑیں لیکن غیب سے یہ آواز آئی:-

غم مخور یاوہ نہ گردد او ز تو — بلکہ عالم یاوہ گردد اندر و[۱]

——اقبالؔ کہتے ہیں کہ "میں (انسان کامل کے متعلق) اس سے بڑھ کر کہتا ہوں۔"[۲]

در رضایش مرضیٔ حق گم شود — این سخن کے باور مردم شود[۳]

——انسان کامل کے اندر وہ قوّت موجود ہے جس کی رُو سے وہ نہ صرف کائنات کو اپنے اندر جذب کرتا ہے بلکہ خود خدا کو بھی اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں:-

مسلم استی دل باقلیمی مبند — گم مشو اندر جہان چون و چند
می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم — در دل او یاوہ گردد شام و رُوم
دِل بدست آور کہ در پنہائی دِل — می شود گم این سرائی آب و گِل[۴]

انسانِ کامل کی ہمہ گیر فطرت کے متعلق اقبالؔ نے 'مردِ مسلمان' کے عنوان سے ایک پرزور نظم لکھی ہے، جو 'ضربِ کلیم' میں شامل ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک انسان کاملؔ انسانیت کا نجات دہندہ ہے اِس جلیل انسان کی خودیٔ اقبالؔ کے الفاظ میں مظاہر کائنات میں گویا ایک NUCLEUS کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور سارا عالم اس کی ذات کے گرد گھومنے لگتا ہے۔ اقبالؔ کے الفاظ میں مردِ مومن کا اِرادہ خدا کا اِرادہ ہو جاتا ہے اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہوتا ہے اور اس کا کلام خدا کا کلام

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے کہ اقبالؔ کے انسان کامل کا ماخذ قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید نے

---

[۱] مثنوی مولانا رومی۔ دفتر چہارم۔ ص ۲۳۱ء
[۲] مقدمہ اسرارِ خودی (انگریزی ترجمہ) نکلسن ص XX
[۳] اسرارِ رموز۔ ص ۷۰ (اس شعر میں دوسرا مصرعہ مولانا رومی کا ہے)ء
[۴] ایضاً ص ۱۳۰-۱۳۱ء

جسے زمین پر خدا کا خلیفہ بنایا، وہی انسان کامل ہے۔ دنیا میں وہ انسان کامل آنحضرت صلعم کی ذات گرامی تھی۔ دوسروں کو یہ درجہ صرف آپ کے فیض اور کامل اطاعت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے:۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (۲۱:۳۳)

(رسول اللہ صلعم کی ذات میں تمہارے لئے بہترین نمونہ موجود ہے) اس کے علاوہ اقبال اس نظریے کی تشکیل میں شیخ محی الدین ابن عربی اور عبد الکریم جیلی کے نظریۂ انسان کامل سے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ گو یہ صحیح ہے اقبال کا نقطۂ نظر ان دونوں سے مختلف ہے۔ اس نظریہ کے سلسلہ میں اقبال نے مولانا رومی سے بھی اثر لیا ہے۔ مولانا رومی کے یہاں انسانِ کامل کا تخیل موجود ہے۔ مولانا رومی کا یہ عقیدہ تھا کہ رسول اللہ صلعم کے بعد اور کوئی نبی نہیں آئے گا اور اس لئے انسان کی روحانی تشنگی اور متقضیات کو مٹانے کے لیے ایک ایسے انسان کی ضرورت ہے جو انسانِ کامل ہو۔ اسی مقصد کے پیش نظر وہ تلقین کرتے ہیں:۔

مکر کن در راہ نیکو خدمتی تا نبوت یابی اندر اُمتی [۱]

انسان کامل کے نظریہ کے بارے میں کچھ لوگوں کو غلط فہمی بھی ہوئی، وہ اسے نطشے کے نظریۂ 'فوق البشر' سے ماخوذ سمجھتے تھے یا کم از کم ان کا خیال تھا کہ اقبال اس معاملے میں نیٹشے سے متاثر تھے اس اعتراض کا جواب اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کے نام ایک خط میں دیا ہے جس کا حوالہ ہم پہلے بھی دے چکے ہیں تاہم یہاں اس خط کے متعلقہ جملوں کو دوبارہ نقل کیا جا رہا ہے:۔

"وہ (مسٹر ڈکنسن جنہوں نے یہ اعتراض کیا تھا) انسانِ کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے خلط مبحث کر کے میرے انسان کامل اور جرمن مفکر کے 'فوق الانسان' کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔ میں نے آج سے تقریباً بیس برس قبل انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو نیٹشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا نہ اُس کی

---

[۱] مثنوی مولانا رومی۔ دفتر پنجم۔ ص ۲۸۶ (اس شعر میں نبوت سے مراد نیابت الٰہی ہے)۔

کتابیں میری نظروں سے گزری تھیں۔"[1]

اس ضمن میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی رائے پر اس بحث کو ختم کیا جاتا ہے۔ خلیفہ لکھتے ہیں:-

"جہاں تک افکار کا تعلق ہے، اس نے (اقبال نے) نہ رومی کا کامل تتبع کیا ہے نہ نیٹشے کا، نہ برگساں کا اور نہ کارل مارکس یا لینن کا۔ اپنے تصورات کا قالین بنتے ہوئے اس نے رنگین دھاگے اور بعض خاکے ان لوگوں سے لئے ہیں لیکن اس کے مکمل قالین کا نقشہ کسی دوسرے کے نقشہ کی ہو بہو نقل نہیں ہے۔ اپنی تعمیر کے لیے اس نے ان افکار کو سنگ و خشت کی طرح استعمال کیا ہے۔"[2]

تصوّرِ زمان و مکان:- زمان و مکان کا سائنسی اور فلسفیانہ مسئلہ ان مسائل میں سے ایک ہے جن پر اقبال نے غور و فکر کیا ہے۔ چنانچہ ان کے کلام خطبات اور دیگر متفرق تحریروں میں جا بجا اس مسئلے کی توضیح و تشریح ملتی ہے۔ خطبات کا معتدبہ حصہ اسی مسئلے کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت پر مبنی ہے۔ اسی مسئلے کی روشنی میں اقبال نے مذہب اور الٰہیات کے متعدد اصولوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اقبال کے نزدیک زمان و مکان کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے چنانچہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے ایک خطبے میں کہتے ہیں:-

"دوسری طرف اسلامی تہذیب کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خالص ذہنی مسائل ہوں یا مذہبی نفسیات یعنی اعلیٰ تصوف کے مسائل ہوں سب کا نصب العین اور مقصود یہی ہے کہ لامحدود کو محدود کے اندر سمو لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جس تہذیب کا یہ مطمحِ نظر ہو اس میں زمان و مکان کا سوال درحقیقت زندگی اور موت کا سوال ہے۔"[3]

اقبال جدید سائنس کے اصولوں کا کما حقہ مطالعہ فلسفے اور مذہب کے بنیادی مسائل کی تفہیم کے لیے لازمی سمجھتے تھے۔ زمان و مکان اور علیت کے مسائل ان کے نزدیک بنیادی اور اہم مسائل ہیں کہ

۱۔ مکتوب بنام پروفیسر نکلسن، مشمولہ مضامین اقبال، ص ۶۳۔

۲۔ اردو، اقبال نمبر ۱۹۳۸ء، ص ۸۳۱۔ ۳۔ خطبات — ص ۱۸۴۔

بغیر ان کے الہیات کی تشکیل نہیں کی جاسکتی۔ لکھتے ہیں:-

"قرونِ وسطیٰ سے لے کر موجودہ زمانے تک انسانی تخیل اور تجربے نے ناقابل بیان ترقی کی ہے۔ نیچر پر انسان کا تسلط اور اقتدار بہت بڑھ گیا ہے۔ اس تسلط نے انسان میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور اس امر کا ایقان پیدا کر دیا ہے کہ وہ کائنات میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور درحقیقت "اشرف المخلوقات" ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمان و مکان اور علمیت کے بارے میں انسانی ذہن بہت آگے نکل گیا ہے۔ سائنس کی جدید ترقیوں نے ہماری ذہنی صلاحیتوں میں تدریجی طور پر ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت نے کائنات کے ایک جدید تخیل کو ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے اور ہمیں اس قابل بنا دیا ہے کہ ہم فلسفے اور مذاہب کے اکثر اہم مسئلوں کو ان جدید تصوروں کی روشنی میں دیکھیں اور ان کی مدد سے حل کریں۔" [۱]

قبل اس کے کہ ہم زمان و مکان کے متعلق اقبال کے خیالات پیش کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے کے بارے میں حکمائے یونان اور مفکرین اسلام کے تصورات کا مختصر سا جائزہ لیا جائے کہ اس پس منظر کے بغیر اقبال کی پیش رفت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یونانی فلسفی اور مفکر اس بات پر زور دیتے تھے کہ کائنات سکونی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس میں یونانی نقطوں کی جیومیٹری اور سکونیات کے علم سے آگے نہ بڑھ سکے۔ افلاطون نے اپنی کتاب TIMAEUS میں مکان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کے مطابق نیچر کو ٹھوس اشیا کا ایک مجموعہ سمجھا گیا جس کے درمیان ایک خلاء ہے جس کی کوئی شکل صورت یا خاصیت نہیں۔ افلاطون کا یہ بھی خیال تھا کہ مکان کوئی خارجی مطلق شے نہیں بلکہ اس کا مقصد محض یہ تھا کہ وہ مختلف مادی اشیا کی ترتیب کے لیے ایک واسطے کا کام دے۔ [۲]

ایک دوسرے یونانی فلسفی زینو (ZENO) کا خیال تھا کہ فضا ایک لامتناہی درجے تک قابل تقسیم ہے

---

[۱] خطبات۔ ص۔ ۱۰۱ [۲] ملاحظہ ہو TIMAEUS کا انگریزی ترجمہ از ٹیلر صفحات ۹۴ تا ۱۰۵

ہے یعنی فضا کے کسی حصے کو جس قدر چاہیں چھوٹے اجزا میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اسی بنا پر اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فضا میں حرکت ایک فریبِ نظر ہے کیوں کہ یہ ناممکن ہے کہ کسی محدود وقت میں لامحدود نقطے طے کیے جا سکیں۔ حرکت کو اس طرح غیر حقیقی تصور کرنے سے فضا کے خارجی مستقل بالذات وجود کی نفی ہو جاتی ہے۔ زینو کے نزدیک زمان لامحدود آنوں (INSTANTS) اور مکان لامحدود نقطوں سے مل کر بنا ہے۔

مسلمان مفکرین میں جن لوگوں نے زمان و مکان کے مسائل پر غور و فکر کیا۔ ان میں الاشعری، ابن حزم، طوسی اور عراقی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اشاعرہ نے زمان و مکان کی لامحدود تقسیم پذیری کے یونانی تصور کو رد کیا۔ ان کے مطابق زمان، مکان اور حرکت ایسے نقطوں اور آنوں پر مشتمل ہوتے ہیں جن کی مزید تقسیم نہیں ہو سکتی۔ گویا زمان و مکان کے متعلق اشاعرہ کا تصور ایک طرح کا کوانٹم (QUANTUM) تصور ہے۔ اس تصور کی مدد سے انھوں نے زینو کے اس خیال کی تردید کی کہ حرکت ناممکن ہے۔

ابن حزم نے اشاعرہ کے اس سالمی تصور کی تردید کی کیوں کہ ان کی رائے میں وقت کے اس تصور کو مان کر ہم زینو کے اس تصور کو رد نہیں کر سکتے کہ حرکت ناممکن ہے۔ ابن حزم کے نزدیک زمان اور مکان مسلسل ہیں۔ ملا جلال الدین دوانی اور صوفی شاعر عراقی نے وقت کا ایک اضافی تصور لیا ہے۔ مختلف ہستیوں کے لیے جو خالص مادیت سے لے کر خالص روحانیت تک مختلف مدارج رکھتی ہیں زمان کی نوعیت مختلف ہے۔ مادی اشیا کے لیے وقت آسمانوں کی گردش سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کو ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت کی نوعیت اس قسم کی ہے کہ جب تک ایک دن ختم نہیں ہو جاتا دوسرا دن شروع نہیں ہوتا۔ غیر مادی ہستیوں کے لیے یہی ترتیب اور تسلسل موجود ہے لیکن وقت کا بہاؤ ایسا ہے کہ جو مدت مادی ہستی کے لیے ایک سال کی ہے وہ غیر مادی ہستی کے لیے ایک دن سے زیادہ نہیں۔ غیر مادی ہستیوں کے پچھلے طبقوں کو درجہ بدرجہ طے کر کے آخر میں ہم ربانی یا الٰہی وقت پر پہنچتے ہیں جو بہاؤ کی خاصیت سے بالکل مبرا ہے اور اس لئے اس میں نہ ترتیب ہے نہ تقسیم اور نہ تغیر۔ یہ وہم سے بھی بالاتر ہے اور اس کا نہ آغاز ہے نہ انجام۔ یہی وہ وقت ہے جس کو قرآن کریم نے 'اُم الکتاب' کا لقب دیا ہے اور جس میں ساری تاریخ عالم علت و معلول کے سلسلے سے آزاد ہو کر ایک

مافوق الدّوام 'اب' (ETERNAL NOW) میں سماجاتی ہے۔

اقبالؔ نے اپنے خطبات میں ان تمام تصورات کا جائزہ لیا ہے جو افلاطون سے لے کر آئن شٹائن تک پیش کیے گئے ہیں اور ان کی افہام و تفہیم کے علاوہ جہاں کہیں انہیں کسی قسم کی خامی نظر آئی ہے اسے بھی واضح کر دیا ہے۔ بعض جگہ ان کے اعتراضات غلط فہمی کا نتیجہ ہیں، مثلاً نظریۂ اضافیت کے اگرچہ اقبالؔ بحیثیت مجموعی قائل تھے تاہم اس پر ان کا ایک اعتراض بھی ہے۔ یہ اعتراض اس نظریے سے متعلق ایک غلط فہمی کی بنا پر تھا جو عام طور پر غیر ریاضی دانوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ دوسرے فلسفیوں کی طرح اقبالؔ نے بھی یہ خیال کیا کہ نظریہ اضافیت نے وقت (زمان) کی حقیقت اور واقعیت کو فنا کر دیا ہے اور وقت کو ایک چوتھی سمت بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ اس طرح سے مستقبل ایک مقرر کردہ چیز بن جاتی ہے جو اسی طرح معین ہے جیسے کہ ماضی۔ اس طرح زمان کی تخلیقی حرکت باقی نہیں رہتی اور کائنات میں تقدیر اور جبر کا دَور دَورہ ہو جاتا ہے۔ نظریۂ اضافیت کا یہ تصور جو فلاسفہ اور ان کے ساتھ اقبالؔ نے لیا ہے صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح زمان کے دَوران کے متعلق برگساں کا جو نظریہ ہے اور خارجی دُنیا اور ہماری روزمرہ زندگی میں رونما ہونے والے تغیروں کے متعلق اس کا جو تصور ہے اس سے اقبالؔ متفق ہیں لیکن برگساں کے نزدیک حرکت اور تغیر ہی اصل حقیقت ہیں جس سے ہمیں زمان کا احساس ہوتا ہے فعلیت کو ظہور افعال سے قبل ان کا علم نہیں ہوتا اور نہ ان کے ظہور میں کسی ایسی مشیّت کو دخل ہوتا ہے۔ اقبالؔ کا اعتراض اس پر یہ ہے کہ فعلیت مطلقہ بے مقصد اور مبہم نہیں بلکہ با مقصد اور ارادہ سے متصف ہے۔

اقبالؔ نے اپنے خطبات میں مسئلہ زمان و مکان کے ہر پہلو سے بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ اپنی شاعری میں کئی نظموں میں اس نے زمان و مکان کی حقیقت کو واضح کیا ہے۔ چنانچہ مسجدِ قرطبہ کے ایک بند میں وہ کہتا ہے کہ زندگی زمان کے مسلسل تغیر و حرکت کا دوسرا نام ہے:

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات — سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات

سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ — جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں — جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا ایک زمانے کی رَو جس میں دن ہے نہ رات

'جاوید نامہ' میں زمان و مکان کا فرشتہ زروان اقبال پر یہ حقیقت آشکار کرتا ہے کہ ساری تدبیر زمان کی تقدیر کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ زندگی موت اور حشر سب زمان ہی کی حرکتیں ہیں انسان، فرشتے اور کائنات سب زمان میں واقع ہوئے ہیں۔

گفت زروانم جہان را قاہرم
ہم نہانم از نگہ ہم ظاہرم!
بستہ ہر تدبیر با تقدیرِ من
ناطق و صامت ہمہ نخچیرِ من
غنچہ اندر شاخ من بالد ز من
مرغک اندر آشیاں نالد ز من
من حیاتم، من مماتم، من نشور
من حسابِ دوزخ و فردوس و حور
آدم و افرشتہ در بندِ من است
عالمِ شش روزہ فرزندِ من است
ہر گلے کز شاخ می چینی منم
اُم ہر چیزے کہ می بینی منم

'اسرار خودی' میں اقبال نے امام شافعیؒ کے مشہور مقولہ 'الوقت سیف' کی تعبیر کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ ایسی شمشیرِ براں ہے کہ جس کے ہاتھ میں ہو اس کی قدرت حضرت موسیٰؑ کی قدرت سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہی شمشیرِ روزگار حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ میں بھی تھی جس سے آپ نے خیبر فتح کیا تھا۔ جو شخص زمانے کو محض دن اور رات کی تعداد سے ناپتا ہے گمراہی میں ہے اور زمانے کی اصل حقیقت سے ناواقف ہے:۔

اے اسیرِ دوش و فردا درنگر
در دلِ خود عالمِ دیگر نگر!
در گلِ خود تخمِ ظلمت کاشتی
وقت را مثلِ خطے پنداشتی

جو شخص زمانے کی حقیقت سے واقف نہیں وہ حیاتِ جاوداں سے بھی آگاہ نہیں ہے۔

باز با پیمانۂ لیل و نہار
فکرِ تو پیمود طولِ روزگار
تو کہ از اصلِ زمان آگاہ نہ ای
از حیاتِ جاوداں آگاہ نہ ای

'بالِ جبریل' میں ایک نظم 'زمانہ' کے عنوان سے ہے جس میں وقت اپنی صفات کا اظہار خود

اپنی زبان بیان کیا ہے۔ اس میں فاعل انا کے تسلسلی وقت کا ذکر بھی ہے کہ حوادث و واقعات یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہوتے ہیں لیکن اصل زمان یہ تسلسلی وقت نہیں ہے بلکہ اصل زمان میں خود زندگی اور تقدیر مضمر ہیں۔ جس شخص کی نظر عارفانہ نہیں ہے وہ اصلِ زمان سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ
میرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی نہیں ہے
ہدف سے بے گانہ تیر اس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ

'پیام مشرق' میں 'نوائے وقت' والی نظم اقبال کے نظریہ زمان کو زیادہ واضح طور پر پیش کرتی ہے طبیعیاتی وقت جو زمان و مکان مسلسل کی ایک سمت ہے، اضافی ہے لیکن اصل زمان کو قرآن کریم نے وحدت او کلیت قرار دے کر تقدیر کے نام سے موسوم کیا ہے۔ تقدیر محض زمان کا نام ہے جبکہ اس کو امکانات کے ظہور سے پہلے دیکھا جائے۔ جب اس کو تواتر اور تسلسل کے قید و بند سے آزاد کر دیا جائے۔ یہ وقتِ محض یکساں آنات کا اعادہ نہیں ہے بلکہ اس کا لمحہ لمحہ بالکل نیا اگانے حقیقی وقت میں وجود رکھنا تسلسلی وقت کی جکڑ بندیوں سے آزادی کے مترادف ہے۔ انسان سے مخاطب ہو کر وقت کہتا ہے کہ میری اصل حقیقت کو معلوم کرنے کے لیے تو خود اپنے اندر دیکھ کر میں تیری جان ہوں۔ میں شہر بیابان، جھونپڑی اور محل ہر جگہ پر چھایا ہوا ہوں۔ میں موت کے گھاٹ بھی اُتارتا ہوں اور زندگی بھی بخشتا ہوں۔ دوزخ و جنت میرے ہی دو بہروپ ہیں۔ میں ساکن بھی ہوں اور متحرک بھی۔ میرے امکانات کی کوئی حد نہیں۔ ابھی سینکڑوں کائنات میرے ضمیر میں پوشیدہ ہیں۔ میں انسان کا لباس بھی ہوں اور یزدان کا پیراہن بھی۔ تو صرف تدبیر کر سکتا ہے۔ میں تقدیر ہوں۔ مجھ میں تیرا راز اور تجھ میں میرا راز پوشیدہ ہے۔ میں تیرے شعور سے نکلتا ہوں اور تیرے

اسی شعور میں ختم ہو جاتا ہوں کیوں کہ منتہا اور مقصود تو ہی ہے۔ ساری کائنات میں تیرے ہی دم سے گرمیِ محفل ہے۔ اگر تو مقامِ دل کو پا جائے تو ساری کائنات تجھ میں سما جاتی ہے اور تیری بلند اچگیوں سے میرے دریا میں بھی طوفان اٹھتے ہیں۔ یہ تھا اقبال کا تصورِ زمان و مکان ان کے خطبات اور ان کی شاعری کی روشنی میں۔ اب جہاں تک خطوط کا تعلق ہے ان میں کہیں بھی اقبال نے اس مسئلے کو براہِ راست نہیں چھیڑا ہے۔ البتہ کچھ خطوط ایسے ہیں جن میں یہ مسئلہ اگرچہ براہِ راست نہیں آیا ہے تاہم اس مسئلے کے متعلقات کا ذکر آگیا ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال اس اہم موضوع پر مسلمان فلاسفہ اور حکما کے نظریات سے واقف ہونا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں خاص طور پر سید سلیمان ندوی سے مختلف کتابوں وغیرہ کے بارے میں استفسار کیا کرتے تھے، جیسا کہ قبل ازیں ہم لکھ چکے ہیں کہ اقبال کی رائے میں یہ مسئلہ مسلمانوں کے لیے زبردست اہمیت کا حامل تھا۔ لہٰذا قدرتی طور پر وہ اس ضمن میں مسلمان مفکروں کی جولانئ فکر سے واقف ہونا چاہتے تھے۔

جن دنوں اقبال اپنے خطبات لکھ رہے تھے جو ۱۹۲۸ء میں مدراس میں دیئے گئے اور بعد میں THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM کے عنوان سے چھپ گئے یہ مسئلہ اکثر ان کے غور و فکر کا مرکز بنتا تھا۔ چنانچہ اس دور میں اقبال نے جو خطوط سید سلیمان ندوی کو لکھے ہیں ان میں جا بجا اس کا تذکرہ ہے۔ ۷ مارچ ۱۹۲۸ء کو لکھتے ہیں:۔

> "شمس بازغہ یا صدرا میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کئے ہیں۔ ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمان خدا ہے۔ بخاری میں ایک حدیث بھی اسی مضمون کی ہے لاتسبوا الدھر الخ۔ کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے۔ اگر ایسا ہو تو یہ بحث کہاں ملے گی۔" [۱]

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"قرونِ وسطیٰ میں ایک یہودی حکیم موسیٰ بن میمون نے لکھا ہے کہ خدا کے لیے کوئی

---

[۱] - اقبال نامہ - جلد اوّل - ص ۱۵۶؛

مستقبل نہیں ہے بلکہ وہ زمان کو لحظ بلحظ پیدا کرتا ہے۔ میمون قرطبہ میں پیدا ہوا اور قاہرہ میں مرا۔ غالباً بارہویں صدی کے آخر میں۔ اس نے مسلمانوں کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی اور تمام عمر مسلمانوں ہی کی ملازمت کرتا رہا۔ متکلمین کے خیالات پر اس نے جرح قدح بھی خوب کی ہے۔ میرا گمان ہے کہ میمون کا مذکورہ بالا مذہب بھی ضرور کسی نہ کسی مسلمان حکیم کی خوشہ چینی ہے۔ اگر آپ کے علم میں یہ بات ہو تو مہربانی کر کے مطلع فرمائیے۔ میں ایک مضمون لکھ رہا ہوں جس کا عنوان یہ ہے:

"زمان کی حقیقت فلسفۂ اسلام کی تاریخ میں۔" [۱]

——دوسرے دن ہی یعنی ۸ مارچ کو چودھری غلام رسول مہر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں نے سنا ہے امام ابن تیمیہ کی کتاب 'التقدیر' کا اردو ترجمہ ہو کر چھپ گیا ہے اگر یہ کتاب مل سکے تو اس کا ایک نسخہ بہم پہنچائیے۔" [۲]

اس کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں اقبال کو تسامح ہوا ہے۔ اصل میں اس کتاب کا نام "شفاء العلیل فی مسائل القضاء والقدر والحکمۃ والتعلیل" ہے۔ اردو ترجمے کا نام 'کتاب التقدیر' ہے۔ یہ کتاب حافظ ابن قیم کی تصنیف ہے۔ ابن تیمیہ کی نہیں جیسا کہ اقبال نے لکھا ہے۔ غالباً سید سلیمان ندوی نے ۷ مارچ کے خط کے جواب میں امام رازی کی مباحث مشرقیہ کے مطالعہ کی سفارش کی تھی لیکن یہ کتاب لاہور میں اقبال کو نہ مل سکی چنانچہ ۱۸ مارچ ۱۹۲۸ء کو پھر لکھتے ہیں:

'مباحث مشرقیہ لاہور میں دستیاب نہیں ہو سکتی، کیا یہ ممکن ہے کہ آپ زمان کے متعلق امام رازی کے خیالات کا خلاصہ قلمبند فرما کر مجھے ارسال فرمائیں۔ میں اس کا ترجمہ نہیں چاہتا صرف خلاصہ چاہتا ہوں جس کے لکھنے میں غالباً آپ کا بہت سا وقت ضائع نہ ہوگا۔' [۳]

خطبات کے شائع ہونے کے بعد بھی اس مسئلے سے اقبال کی دلچسپی بدستور رہی اور نہ صرف اس پر غور و فکر کا سلسلہ جاری رکھا بلکہ اس مسئلے سے متعلق اپنے مطالعہ کو بھی وسعت دیتے رہے۔ ۱۹۳۳ء میں اقبال

---

[۱] اقبال نامہ۔ جلد اول۔ ص ۱۵۷، [۲] انوار اقبال۔ ص ۹۰، [۳] اقبال نامہ حصہ اول ص ۱۵۸

کو انگلستان میں روڈز لیکچرس (RHODES LECTURES) دینے کی دعوت دی گئی جو انہوں نے قبول کی اور اس سلسلے میں انہوں نے جس موضوع کا انتخاب کیا وہ "فکر اسلامی میں تصور زمان و مکان" تھا۔ ۱۸ اگست ۱۹۳۳ء کو پیر سید مہر علی گولڑوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"میں نے گزشتہ سال انگلستان میں حضرت مجدد الف ثانی پر ایک تقریر کی تھی جو وہاں کے ادا شناس لوگوں میں بہت مقبول ہوئی۔ اب پھر ادھر جانے کا قصد ہے اور اس سفر میں حضرت محی الدین ابن عربی پر کچھ کہنے کا ارادہ ہے۔ نظر بر این حال چند امور دریافت طلب ہیں۔

۱۔ حضرت شیخ اکبر نے تعلیم حقیقت زمان کے متعلق کیا کہا ہے ؟

۲۔ یہ تعلیم شیخ اکبر کی کون سی کتب میں پائی جاتی ہے ؟

۳۔ حضرات صوفیہ میں سے اگر کسی اور بزرگ نے بھی حقیقت زمان پر بحث کی ہو تو ان بزرگ کے ارشادات کے نشان بھی مطلوب ہیں۔ مولوی سید انور شاہ مرحوم و مغفور نے مجھے عراقی کا ایک رسالہ فی درایۃ الزمان مرحمت فرمایا تھا۔ یہ رسالہ بہت مختصر تھا، اس واسطے مزید روشنی کی ضرورت ہے۔" [۱]

اسی تاریخ کو قریب قریب اسی مضمون کا خط سید سلیمان ندوی کے نام بھی لکھا۔

"چند ضروری امور دریافت طلب ہیں جن کے لیے زحمت دے رہا ہوں، از راہ عنایت معاف فرمائیے:

۱۔ حضرت محی الدین ابن عربی کے فتوحات یا کسی اور کتاب میں حقیقت زمان کی بحث کس کس جگہ ہیں۔ حوالے مطلوب ہیں۔

۲۔ حضرات صوفیہ میں اگر کسی اور بزرگ نے بھی اس مضمون پر بحث کی ہو تو اس کے حوالے سے بھی آگاہ فرمائیے۔

۳۔ متکلمین کے نقطۂ خیال سے حقیقت زمان یا آن سیال پر مختصر اور مدلل بحث کون سی کتاب

---

[۱] روح مکاتیب اقبال - عبداللہ قریشی - ص ۲۶۹

میں ملے گی۔

امام رازی کی 'مباحث مشرقیہ' میں آج کل دیکھ رہا ہوں۔

۴۔ ہندوستان میں بڑے بڑے اشاعرہ کون کون سے ہیں اور ملا محمود جونپوری کو چھوڑ کر کیا اور فلاسفر بھی ہندوستانی مسلمانوں میں پیدا ہوئے؟ ان کے اسما سے مطلع فرمائیے۔ اگر ممکن ہو تو اُن کی بڑی بڑی تصنیفات سے بھی۔" [1]

۲۲ اگست ۱۹۳۳ء کو جو خط سید سلیمان ندوی کے نام لکھا، اس میں ان معلومات کے لیے سید صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے بعد مزید باتیں دریافت کیں:

"مولانا حکیم برکات احمد بہاری ثم ٹونکی کا رسالہ تحقیق زمان مطبوعہ ہے؟ اگر قلمی ہے تو کہاں سے عاریتاً ملے گا۔ علیٰ ہذا القیاس مولانا شاہ اسماعیل شہید کی 'عبقات' قاضی محب اللہ کی 'جواہر الفرد' اور حافظ امان اللہ بنارسی کی تمام تصانیف کہاں سے دستیاب ہوں گی؟" [2]

اسی خط میں آگے یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگر یہ کتابیں کتب خانہ دار المصنفین میں موجود ہوں تو وہ کچھ دنوں کے لیے وہیں جاکر سید صاحب کی مدد سے یہ کتابیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ابنِ عربی کے بحث زمان کے ملخص کے لیے بھی اس خط میں تاکید کی گئی ہے۔

۴ ستمبر ۱۹۳۳ء کو جو خط لکھا گیا ہے اس میں کچھ کتابوں کے ملنے اور اُن کے پڑھنے اور کچھ اور کتابوں کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

"رسالہ 'اتقان فی ماہیۃ الزمان' آج مل گیا۔ ہندی فلسفی ساکن پھلواری مصنف "تسویلات فلسفہ" کا نام کیا ہے اور کتاب مذکور طبع ہوئی یا نہ، اگر نہیں طبع ہوئی تو قلمی نسخہ کہاں سے دستیاب ہوگا۔ 'شرح مواقف' دیکھ رہا ہوں، 'فتوحات' کا مطالعہ آپ کا ملخص آنے کے بعد دیکھوں گا، خدا کرے آپ کی صحت اچھی رہے اور اس طرف جلد توجہ کر سکیں۔ نور الاسلام کا عربی رسالہ بابت مکان جو رامپور میں ہے کس زبان میں ہے، قلمی ہے یا مطبوعہ، نور الاسلام کا زمانہ کون سا ہے۔" [3]

---

[1]، [2]، [3]۔ اقبال نامہ۔ حصہ اول۔ ص ۱۶۴، ۱۲۲، ۱۶۵

۱۰ ستمبر تک اس خط کا جواب نہیں آیا تھا چنانچہ اسی تاریخ کو پھر لکھتے ہیں:-

"ایک عریضہ پہلے ارسال کر چکا ہوں، اس کے جواب کا انتظار ہے۔ اس عریضے میں یہ دریافت کرنا بھول گیا کہ ملا محب اللہ بہاری کی کتاب جواہر الفرد کہاں سے ملیگی"۔[۱]

۱۷ ستمبر کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ سید سلیمان ندوی نے ابن عربی کے خیالات و افکار کا ملحض بھیجنے کا وعدہ کیا ہے جس کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ مسئلے کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مسئلہ آن کے متعلق ابھی تک مشکلات باقی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلاسفہ پر جو اعتراض ہمارے متکلمین نے کئے ہیں۔ وہ مسئلہ زمان کے متعلق خود ان کے افکار پر بھی عائد ہوتے ہیں۔

مولوی سید برکات احمد مرحوم نے دھر اور زمان میں امتیاز کر کے کسی قدر مشکلات کو کم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن حق یہ ہے کہ مسئلہ نہایت مشکل ہے۔ ممکن ہے حضرت ابن عربی اس پر روشنی ڈال سکیں"۔[۲]

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں اقبال، سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کی معیت افغانستان کے سفر پر روانہ ہوئے اور تقریباً تین ہفتوں کے قیام کے بعد واپس وطن چلے آئے۔ واپسی پر وہ پھر روڈز لیکچروں کی تیاری میں مصروف ہوئے۔ چنانچہ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۳ء کو سید سلیمان ندوی کو محی الدین ابن عربی کے مسئلہ زمان و مکان کی یاد دہانی کرتے ہیں[۳]۔ ۹ دسمبر کے خط میں انہیں اطلاع دیتے ہیں کہ مولوی نور الاسلام کا رسالہ فی تحقیق المکان کی نقل رامپور کے کتب خانہ سے آگئی ہے[۴]۔ اس کے بعد جو خط سید سلیمان ندوی کے نام ہے وہ ۱۵ دسمبر ۱۹۳۳ء کا ہے جس میں تلخیص کے ملنے پر شکریہ ادا کیا گیا ہے اور اسے پڑھ کر اقبال کے ذہن میں جو سوالات ابھرتے ہیں اُن کا ذکر ہے:-

"اگر دہر ممتد اور مستمر ہے اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے تو پھر مکان کیا چیز ہے؟ جس طرح زمان دہر کا ایک طرح سے عکس ہے اسی طرح مکان بھی دہر کا عکس ہونا چاہیئے یا یوں کہیئے کہ زمان و مکان دونوں کی حقیقت اصلیہ دہر ہی ہے۔ کیا یہ خیال محی الدین ابن عربی کے نقطہ خیال سے صحیح ہے

۱، ۲، ۳، ۴۔ اقبال نامہ حصہ اول۔ ص ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۷۷، ۱۷۸

کیا انہوں نے مکان پر بھی کچھ بحث کی ہے اور اگر کی ہے تو مکان اور دہر کا تعلق ان کے نزدیک کیا ہے۔"[1]

غرض کئی مہینوں تک اقبال اس موضوع پر کام کرتے رہے۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۳۳ء کو شیخ محمد اکرم کو اپنے روڈز لیکچروں کی تیاری کے سلسلے میں اطلاع دیتے ہوئے موضوع کی مشکلات بیان کرتے ہیں۔

"میں نے لارڈ لودین کی دعوت قبول کرلی ہے۔ میرا موضوع "فکر اسلامی میں تصور زمان و مکان" ہوگا۔ ایک ادق موضوع ہے اور ایسے مخطوطات کی مدد سے جن میں کم از کم بعض ابھی علوم تہہ ہیں "کافی تفتیش و تحقیق کا طالب ہے۔ بنا بریں مجھے شک ہے کہ میں ان خطبات کو تین چار ماہ تک جو مجھے ملے ہیں مکمل بھی کرسکوں گا یا نہیں۔"[2]

سید محفوظ علی بدایونی کے نام ۲۱ دسمبر ۱۹۳۳ء کا خط ہے جس میں اقبال نے مکان کے ابعاد کے بارے میں پوچھا ہے لکھتے ہیں:

"کیا مسلمان ریاضی دانوں میں کوئی اس بات کا بھی قائل ہوا ہے کہ مکان کے ابعاد تین سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ شاید نصیر الدین طوسی نے ایسے امکان کا کہیں ذکر کیا ہے مگر حوالہ یاد نہیں۔"[3]

صحت کی خرابی کے باعث اقبال یہ لیکچرز نہیں دے سکے اور نہ انگلستان جا سکے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ آیا یہ لیکچر اقبال لکھ بھی سکے یا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اقبال نے لیکچرس کے سلسلے میں یادداشتیں لکھی ہوں گی اور پھر باقاعدہ لیکچر لکھنے کا ارادہ چھوڑ دیا۔ اقبال اگر یہ لیکچر لکھتے تو یقیناً اس موضوع پر ایک معرکتہ الآرا تصنیف ہوتی۔

۲۱ جون ۱۹۳۶ء کو اقبال نے خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط لکھا اور یہ آخری خط ہے جس میں اقبال نے زمان کی وضاحت کرتے ہوئے انہیں لکھا:۔

"زمانہ ایک بڑی برکت و نعمت ہے (لا تسبوا الدھر ان الدھر ھو اللہ) اگر ایک طرف موت اور تباہی لاتا ہے تو دوسری طرف وقت ہی آبادی و شادابی کا

۱۔ اقبال نامہ۔ جلد اول۔ ص ۱۷۹ ۲۔ روح مکاتیب اقبال۔ ص ۲۸۵
۳۔ اقبال نامہ۔ جلد اول۔ ص ۳۱۶

مضمر ہے۔ یہی اشیاء کے پوشیدہ امکانات کو بروئے کار لاتا ہے۔ حالات حاضرہ میں تغیر کا امکان ہی انسان کی سب سے بڑی دولت اور ساکھ ہے۔" [۱]

فقہ اسلامی کی تشکیل جدید: اسلامی فکر کی جدید تشکیل، علم الکلام اور فقہ اسلامی کی نئی تعبیر کا خیال کچھ اقبال سے ہی مختص نہیں ہے بلکہ اقبال سے پہلے بھی مسلمان مفکرین اور علماء اس اہم مسئلے پر اظہار خیال کر چکے ہیں۔ اس خیال کے محرکات کیا تھے، یہاں ان سے بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے تاہم علاوہ دوسرے محرکات کے مغربی تہذیب و تمدن اور ان کے جدید علوم و فنون سے مرعوبیت، مغربی تہذیب اور مغربی علوم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ترقی پسندی اس کے بنیادی محرکات ہیں۔ مغربی تہذیب اور جدید فلسفہ و سائنس کے حاملین نے کائنات کے آغاز و انجام کی جس طرح توجیہہ کی اور انسانی وجود کے بارے میں انہوں نے جو نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس سے اسلامی عقائد اور اسلامی مسائل کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہو گئے اور ان عقائد و مسائل کو خلاف عقل سمجھا گیا، چنانچہ اس پر مسلم علماء و مفکرین نے کئی طرح سے REACT کیا۔ کچھ لوگوں نے نئے مسائل کی روشنی میں اسلامی مسائل کی توجیہہ و تاویل کی مستشرقین کی طرف سے جو اعتراضات کئے گئے تھے اس کے جواب دیئے اور اسلام کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی۔ شبلی نعمانی اور مولوی چراغ علی اسی زمرے سے متعلق تھے۔ کچھ لوگوں نے مغربی تہذیب اور اس کے پیدا کردہ علوم نے مذہبی روایات اور حقائق کے بارے میں جو شکوک پیدا کئے تھے یا خود ان حضرات کو جو اسلامی مسائل خلاف عقل نظر آتے تھے ان کی معذرت خواہانہ توجیہہ کی یا انہوں نے ان اسلامی عقائد و احکام کو ایسے معانی پہنائے جو اسلام کے صریح اور مسلم اصولوں سے ٹکراتے تھے اس ضمن میں سرسید احمد خان اور ان کے کچھ رفقاء قابل ذکر ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں کچھ ایسے علماء و مفکرین بھی پیدا ہو گئے جو مغربی تہذیب اور جدید علوم و فنون سے نہ تو مرعوب ہوئے اور نہ ہی کسی احساس کمتری کے شکار ہوئے۔ ان کا رویہ مثبت تھا۔ انہوں نے ایک طرف اس ورثے کی حفاظت کا احساس بھی دلایا جو مسلمانوں کو اپنے

---

[۱] - اقبال نامہ - جلد اول - ص ۳۱۶

اسلاف سے ملا تھا اور دوسری طرف مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن کو ظاہر کیا اور اسلام کو ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ اسلامی عقاید کی صاف ستھری تعبیر و توضیح کی اور موجودہ مادی اور سائنسی ذہن کے مطابق اسلام کی روحانی اور ملّی اقدار کی وضاحت کی۔ ان میں سید رشید رضا مصری، مولانا سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال، جسٹس امیر علی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اقبال نے اپنی پیغمبرانہ شاعری کے ذریعے امیر علی اور مولانا سلیمان ندوی نے اپنی سنجیدہ اور مدلل علمی تحریروں کے ذریعے اور مولانا مودودی نے اپنی سحر آفریں نثر نگاری سے مسلمانوں کے اندر ایک خود اعتمادی اور مقابلے کی صلاحیت پیدا کی۔

اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے سے جو پیغام دیا ہے اس سے صرفِ نظر کر کے یہاں صرف ان کے خطبات و مکاتیب کی روشنی میں ہی ان کے خیالات کو ظاہر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ "تشکیل الٰہیات اسلامیہ" کے چھٹے خطبے میں اقبال نے اس مسئلے کی جیسی وضاحت کی ہے اور جس طرح سے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اتنی وضاحت سے انہوں نے اس مسئلے کو کسی اور جگہ بیان نہیں کیا ہے۔ خطبے کے آغاز میں اقبال کہتے ہیں:۔

"اسلام کائنات کو اولاً و ابداً ایک ناقابلِ تغیر حقیقت نہیں سمجھتا..... اسلام ثبات و تغیر دونوں کو بیک وقت احساسِ حیات سمجھتا ہے۔ زندگی کو اٹل قوانین کی بھی ضرورت ہے اور ان قوانین کی بنا پر مسلسل تغیر اور ترقی بھی لازمی ہے۔ تغیرات و انقلابات فطرت کو قرآن آیاتِ الٰہی کہتا ہے لیکن جب قوانین کو اس طرح اٹل اور ناقابل تغیر سمجھ لیا جائے کہ تغیر اور ترقی ممنوع ہو جائے اس وقت یہ زاویۂ نگاہ جمود و خمود پیدا کرتا ہے۔ گزشتہ پانچ صدیوں سے مسلمان اسی جمود و خمود کی وجہ سے محروم حیات ہو گئے۔ اصول ثابتہ کو مانتے ہوئے وہ تغیر کے اصول کو بھول گئے۔"[لہ]

اقبال تقلید سے پیدا شدہ غیر مستحسن نتائج کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"۔۔۔ یہ فرض کر لیا گیا کہ اب نہ پہلے سے مجتہدین پیدا ہو سکتے ہیں اور نہ کسی جدید تفقہ

لہ خطبۂ ششم۔ اسلام کی تعمیر یں اصول حرکت، بحوالہ فکر اقبال، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ص ۵۱۸ - ۵۱۹۔

کی ضرورت ہے کیوں کہ تمام تفصیلاتِ حیات صدیوں سے زیرِ بحث آکر مخصوص صورتیں اختیار کر چکی ہیں۔ اس طرزِ عمل سے ایک ملت منظم تو ہو سکتی ہے لیکن محض کسی ایک غیر متغیر انداز پر تنظیم مقصودِ حیات نہیں علمائے اسلام بھول گئے کہ تنظیم و تقلید کی شدت سے فکر کی آزادی، خلاقی اور افراد کی خودی فنا ہو جاتی ہے۔ جامد اور مقلد ملت جسدِ بے روح رہ جاتی ہے سیلانِ حیات ارتقائی ہے۔ زندگی فکر و عمل کے قدیم انداز جامۂ کہن کی طرح اتارتی چلی جاتی ہے۔ بقائے ملت، ارتقائے ملت اور احیائے ملت غیر معمولی افراد کی بدولت ہوتا ہے لیکن شدتِ تقلید میں ایسے افراد پیدا ہی نہیں ہوتے اور اگر کہیں حسنِ اتفاق سے پیدا ہوتے ہیں تو ان کو متہم کیا جاتا ہے۔ سزائیں دی جاتی ہیں اور بعض اوقات قتل کے فتوے دیئے جاتے ہیں۔ اکثر ائمہ مجتہدین کے ساتھ تاریخ نے یہی عمل کیا ہے۔"[۱]

آگے چل کر اقبال کہتے ہیں کہ مسلمان ہمیشہ مقلد نہیں رہے اور اب بھی نشاۃ جدیدہ میں وہ تقلید کی زنجیروں کو توڑ سکتے ہیں اور تاریخ فقہ کے گہرے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی قوانین ہمیشہ جامد نہ تھے اور ہر دور میں اکابر فقہا نے انقلابِ زمانہ کا ساتھ دیا ہے۔ اجتہاد کی ضرورت اور اس کے جواز میں بقولِ اقبال تین باتوں کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے:

۱۔ طلوعِ اسلام سے عباسیوں کے آغازِ اقتدار تک قرآن کریم کے علاوہ مسلمانوں کے پاس فقہ کا کوئی مدون نظام نہ تھا۔

۲۔ چوتھی صدی ہجری تک کم از کم انیس مذاہب فقہ پیدا ہوئے جس سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ فقہ کے مفکرین حالات کا مطالعہ کر کے کس طرح اسلامی قوانین کو مسلسل ڈھالنے میں کوشاں رہے ہیں۔ پہلے زیادہ استخراج سے کام لیتے تھے۔ اس کے بعد معاملات اور نئے حالات کا مطالعہ ان کو استقراء کی طرف لے آیا۔

---

[۱] خطبۂ ششم۔ اسلام کی تعمیر میں اصولِ حرکت، بحوالہ فکرِ اقبال۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔ ص ۵۲۰۔

۳۔ اسلامی آئین سازی کے چار ماخذوں کا مطالعہ ہی تقلیدِ محض سے کنارہ کشی کے لیے کافی ہے۔[۱] اجتہاد کا پہلا اور بنیادی ماخذ قرآن مجید ہے۔ قرآن قانونی کوڈ (Code) کی کتاب نہیں۔ اس کا بنیادی مقصد تو انسان کے دل کی گہرائیوں میں خدا اور کائنات سے تعلق کا صحیح تصور جاگزین کرنا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں کچھ بنیادی احکام بھی مذکور ہیں۔ خاص طور پر خاندان کے متعلق جس پر انسانی معاشرے کی بنیاد ہے۔ مذہب اور ریاست اخلاق اور سیاست کو یکجا کر کے قرآن نے اسلامی ریاست اور نظام معاشرت قائم کرنے میں اہم اصول مقرر کر دیئے۔ چنانچہ اقبال نے جاوید نامہ میں قرآن کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا۔

نقشِ قرآن تا دریں عالم نشست	نقش ہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است	ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہان و ہم پیدا است این	زندہ و پائندہ و گویا ست این!
اندرو تقدیر ہائے شرق و غرب	سرعتِ اندیشہ پیدا کن چو برق

اور یہ کہ "صد جہانِ تازہ در آیات اوست" کہہ کر اقبال نے اپنے اس یقین کا اعادہ کیا ہے کہ قرآن اب بھی ایک نئے نظام حکومت کی بنیاد ڈالنے کے لیے تیار ہے۔ قرآن میں مختلف قسم کے تقریباً دوسو احکام ہیں جن کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ اول مذہبی جن میں وہ تمام معاملات شامل ہیں جو عبادت وغیرہ کے متعلق ہیں۔ دوم معاشرتی، ان کی پھر تین قسمیں ہیں۔

(ا) قوانین استقلال خاندان یعنی وہ احکام جو نکاح، طلاق اور ورثت کے متعلق ہیں۔

(ب) قوانین معاملات مثلاً بیع وغیرہ۔

(ج) قوانین تعزیری۔ ان مختلف قسم کے قوانین کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ انسان کو بہت کچھ اختیار بھی دیا ہے اور انہی احکام کی بنا پر پہلی چار صدیوں میں ہمارے فقیہوں نے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تمدنی ضروریات کے لیے قوانین وضع کیے۔ بدقسمتی سے اس اختیار

---

[۱] خطبۂ ششم: اسلام کی تعمیر میں اصول حرکت، بحوالہ فکرِ اقبال، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ص ۵۲۶

پر روک لگادی گئی اور اس طرح سے تقلید کا دور شروع ہوا۔ شروع میں اقبال نے بھی تقلید کو اجتہاد پر ترجیح دی تھی اور اس بات کا اظہار انہوں نے اپنے اشعار میں ۱۹۱۸ء میں کیا تھا۔ اقبال کا خیال تھا کہ موجودہ دور میں چونکہ مسلمانوں کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور بیشتر اسلامی ممالک مغربی اقوام کے قبضۂ اقتدار میں ہیں اور یہ کہ مسلمان ذہنی اور عملی طور پر مغرب کے غلام ہو چکے ہیں لہٰذا اجتہاد کے معاملے میں مسلمانوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا:۔

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر — کہ دُنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

چنانچہ انہوں نے جب 'رموزِ بے خودی' لکھی تو ان کے سامنے یہی مصلحت تھی چنانچہ کہتے ہیں:۔

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط — قوم را برہم ہمی پیچد بساط!

عہدِ حاضر فتنہ ہا زیرِ سر است — طبعِ ناپروائے او آفت گر است

تنگ بر ما رہ گزارِ دین شد است — ہر لئیمے رازدارِ دین شد است

نقش بردلِ معنیٔ توحید کُن — چارۂ کارِ خود از تقلید کُن [1]

لیکن اقبال کو بعد میں اپنا یہ نقطۂ نظر غلط معلوم ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خطبات میں تقلید پر تنقید کی۔ خطبات انہوں نے ۱۹۲۸ء میں لکھے لیکن اس سے کئی برس بیشتر ہی اقبال کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ اجتہاد کی ماہیئت اور اس کی ضرورت پر انہوں نے ایک مضمون بھی انگریزی میں لکھا تھا جسے انہوں نے عبدالماجد دریابادی کے پاس ان کی رائے معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ مولانا عبدالماجد کی رائے خاصی مخالفانہ تھی چنانچہ اقبال نے ۲۲ مارچ ۱۹۲۵ء کے خط میں مولانا کو لکھا:۔

"آپ کا نوٹ پڑھ کر مجھے تعجب ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عدیم الفرصتی کی وجہ سے آپ نے وہ مضمون بہت سرسری نظر سے دیکھا ہے۔" [2]

اس مضمون سے خود اقبال بھی مطمئن نہیں تھے، کچھ تو اس وجہ سے کہ مضمون بہت ہی مختصر تھا، اور بعض امور میں وہ علماء سے استفسار کرنا چاہتے تھے، چنانچہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام ۲ دسمبر ۱۹۲۵ء

---

[1] رموزِ بے خودی۔ [2] اقبال نامہ۔ حصہ اوّل۔ ص ۲۳۸

کے خط میں لکھتے ہیں:۔

"میں نے اجتہاد پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں بہت سی باتیں نہایت مختصر طور پر محض اشارتہً بیان کی گئی تھیں۔ اب اسے کتاب کی صورت میں منتقل کرنے کا ارادہ ہے جس کا نام اسلام میرے نقطۂ نظر سے (ISLAM AS I — UNDERSTAND IT) ہوگا۔ اس عنوان سے مقصود یہ ہے کہ کتاب کا مضمون میری ذاتی رائے تصور کیا جائے جو ممکن ہے غلط ہو۔"[1] اور کچھ اس وجہ سے کہ وہ خود بھی اپنی کی تحقیقات سے مطمئن نہیں تھے۔[2]"

بہرحال کتاب تو اقبال نہ لکھ سکے البتہ اجتہاد کے موضوع پر انہوں نے اپنے خطبات "RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM" میں سیر حاصل بحث ہے۔ ایک خط میں اقبال اجتہاد کے بارے میں علماء کی موجودہ روش سے بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں یا قوانین اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں۔ مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال (مسئلہ اجتہاد) پیدا ہونے والا ہے مگر افسوس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانے کے میلان طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر پرکھا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"[3]

---

[1]، [2]۔ اقبال نامہ۔ حصہ اوّل۔ ص ۴۶۔ ۵۱۔ ۴۶، ۱۵۱۔ ۱۵۱ (خط بنام سلیمان ندوی، اپریل ۱۹۲۷ء) [3] اقبال نامہ۔ ص ۴۶۔ ۵۱

اسی خط میں ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ عملی طور پر یہ ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لیے تمام ضروری قواعد قرآن میں موجود ہیں۔ احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرنے والے کو وہ اسلام کا مجدد سمجھتے ہیں۔

قرآن نے زندگی کا حرکی تصور پیش کیا ہے اور اسی لئے ارتقائی نظریہ اس کے بنیادی عقائد کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ کُلَّ یَومٍ ھُوَ فِی شَان کے پیشِ نظر اسلامی معاشرے میں زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ہم آہنگی ایک لازمی جزو ہے۔

اجتہاد کا دوسرا ماخذ حدیث ہے۔ اقبال نے شاہ ولی اللہؒ کی طرح حدیث کی دو قسمیں کی ہیں یعنی تشریعی اور غیر تشریعی۔ تشریعی احادیث وہ ہیں جن سے کوئی فقہی قانون اخذ کیا جاسکے۔ اجتہاد کا تعلق انہی احادیث سے ہے۔ ان کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے کہاں تک ان قوانین کو عربوں کے رسم و رواج کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وضع کیا۔ شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس کی تشریح کی ہے انہوں نے کہا ہے کہ جب کوئی ایسا پیغمبر مبعوث ہو جس کا پیغام تمام انسانوں کے لیے ہو تو لامحالہ وہ اپنا اصلاحی پروگرام اپنی ہی قوم کے مزاج اور عادات کو سامنے رکھ کر شروع کرے گا، یہ ممکن نہیں کہ وہ مختلف قوموں کے لیے مختلف قوانین وضع کرے اور نہ تمام قوموں کی عادات اور خصوصیات باہم متفق ہو سکتی ہیں۔ پہلے وہ اپنی قوم کی اصلاح کریگا اور یہی قوم تمام قوموں کے لیے ایک نمونہ بن جاتی ہے اور پھر اسی کے نمونے پر وہ اپنی تلقین کا دائرہ وسیع کرتا جاتا ہے۔ اسی بنا پر رسولِ خداؐ نے شعار، تعزیرات اور ارتفاقات میں عربوں کی عادات کا لحاظ رکھا۔ چنانچہ اسی لئے شاہ ولی اللہؒ نے یہ رائے قائم کی کہ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے اور جو احکام ان عادات اور حالات کی بناء پر قائم ہوئے ہیں، ان کی پابندی مقصود فی الذات نہیں ہونی چاہیے۔ غالباً اسی لئے امام ابو حنیفہؒ نے اپنی فقہ کی تدوین میں احادیث کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی اور اس کی وجہ وہی معلوم ہوتی ہے کہ جو شاہ ولی اللہؒ نے بیان فرمائی ہے کہ تدوینِ فقہ میں احادیث کی حیثیت ثانوی ہے اور ان کے ردّ و قبول میں وہی معیار سامنے ہو جو امام ابو حنیفہؒ نے اپنے سامنے رکھا۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ نئی فقہ کی تدوین میں احادیث کی تنقید، تحقیق اور ترتیب کا کام بھی

نئے سرے سے کرنا پڑے گا۔ اس چیز کو بھی دیکھنا ہوگا کہ کون کون سے شعائر، تحریرات اور ارتفاقات ایسے ہیں جو ہمارے معاشرے کے مزاج کے مطابق ہیں اور کن میں تبدیلی کی جا سکتی ہے لیکن بہرحال اس کا فیصلہ ہر کس و ناکس پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ شریعت نے جو قوانین بنائے ہیں وہ چند مصلحتوں پر مبنی ہیں اور ان کی بنیاد چند قطعی محرمات، مباحات اور حدود پر قائم ہے۔ وہی لوگ اس کام کے اہل ہو سکتے ہیں جو اپنے علم تفقہ کے لحاظ سے شریعت کے مزاج سے واقف ہوں۔

اجتہاد کا تیسرا ماخذ اجماع ہے۔ خلفائے راشدینؓ کے بعد جو ملوکیت بنی امیہ اور بنی عباس نے قائم کی، اس کے مفاد کے لیے یہ کہیں بہتر تھا کہ اجتہاد کا منصب کسی فرد واحد کے سپرد ہو۔ بجائے اس کے کہ یہ کام کسی مستقل قانون ساز اجماعی ادارے کے سپرد کیا جاتا جو یقیناً ان کی مطلق العنانی کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا۔ اقبالؔ کے خیال میں اجتہاد کا حق ایسے علماء کی جماعت کو ہونا چاہیئے جو اسلامی علوم کے علاوہ جدید علوم سے بھی بہرہ مند ہوں اور جنہیں موجودہ زمانے کی ضروریات کا صحیح ادراک ہو۔ اقبالؔ سمجھتے تھے کہ موجودہ حالات میں جب مسلمان ممبرانِ مجالس (MEMBERS OF LEGISLATURE) اسلامی قوانین سے پوری طرح واقف نہیں، اس اہم سوال کا فیصلہ ان پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اقبالؔ نے ایران کے ۱۹۰۶ء کے دستوری قانون کا حوالہ دے کر کہا ہے کہ وہاں اس بات کا اختیار علماء کی ایک علاحدہ جماعت کے سپرد کیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلامی ممالک میں اس قسم کا مستقل انتظام خطرات سے خالی نہیں ہوگا۔ اقبالؔ کا خیال تھا کہ اگر علماء کو ان مجالس میں لے لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ غرض اقبالؔ کے نزدیک "اجماع ایک اہم شرعی ماخذ ہے جو موجودہ دور میں پیش آنے والے مسائل کے لیے حکم شرعی معلوم کرنے میں اب بھی وہی رول ادا کر سکتا ہے جو اس نے ماضی میں ادا کیا ہے اور جو اب بھی تاریخ فقہ اسلامی کا ایک اہم و زریں باب ہے۔ اس اہم شرعی ماخذ میں مستقبل کے لیے بڑے امکانات مضمر ہیں۔ اسے اگر صحیح اور منتظم طور پر استعمال کیا جائے اور پھر تحلیل و تجزیہ کر کے جدید مسائل کا شرعی حل تلاش کیا جائے تو ان دشوار مسائل کا تشفی بخش حل نکل سکتا ہے جو آج ساری دنیا کے مسلمانوں کو درپیش ہیں۔"[1]

---

[1] بحوالہ مضمون اجماع۔ شریعت اسلامی کا تیسرا اہم ماخذ۔ از محمد اقبال انصاری مشمولہ فکر اسلامی کی تشکیل جدید ضیاء الحسن فاروقی

اجتہاد کا چوتھا ماخذ قیاس ہے۔ قیاس کی تعریف یہ ہے کہ کسی حکم منصوص کی علت معلوم کی جائے اور اس علت کی بنا پر دوسرے معاملات میں بھی وہی حکم لگایا جائے۔ رائے سے مراد یہ ہے کہ نقصان یا کسی مصلحت کے مظنہ کو کسی حکم کی علت ٹھہرایا جائے۔ مسئلہ رشید تیمم سے ان دونوں کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔

اجتہاد کے مسئلے سے اقبال کی دلچسپی اس قدر گہری تھی کہ انہوں نے نہ صرف خطبات میں ایک باب اسی موضوع پر وقف کیا بلکہ اپنے مکاتیب میں اپنے دور کے علماء سے جن میں سید سلیمان ندوی سرفہرست ہیں اس مسئلے پر برابر خط و کتابت کرتے رہتے تھے۔ اقبال اور سید سلیمان ندوی کی مکاتبت ۱۹۱۶ء سے شروع ہوتی ہے اور اقبال کی وفات سے چند ماہ پیشتر تک پھیلی ہوئی ہے۔ پہلا خط جس میں اقبال نے سید سلیمان ندوی سے کسی فقہی مسئلے پر رائے پوچھی ہے وہ ۱۰۔ نومبر ۱۹۱۹ء کا خط ہے جس میں وہ سید صاحب سے پوچھتے ہیں کہ جو تحائف مؤکلین وکلاء کے پاس لے آتے ہیں، کیا وہ حلال ہیں۔ اس کے بعد سوالات کا سلسلہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے زمان و مکان کے مسئلے کے علاوہ جس کا ذکر قبل ازیں تفصیل سے آچکا ہے یہ سوالات مختلف حدیثوں کی صحت، رویت باری تعالیٰ، قیاس پر علماء کے اعتراضات، اجماع امت، اجماع صحابہ و توریث، اجتہاد شعار، ارتفاقات، احکام منصوصہ میں توسیع و تجدید وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کو فقہ اسلامی سے کس قدر دلچسپی تھی اور وہ مسائل پر غور و فکر کرتے رہتے تھے اور علماء سے تبادلۂ خیال کرتے رہتے تھے۔ اقبال کو اس بات کا احساس تھا کہ فقہ اسلامی کی تشکیل جدید کا معاملہ بہت ہی نازک معاملہ ہے اور اس میدان میں پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ انہیں اپنی محدودات کا احساس تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ یہ کام وہ بطور خود نہیں کر سکتے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ علماء کے تعاون کے بغیر یہ کوشش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ انہیں اعتراف ہے کہ:

> "میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے۔ البتہ فرصت کے اوقات میں میں اس بات کی کوشش کیا کرتا ہوں ان معلومات میں اضافہ ہو یہ بات زیادہ تر ذاتی اطمینان کے لیے ہے نہ تعلیم و تعلم کی غرض ہے۔" [۱]

---

[۱] ۔ اقبال نامہ۔ حصہ دوئم۔ ص ۶۹

یال کو اس بات کا بھی شدید احساس تھا کہ دنیائے اسلام کو مذہبی اعتبار سے راہنمائی کی ضرورت ہے لیکن ایسی کوئی شخصیت انہیں نظر نہیں آئی جو مسلمانوں کے اس ذہنی انقلاب کو صحیح راستے پر لگائے جو مغربی تہذیب کی یورش اور جدیدیت کے اثر سے پیدا ہو رہا تھا۔ سید سلیمان ندوی کے نام ۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء کے خط سے اس سلسلے میں ان کی بے چینی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ موجودہ دور میں فقہ کی تشکیلِ نو کی ضرورت کا ذکر کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان کی جمعیۃ العلماء کی توجہ اس طرف ضروری ہے۔ آپ چونکہ اس جمعیت کے صدر ہیں اس واسطے آپ سے درخواست ہے کہ اس کام کو مستقل طور پر اپنے ہاتھ میں لیجئے ندوہ کے دیگر ارکان یا فارغ التحصیل طلبہ کو بھی اپنے ساتھ ملائیے تاکہ اقوامِ اسلامیہ کو فقہ کی اصل حقیقت معلوم ہو۔ میں نے سنا ہے کہ البانیہ کے مسلمانوں نے وضو اڑا دیا اور ممکن ہے نماز میں بھی کوئی ترمیم کی ہو۔ ٹرکی کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ مصر میں یہ تحریک جاری ہے اور عنقریب ایران اور افغانستان میں بھی اس کا ظہور ہوگا۔ ایران کو بابیت سے اندیشہ ہے مجھے اندیشہ ہے کہ اسماعیلی تحریک کہیں پھر زندہ نہ ہو جائے۔ ایک قدیم اسلامی اصطلاح ہے صوت الحجی شاید اس کا مفہوم قبیلہ کی آواز ہے کیونکہ اس وقت دنیائے اسلام میں کوئی خاص مذہبی شخصیت نہیں جو طبائع کے اس انقلاب کو ٹھیک رستے پر لگائے غرضیکہ اس وقت مذہبی اعتبار سے دنیائے اسلام کو راہنمائی کی سخت ضرورت ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے بعض علماء اس کام کو باحسن وجوہ انجام دے سکتے ہیں۔ سیاسی اعتبار سے تو ہم باقی اقوامِ اسلامیہ کو کوئی ایسی مدد نہیں دے سکتے ہاں دماغی اعتبار سے ان کے لیے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔"[1]

اس میں شک نہیں کہ اقبال نے فکرِ اسلامی کی تجدید اور طرحِ نو کے لیے بہت کوشش کی۔ طرح طرح کے مسائل کی طرف خود بھی توجہ کی اور علماء کو بھی متوجہ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ فقہِ اسلامی پر نئے سرے

---

[1] اقبال نامہ۔ حصہ اول۔ ص ۱۴۳۔ ۱۴۴

سے کتابیں لکھی جائیں اور ایسا کرتے ہوئے اپنے ماضی کے صحیح ادراک کے ساتھ ساتھ موجودہ دور کی مقتضیات کو بھی مدنظر رکھا جائے۔

اقبال جن مسائل فقہ پر سوچتے تھے اور جن کے بارے میں وہ اپنے احباب سے گفتگو کرتے تھے اور اپنے وقت کے جید علماء سے مکاتبت کرتے تھے ان میں سے یہاں چند ایک مسائل کی طرف اقبال کے ہی الفاظ میں اشارہ کرنا بے جا نہیں ہوگا۔ ان سے جہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کو کس طرح کے مسائل سے دلچسپی تھی وہاں زمانہ حال کی مقتضیات اور مستقبل میں پیش آنے والے ممکنہ مسائل کا عرفان بھی ظاہر ہوتا ہے۔

_____ ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء کو سید سلیمان ندوی کے نام خط میں لکھتے ہیں:۔

"دنیا عجب کشمکش میں ہے۔ جمہوریت فنا ہو رہی ہے اور اس کی جگہ ڈکٹیٹر شپ قائم ہو رہی ہے۔ جرمنی میں مادی قوت کی پرستش کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ سرمایہ دار کے خلاف ایک جہادِ عظیم ہو رہا ہے۔ تہذیب و تمدن (بالخصوص یورپ میں) بھی حالتِ نزع میں ہے غرض کہ نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے۔ ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک ممد ہو سکتا ہے۔ اس مبحث پر اپنے خیالات سے مستفیض فرمائیے اور اگر کوئی کتابیں ایسی ہوں جن کا مطالعہ اس ضمن میں مفید ہو تو ان کے ناموں سے آگاہ فرمائیے۔" [۵]

یکم فروری ۱۹۳۴ء کو سید صاحب سے مندرجہ ذیل سوالات پوچھتے ہیں:۔

۱۔ احکام منصوصہ میں توسیع اختیارات امام کے کیا اصول ہیں۔

۲۔ اگر امام توسیع کر سکتا ہے تو کیا ان کے عمل کو محدود بھی کر سکتا ہے اس کی کوئی تاریخی مثال ہو تو واضح فرمائیے۔

۳۔ زمین کا مالک قرآن کے نزدیک کون ہے؟ اسلامی فقہا کا مذہب اس بارے میں کیا ہے؟ قانی

---

[۵] اقبال نامہ۔ جلد اول۔ ص ۱۸۱؛

مبارک میں شاید اس کے متعلق کوئی فتویٰ ہے وہ فتویٰ کیا ہے؟

۴۔ اگر کوئی اسلامی ملک (روس کی طرح) زمین کو حکومت کی ملکیت قرار دے تو کیا یہ بات شرعِ اسلامی کے موافق ہوگی یا مخالف؟ اس مسئلہ کا سیاست اور اجتماع معاشرت سے گہرا تعلق ہے کیا یہ بات بھی رائے امام کے سپرد ہوگی۔؟

۵۔ صدقات کی کتنی قسمیں اسلام میں ہیں؟ صدقہ اور خیرات میں کیا فرق ہے؟[۱]

۲۴ اپریل ۱۹۲۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"امام ابو حنیفہ رض کے نزدیک طلاق یا خاوند کی موت کے دو سال بعد بھی اگر بچہ پیدا ہو تو قیاس اس بچہ کے ولد الحرام ہونے پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس مسئلہ کی اساس کیا ہے؟ کیا یہ اصول محض ایک قاعدۂ شہادت ہے یا جزوِ قانون ہے۔"[۲]

۱۸ اگست ۱۹۲۴ء کو پوچھتے ہیں:۔

"کیا کوئی حکم ایسا بھی ہے جو صحابہ نے نصِ قرآنی کے خلاف نافذ کیا ہو اور وہ کون سا حکم ہے؟"[۳]

۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"آیہ توریث میں حصص بھی ازلی و ابدی ہیں یا قاعدۂ توریث میں جو اصول مضمر ہے صرف وہی ناقابلِ تبدیل ہے اور حصص میں حالات کے مطابق تبدیلی ہو سکتی ہے۔"[۴]

مذہبی مسئلہ میں امام کے اختیارات کی نوعیت پر بحث کرتے ہوئے اقبال پوچھتے ہیں:۔

"زمانہ حال کی زبان میں یوں کہئے آیا اسلامی کانسٹی ٹیوشن ان (امام) کو ایسا اختیار دیتی ہے؟ امام ایک شخصِ واحد ہے یا جماعت بھی امام کے قائم مقام ہو سکتی ہے ہر اسلامی ملک کے لیے اپنا امام ہو یا تمام اسلامی ممالک کے لیے ایک واحد امام ہو؟ مؤخر الذکر صورت میں موجودہ فرقِ اسلامیہ کی موجودگی میں کیونکر بروئے کار آ سکتی ہے۔ مہربانی کر کے ان سوالات پر روشنی ڈالیے۔"[۵]

---

[۱]، [۲]، [۳]، [۴]، [۵]۔ اقبال نامہ۔ جلد اول۔ ص ۱۸۳، ۱۵۱۔۱۵۶، ۱۳۱، ۱۴۶، ۱۴۶۔ ۱۵۱۔

غرض اس قسم کے بہت سے سوال تھے جو اقبال کی فکر کا دامن تھامے رہتے تھے اور انہی سوالات پر غور کرتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ فقہ اسلامی کی تدوین نئے سرے سے ہونی چاہیئے اور یہ کہ فقہ جدید کی عمارت اس وقت تک کھڑی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اجتہاد کی اہمیت و ضرورت اور اس کی اصل حقیقت کو ذہن نشین نہ کر لیا جائے۔ اقبال کہتے ہیں:۔

"سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کی ہئیت ترکیبی میں وہ کون سا عنصر ہے، جو اس کے اندر حرکت اور تغیر کو قائم رکھتا ہے؟ اس کا جواب ہے اجتہاد۔" ؎

۱۹۳۰ء میں اقبال نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں الٰہ آباد میں خطبۂ صدارت پڑھا۔ اس میں اجتہاد کی ضرورت اور فقہ کی تشکیل جدید کی اہمیت جتانے کے بعد ایک ایسی تجویز پیش کی تھی جو آج بھی معنویت کی حامل ہے اور لائق غور ہے۔ انہوں نے کہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ علما کی ایک اسمبلی تشکیل دی جائے جن میں وہ مسلم قانون دان بھی موجود ہوں جنہوں نے علم جدید حاصل کیا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی رُوح کا عین مطابق موجودہ حالات کی روشنی میں اسلامی قانون کا تحفظ کیا جائے۔ اس کو وسعت دی جائے اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو نئی تاویل کی جائے تاکہ کوئی بھی قانون جو مسلم پرسنل لا کی تعریف میں آتا ہے اس جماعت کی منظوری سے پہلے قانون سازی کے لیے پیش نہ کیا جا سکے۔"

اسی خطبے کے آخر میں انہوں نے کہا:

"میرا خیال ہے اجتہاد کی اس مختصر بحث سے آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ ہمارے اصول فقہ ہوں یا نظام فقہ، ان میں آج بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کے پیش نظر ہم اپنے موجودہ طرز عمل (یعنی فکری جمود اور اجتہاد سے اجتناب) کو حق بجانب ٹھہرائیں، اس کے برعکس اگر ہمارے افکار میں وسعت اور دقت نظر موجود

؎ خطبات تشکیل جدید (ترجمہ نذیر نیازی)۔ ص ۲۲۸۔

ہے اور ہم نئے نئے احوال اور تجربات سے فایدہ بھی اٹھا رہے ہیں تو ہمیں چاہیے

فقہ اسلامی کی تشکیل میں جرأت سے کام لیں۔"

افسوس تو اس بات کا ہے کہ اقبال کے یہ خیالات صدا بصحرا ثابت ہوئے۔ انہوں نے اپنے متعلق کہا تھا:

از تب و تابم نصیب خود بگیر   بعد ازین ناید چو من مرد فقیر

لیکن اُن کے تب و تاب کو کسی نے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اقبال کی یہ مذہبی فکر اُن کی تحریروں میں ہی منجمد ہو کے رہ گئی۔

قومیت و وطنیت:۔ قومیت اور وطنیت کی بحث نہ صرف یہ کہ طولانی ہے بلکہ بڑی پیچیدہ بھی ہے۔ ان کا تعلق ایک طرف حیاتیات، بشریات، اجتماعیات اور نفسیات سے ہے اور دوسری طرف بین الاقوامی قانون، معاشیات و سیاسیات اور اخلاق و مذہب سے ہے۔ اور ان تمام متعلقہ علوم کی مدد سے ان پر اہلِ علم نے ہمہ جہت بحثیں کی ہیں۔ یہاں مختصر طور پر قومیت اور وطنیت کے ان تصورات کی روشنی میں جو اقبال کے زمانے میں مروج تھے اقبال کے ردِ عمل کی بات ہوگی۔ یہ تصورات مغربی تہذیب و تعلیم کے زیرِ اثر ہندوستان میں رایج ہو گئے تھے۔ راجہ رام موہن رائے، کیشب چندر سین، سرسید اور اُن کے رفقاء کی کوششوں سے جہاں ایک طرف اس ملک میں جدید افکار کے چراغ روشن ہوئے وہاں مغربی تعلیم کے جلو میں نئے مغربی تصورات اور تخیلات کے سیلاب کی آمد بھی ناگزیر ہو گئی۔ چنانچہ ہندوستان کا پڑھا لکھا طبقہ خاص طور پر ہندو طبقہ فاکس، برک اور کارلائل کے افکارِ حریت و آزادی سے متعارف ہوا اور ساتھ ہی مغربی تصورِ قومیت سے بھی آشنا ہوا۔ اس لحاظ سے ہندو بہر حال مسلمانوں سے بہت آگے تھے۔ ۱۸۸۵ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی تو یہ ہندوستانی قومیت کا ایک واضح روپ تھا۔ سرسید کی کانگریس مخالفت نے اکثر مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونے سے باز رکھا۔ سرسید کو اس بات کا احساس تھا کہ مسلمان اعداد و شمار کے لحاظ سے بھی کم ہیں اور تعلیمی لحاظ سے بھی پسماندہ ہیں۔ لہٰذا کانگریس میں ان کی شمولیت ادغام کے مترادف تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کو علاحدہ قومیت کا راستہ دکھایا۔ علاحدہ قومیت کا تصور حالی اور اکبر کی کوششوں سے بھی راسخ ہو گیا۔ حالی نے مسلمانوں کے

سامنے ان کے ماضی کو انتہائی درد انگیز اسلوب میں بیان کیا اور اکبر الٰہ آبادی نے نئی تہذیب کا تمسخر اڑایا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۵ء میں آل انڈیا مسلم لیگ وجود میں آ گئی اور اس طرح سے دو متوازی قومیتیں پہلو بہ پہلو پرورش پانے لگیں۔ ۱۹۰۵ء کی جنگِ روس و جاپان نے ان دونوں قومیتوں کو بہت تقویت بخشی۔ تقسیم بنگال ہندو قومیت کو ایک ایسی انتہا پسندی کی طرف لے گیا جس میں مسلمانوں سے مغایرت یقینی تھی۔ جنگ طرابلس اور جنگ بلقان نے اسلامی دنیا کی سب سے بڑی حکومت ترکی کو بہت نقصان پہنچایا تو تقسیم بنگال سے پیدا شدہ مغایرت مسلمانوں کو اس چار دیواری سے نکال کر مغربی ایشیا میں لے گئی۔ راستے زیادہ مختلف ہو گئے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران اگرچہ دونوں قومیتیں ایک دوسرے کے قریب آئیں لیکن یہ اتحاد عارضی تھا۔

دونوں قومیں غلام تھیں اور یورپ کے فلسفۂ قومیت کے پیروکار۔ راجہ رام موہن رائے، بدرالدین طیب جی، لوکمانیہ تلک، مولانا محمد علی، گوکھلے، مولانا آزاد غرض کانگریس اور لیگ دونوں کے حامی اسی فلسفے سے متاثر تھے۔ یورپ کا نظریۂ قومیت جن اجزا سے ترکیب پاتا ہے اُن کی تفصیل یوں ہے:۔

۱۔ جغرافیائی ماحول:۔ یعنی ایک مخصوص حدود اربعہ جو ایک ملک کو دوسرے ملک سے جدا کرتا ہے

۲۔ نسلی اشتراک:۔ اس جمعیت کا تعلق عام طور پر ایک ہی نسل سے ہوتا ہے اور وہ ہم آہنگ ہوتی ہے۔

۳۔ لسانی اشتراک:۔ اس حدود اربعہ کے اندر بسنے والی جمعیت ایک ایسی زبان بولتی ہے جو اس کے سب افراد سمجھتے اور بولتے ہیں۔

۴۔ مذہبی اشتراک:۔ اس کا مذہب ایک ہی ہو یا کم از کم ایک جیسا ہی ہو۔

۵۔ تمدنی اشتراک:۔ یعنی اس قوم کی رسومات، تہوار ایک ہی ہوں۔

۶۔ اشتراک تاریخ ماضیہ:۔ یعنی وہ قوم پیچھے مڑ کر جب دیکھتی ہے تو اسے متحدہ تاریخ نظر آئے۔

۷۔ مشترک امید مستقبل:۔ یعنی اس قوم کے سامنے ایک ہی جیسا مستقبل ہو۔[۱] اس لحاظ سے دیکھا

۱۔ قومیت اور اقبال۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر مشمولہ اقبال، تصور قومیت اور پاکستان۔ مرتبہ ڈاکٹر تبسم کشمیری مکتبہ عالیہ لاہور، ص ۲۷

جیسے تو امریکی، انگریز، فرانسیسی، اطالوی، روسی، جاپانی وغیرہ اقوام ہیں۔ لیکن یہاں یہ بات مدنظر رہنی چاہیئے کہ یہ ساتوں اجزا لازم و ملزوم نہیں ہیں۔ قوم لسانی اختلافات کے باوجود بھی قوم بن جاتی ہے، اس کی مثال سوس (SWISS) قوم ہے۔ بہرحال جب قوم بنتی ہے تو قومیت معرض وجود میں آتی ہے جو اصل میں ایک کسک اور لگن ہے جو ان اجزا سے پیدا ہوتی ہے۔ قومیت نے قوم کو اس کی صورت پذیری کے بعد ایک سٹیٹ (STATE) میں بدل دیا۔ قوم اور سٹیٹ لازم و ملزوم قرار پائے۔ بہرحال ہر انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی کامیابی کا معیار اس کی تشکیل نہیں ہے بلکہ حیاتِ انسانی کا تحفظ کرنے اور تہذیبِ انسانی کو آگے بڑھانے کی قوت ہے یعنی ہیئتِ اجتماعیہ کا امتحان اس وقت شروع ہوتا ہے جب وہ اپنے مخصوص دائرے سے نکل کر دوسری انسانی جمعیتوں سے میل ملاپ کرتی ہے۔ یورپ کی ہر قوم اپنی اپنی جگہ ترقی کرتی رہی لیکن اقتصادی عوامل جن میں دوسرے احساسات اور خیالات بھی کسی حد تک گڈمڈ تھے اپنی اپنی جگہ تغیر پذیر ہے۔ آبادی بڑھ رہی تھی، تجارت پھیل رہی تھی، نئے ملک دریافت ہو رہے تھے۔ چنانچہ جب ایک قوم اپنے مخصوص جغرافیائی ماحول سے باہر نکلی تو اسے ایک دوسری قوم سے سابقہ پڑا۔ اور اس طرح سے اختلاط و آمیزش کے ساتھ ساتھ آویزش بھی شروع ہو گئی اور قومیت جارحانہ ہو گئی۔ یورپ کی پچھلی چار صدیوں کی تاریخ اس قومی جارحیت سے بھری پڑی ہے۔ سولہویں صدی کی جنگ اسپین و انگلستان، سترہویں صدی کی جنگ ہالینڈ و انگلستان، اٹھارہویں صدی کی جنگ فرانس و انگلستان، انیسویں صدی کی جنگ روس و انگلستان اور بیسویں صدی کی جنگ چین و جاپان اور پہلی اور دوسری عالمگیر جنگیں اسی متوازی اور متخالف قومیت کا نتیجہ تھیں۔ ان تمام جنگوں کے پیچھے اقتصادی عوامل کارفرما تھے۔ اور اس طرح سے قومیّت کا ایک نتیجہ بین الاقوامی جنگیں تھیں۔ چنانچہ یہ ظاہر ہو گیا کہ قومیت ایک قوم کو جنم تو دے سکتی ہے لیکن جب وہ سٹیٹ کی صورت اختیار کرتی ہے تو بین الاقوامی امن، حیاتِ انسانی کے تحفظ اور تہذیبِ انسانی کے بقا کے لیے ممد و معاون نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور کے مشہور مفکرین برٹرنڈ رسل، جوڈ، ہکسلے وغیرہ نے قومیت کی کڑی تنقید کی۔ مسلمان مصلحین نے اس نظریہ قومیت اور اس سے پیدا شدہ قوم پرستی کی شدید مخالفت کی۔ یہ مخالفت زیادہ تر اس بنا پر ہوئی کہ اس نظریے میں کچھ مذہب دشمنی کی خصوصیات بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ اصل میں ابتدا ہی سے اسلام میں "ریاست" کو ایک مذہبی

جماعت ہی کی حیثیت حاصل ہی۔ قومیت کا نظریہ قوم کو ایک اعلیٰ ترین جماعت کا درجہ دے کر کچھ مشترک قومی رشتوں کو ریاستی ڈھانچے کی اساس قرار دیتا ہے۔ اس لئے قومیت کا یہ نظریہ اسلام سے متصادم معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم کے قوم پرستانہ نظریہ میں صرف مذہب ہی کو ریاست کی اہم اور مضبوط بنیاد نہیں سمجھا جاتا بلکہ مذہبی عنصر کو اسی حد تک اہمیت دی جاتی ہے جس حد تک زبان، معیشت، علاقہ اور کلچر کو۔

اقبال کا خیال تھا کہ کسی ریاستی نظام کے معیاری اصول سے مذہب کو الگ کر دینے سے ریاست ایک اہم اخلاقی بنیاد سے محروم ہو جاتی ہے۔ ان کے نقطۂ نظر سے مذہب کے آفاقی اخلاقی نظام کی جگہ اگر ایسے اخلاقی اصول اپنائے جائیں کہ جو قومی مفاد کی روشنی میں نیک و بد یا خیر و شر کے معیار کا تعین کریں تو اس سے اضافت پیدا ہوگی جو بالآخر آگے چل کر ایک قوم کی دوسری قوم پر استبداد، تشدد اور استحصال پر منتج ہوگی۔[۱]

اقبال کا اندیشہ محض نظری نہیں تھا۔ انہوں نے یورپ کو برتنے کے بعد یہ نقطۂ نظر اپنایا تھا۔ انہیں مغرب کی قوم پرستی میں کوئی ترقی پذیر عنصر نظر نہیں آیا اور اسی لئے انہوں نے اسے مکروہ میکاولیت سے تعبیر کیا کہ جو مقصد کے حصول میں ہر طرح کے ذرائع کو مباح سمجھتا ہے۔

قومیت کی بھرپور اور مستقل تردید "پین اسلامزم" کے نظریہ اور تحریک کے ذریعہ ہوئی۔ جمال الدین افغانی کا نام اس تحریک سے وابستہ ہے۔ افغانی کا یقین تھا کہ یہ قوم پرستانہ افکار ہی ہیں جو مسلمانوں کو اپنے مشترک دشمن (مغربی استعمار) کے خلاف اپنی جدوجہد کو مجتمع کرنے میں مانع رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مذہبی اتحاد کی تبلیغ کی اور کہا کہ مسلمان اپنے مذہب کے علاوہ کسی اور سچی قومیت کو نہیں جانتے۔ بعد میں اپنے قیام مصر کے دوران میں افغانی کے خیالات میں کچھ تبدیلی بھی آئی تھی لیکن اعرابی کی بغاوت (۸۲-۱۸۸۱ء) میں شکست ہونے کے بعد ان پر یہ بات واضح ہو گئی کہ کسی ایک ملک کی کوششوں سے استعماری حکومت کا تختہ الٹ دینے کا منصوبہ بے سود ہے اور اس طرح سے افغانی پھر اپنے اسی خیال پر واپس آگئے کہ مسلمانوں کا ایک

---

[۱] نظریۂ قومیت اور ہندوستانی مسلمان۔ میری اٹا استے پانی اتس۔ اسلام اور عصر جدید۔ جلد ۱۳۔ شمارہ ۲۔ اپریل ۱۹۸۱ء۔ ص ۳۲

سیاسی اتحاد ہو۔ چنانچہ ان کا مجلہ "العروۃ الوثقیٰ" جو ۱۸۸۴ء میں شروع ہوا، اسی پین اسلامی پروپیگنڈے کا ترجمان قرار پایا۔ پین اسلامزم کی تحریک کو مختلف صورتوں میں استعمال کیا گیا چنانچہ ہندوستان میں اسی تحریک کے زیر اثر تحریکِ خلافت نے مسلمانوں کو برطانوی اقتدار کے خلاف بیدار کیا۔ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ جب یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ مسلمانوں کو ایک ریاست کے تحت متحد کرنے کی توقعات حقیقت سے بعید تھیں لیکن پھر بھی اس خیال کو مکمل طور پر ترک نہیں کیا گیا۔ اس کے ایک متبادل کی حیثیت سے اسلامی اتحاد کے تصور کو اسلامی لیگ آف نیشنز (اسلامی جمعیت اقوام) کے نئے پیرہن میں پیش کیا گیا۔ اقبال نے کہا تھا کہ "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خدا ہم پر یہ حقیقت آہستہ آہستہ آشکار کر رہا ہے کہ اسلام نہ تو قوم پرستی کا نام ہے جو مصنوعی سرحدوں اور نسلی امتیازات کو محض حوالے کی غرض سے تسلیم کرتا ہے۔"[۱]

اقبال کے نزدیک اس قسم کی لیگ مغرب کے خلاف دراصل مسلمانوں کے ایک سیاسی بلاک کی حیثیت اختیار کر لیتی۔ انہوں نے نیشنلزم کو رد کیا اور اس کو سامراجیت کے نظریہ کے مماثل قرار دیا۔ ان کا خیال تھا کہ :-

"یورپ کے سامراجی منصوبے کو اس قسم کے مؤثر ہتھیار کی شدید ضرورت ہے کہ جس کی مدد سے مسلم ممالک میں یورپ کے تصورِ قوم پرستی کی اشاعت اور ترویج کر کے وہ اسلام کے مذہبی اتحاد کو پارہ پارہ کر دے۔"[۲]

اقبال کے نزدیک ہندوستان میں مسلمانوں اور اسلام کے لیے جو اسباب زیادہ خطرناک تھے ان میں مسلمانوں کی جہالت، بے راہ روی اور ان کی بے حسی کے علاوہ نظریہ قومیت بھی تھا۔ میر غلام بھیک نیرنگ کے نام اقبال نے ایک خط میں لکھا :-

"میرے نزدیک تبلیغ اسلام کا کام اس وقت تمام کاموں پر مقدم ہے۔ اگر ہندوستان

۱؎ - RECONSTRUCTION - ص ۱۵۹

۲؎ ایضاً (مرتب)

میں مسلمانوں کا مقصد سیاسیات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبودی ہے اور حفاظتِ اسلام اس کا عنصر نہیں، جیسا کہ آج کل کے قوم پرستوں کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔" [۱]

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"میں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں اور سیاسیات حاضرہ کے تھوڑے سے تجربے کے بعد کہ ہندوستان کی سیاست کی روش جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے خود مذہب اسلام کے لیے ایک خطرۂ عظیم ہے۔ میرے خیال میں شدھی کا خطرہ اس خطرہ کے مقابلے میں کچھ وقعت نہیں رکھتا یا کم از کم شدھی ہی کی ایک غیر محسوس صورت ہے۔" [۲]

سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"بزمِ اغیار کی رونق ضرور تھی۔ اسلام کا ہندوؤں کے ہاتھ بِک جانا گوارا نہیں ہو سکتا۔ افسوس اہلِ خلافت اپنی اصلی راہ سے بہت دُور جا پڑے۔ وہ ہم کو ایک ایسی قومیت کی راہ دکھا رہے ہیں جس کو کوئی مخلص مسلمان ایک منٹ کے لیے بھی قبول نہیں کر سکتا۔" [۳]

اکبر الٰہ آبادی کے نام خط میں یورپی نظریۂ قومیت کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس وقت اسلام کا دشمن سائنس نہیں۔ اس کا دشمن یورپ کا جغرافیائی جذبۂ قومیت ہے جس نے ترکوں کو خلافت کے خلاف اکسایا، مصر میں مصریوں کے لیے آواز بلند کی۔ اور ہندوستان کو پین انڈین ڈیموکریسی کا بے معنی خواب دکھاتا ہے۔" [۴]

جس زمانے میں اقبال 'رموزِ بے خودی' لکھ رہے تھے انہیں مسلمانوں کی ہئیت اجتماعیہ پر غور و فکر کرنے کا زیادہ موقع ملا۔ اور اس ضمن میں قومیت کا مغربی نظریہ بھی ان کے غور و فکر کا مرکز بنا، چناں چہ ۲۷ جون ۱۹۱۷ء کو خان محمد نیاز الدین خان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

---

[۱]، [۲]، [۳]، [۴]۔ اقبال نامہ جلد اول۔ ص ۲۰۹، ۲۱۰، ۱۵۸، ۲۲۳

رموزِ بے خودی کو میں اپنے خیال میں ختم کر چکا تھا مگر پرسوں معلوم ہوا کہ ابھی ختم نہیں ہوئی، ترتیب مضامین کرتے وقت یہ بات ذہن میں آئی کہ ابھی دو تین ضروری مضامین باقی ہیں یعنی قرآن اور بیت الحرام کا مفہوم و مقصود حیات ملیہ اسلامیہ میں کیا ہے۔ ان مضامین کے لکھ چکنے کے بعد اس حصہ مثنوی کو ختم سمجھنا چاہیئے۔ مگر ایسے ایسے مطالب ذہن میں آئے کہ خود مسلمانوں کے لیے موجبِ حیرت و مسرت ہوں گے کیونکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے ملت اسلامیہ کا فلسفہ اس صورت میں اس سے پہلے کبھی اسلامی جماعت کے سامنے پیش کیا گیا۔ نئے سکول کے مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ یورپ جس قومیت پہ ناز کرتا ہے وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک چھیتڑا ہے۔ قومیت کے اصول حقہ صرف اسلام نے ہی بتائے ہیں۔ جن کی پختگی اور پائیداری مرورِ ایام و لعصاد سے متاثر نہیں ہو سکتی۔" [1]

قومیت کے اسی نظریئے کی بنیاد پر اقبالؔ نے برصغیر میں متحدہ قومیت کے نعرے کو مسلمانوں کے حق میں خطرناک قرار دیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح سے مسلمان اپنے تہذیبی اور ثقافتی تشخص سے محروم ہو جائیں گے اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبالؔ کے بارے میں عام طور پر جو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی علاحدہ قومیت کا نظریہ اس وقت پیش کیا جب وہ عملی سیاست میں داخل ہو گئے جو ۱۹۲۶ء کے آس پاس کا زمانہ ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ شروع ہی سے اس خیال کے حامی تھے کہ ہندوستانی مسلمان ایک علاحدہ قوم ہیں۔ ۲۸ مارچ ۱۹۰۹ء کو منشی غلام قادر فرخ امرتسری کے نام ایک خط میں انہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"میں خود اس خیال کا حامی رہ چکا ہوں کہ امتیازِ مذہب اس ملک سے اٹھ جانا چاہیئے اور اب بھی اپنی نجی زندگی میں اس پر کاربند ہوں۔ مگر اب میرا خیال ہے کہ دونوں کے الگ الگ تشخص کو برقرار رکھنا ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے مفید ہوگا۔ ہندوستان

---

[1] مکاتیب اقبالؔ (بنام خان محمد نیاز الدین خان) ص ۹۔ بزم اقبالؔ۔ لاہور۔

میں مشترک قومیت کا خواب ایک خوبصورت خیال ہے اور اس میں ایک شاعرانہ دلآویزی ہے لیکن موجودہ حالت اور دونوں فرقوں کے غیر شعوری رجحانات کو دیکھتے ہوئے یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر نہیں آتا۔" [۱]

اسی نظریے کی بنا پر اقبال نے بعد میں جداگانہ انتخاب کی حمایت کی اور جب ۱۹۲۷ء میں اس مسئلے پر مسلم لیگ میں اختلاف پیدا ہوا تو آپ نے شفیع لیگ کا ساتھ دیا کیونکہ وہ جداگانہ انتخاب کی حامی تھی۔ اس کے برعکس جو لوگ متحدہ قومیت کے حامی تھے اور مذہب کی بجائے وطنیت کو قومیت کی اساس بتاتے تھے، اقبال ان سے سخت اختلاف رکھتے تھے، مولانا حسین احمد مدنی کے بارے میں ان کے مندرجہ ذیل قطعہ

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

کی شانِ نزول بھی قومی نقطۂ نظر کا اختلاف تھا۔

غرض اقبال نے شروع سے آخر تک ملتِ اسلامیہ کی ہیئتِ اجتماعی اور اس کے استحکام پر زور دیا۔ انہوں نے مسلمانوں کی قومیت کی اساس وطن یا علاقہ کو نہیں، ان کے مذہب یعنی اسلام کو قرار دیا اور وطنیت پر مبنی قومیت کے یورپی تصور کو بنی نوع انسان کے لیے مہلک بتایا۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

انہوں نے اس قومیت کی مذمت کی جس کی اساس مذہبی قدروں، اخلاقی ضابطوں اور ثقافتی روایتوں کے تحفظ کے احساس کے بجائے ایسے جذبوں کی تسکین پر رکھی گئی ہو جو کسی خطۂ زمین میں رہنے کے سبب وہاں کے باشندوں میں پیدا ہو جاتے ہیں لیکن اس سے قطعی یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اقبال حب الوطنی کے خلاف ہے یا اپنے وطن کے لیے ایثار اور قربانی کی ممانعت کرتا ہے۔ انہوں نے بالکل واضح لفظوں میں اپنے موقف کو بیان کرتے ہوئے کہا:۔

---

[۱] روح مکاتیب اقبال ــ عبداللہ قریشی، ص ۸۵۔ (منقول از سفینۂ حیات، ص ۲۲، ۲۳)

"اگر قومیت کے معنی اہلِ وطن سے محبت کرنے اور ناموسِ وطن کے لیے جان تک قربان کرنے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمان کے لیے جزوِ ایمان ہے، قومیت اسلام سے اس وقت متصادم ہوتی ہے جب وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے۔ اتحادِ انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام محض شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔ ترکی، ایران اور دیگر مسلم ممالک میں قومیت کبھی ایک مسئلے کی صورت اختیار نہ کرے گی۔ قومیت کا مسئلہ مسلمانوں کو صرف ان ممالک میں درپیش ہے جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور جہاں قومیت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنی ہستی کو بالکل مٹا دیں۔ مسلم اکثریت والے ملکوں میں اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیونکہ وہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہے۔ جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان کی یہ کوشش حق بجانب ہوگی کہ تہذیبی وحدت کی حیثیت سے انہیں حقِ خود اختیاری حاصل ہو۔ یہ دونوں صورتیں اسلام کے عین مطابق ہیں۔" [۱]

ان خیالات کے تجزیہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اقبال کے تصورِ قومیت کی کئی جہتیں ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق اسلامی ممالک سے ہے، دوسری وہ جس کا تعلق ایسے ممالک سے ہے جن میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور تیسری وہ جہاں بین الاقوامی سطح پر تمام اسلامی ممالک کو دینی قومیتوں کے خلاف ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک کرنے کی ضرورت ہے۔ برصغیر کی سطح پر یہ تصور سر سید احمد خان [۲] اور بین الاقوامی سطح پر سید جمال الدین افغانی کے تصورِ قومیت کا مرکب ہے۔

۱۔ شذراتِ فکرِ اقبال (ترجمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی) لاہور ۱۹۷۳ء۔ ص ۔ ۱۵۵

۲۔ سر سید احمد خان کے تصورِ قومیت کی مختصر وضاحت یہاں بے جا نہ ہوگی۔ ۱۸۸۵ء تک انہوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے اتحاد کے خیال کی پُر جوش تبلیغ کی اور مسلمانوں کے احیا کو پورے ہندوستان کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی سے مربوط کیا۔ ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء کو اپنی پٹنہ کی تقریر میں انہوں نے کہا تھا "یاد رکھیے کہ ہندو اور مسلم مذہبی اصطلاحات ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام باشندے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یا عیسائی اپنی سکونت کے اعتبار سے ایک قوم ہیں۔"

جمہوریت اور سوشلزم :۔ اقبال نے اپنے قیام یورپ (۱۹۰۵ء۔۱۹۰۸ء) کے دوران میں دیکھ لیا تھا کہ مغرب میں جس نظام سیاست کا نام جمہوریت ہے وہ گندم نما جو فروشی کے مصداق ہے۔ جمہوریت کی معروف تعریف یہ ہے کہ یہ عوام پر عوام کے ذریعے، عوام کی حکومت کہی جاتی ہے لیکن حقیقت میں اقتدار چند مخصوص ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ تھوڑے سے لوگ قوت اور معاش کے سارے وسائل و ذرائع پر قابض ہوجاتے ہیں اور عوام جن کے نام پر یہ سب کچھ ہوتا ہے بے بسی کی زندگی گزارتے ہیں۔ بہ ظاہر اقتدار ایک آدمی کے بجائے بہت سے آدمیوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے لیکن حکمرانی افراد کی ایک خاص جماعت کرتی ہے۔ یہ حکمران جماعت افراد کی قابلیت اور اہلیت کو نہیں دیکھتی بلکہ صرف یہ دیکھتی ہے کہ افراد کی اکثریت کس کی جانب ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں:۔

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں — بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اقبال کے خیال میں یہ جمہوریت صرف اسی وقت صحیح معنوں میں عوامی حکومت ہو سکتی ہے جب لوگوں میں اخلاقی اور مذہبی اقدار کا پاس ہو انہیں اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس ہو اور وہ تعلیم سے بہرہ مند ہوں اور جہاں یہ باتیں ناپید ہوں یا عام نہ ہوں وہاں جمہوریت "دیو استبداد" کی صورت اختیار کر لیتی ہے اقبال ایک جمہوری معاشرے کی مساواتی قدروں کے قایل ہیں لیکن وہ مغربی طرز کی بے لگام اور لادینی جمہوریت سے متنفر ہیں، اسی لئے وہ پیام مشرق میں متنبہ کرتے ہیں:۔

گریز از طرزِ جمہوری غلام پختہ کارے شو — کہ از مغز دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

لیکن ان خیالات سے یہ تاثر لینا کہ اقبال جمہوری اقدار کے سراسر مخالف تھے غلط ہوگا میرا خیال

(گذشتہ سے پیوستہ) (سرسید احمد۔ تقریری مقالات' لاہور ۱۹۶۳ء ص ۱۶۰) انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے بعد سید احمد خان کو اس بات کا خطرہ لاحق ہو گیا کہ انگریزوں کے بعد اقتدار کا خلا پیدا ہو جائے گا۔ جسے مسلمان اقلیت میں ہونے کے سبب پُر نہ کر سکیں گے سرسید نے اگرچہ واضح الفاظ میں "دو قومی نظریہ" پیش نہیں کیا مگر ان کی کانگریس کی مخالفت اس کے کل ہند کردار سے انکار، ان کی تجویز کہ ایک ایسا نظام رائج کیا جائے کہ دونوں فرقوں کو برابر برابر نمائندگی حاصل ہو سکے' وغیرہ وغیرہ' ایک طرح کے اشارے تھے جو مستقبل کی فرقہ وارانہ علاحدگی پسندی کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ہے کہ اقبال جمہوریت کو ایک سیاسی نظام کی صورت میں قطعی طور پر رد نہیں کرتے بلکہ اس کی خامیوں کی تنقید کرتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کے کچھ اشعار کو بنیاد بنا کر انہیں جمہوریت کا مخالف ثابت کیا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اقبال محض اس لادین مغربی جمہوریت کی مذمت کرتے ہیں جسے اکثریت کی رائے کے سوا اور کوئی چیز پابند کرنے والی نہیں اور جو مغرب کی استعماری قوتوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گئی ہے۔ ۱۹۰۹ء میں "ہندوستان ریویو" میں "اسلام بحیثیت ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین" کے موضوع پر لکھتے ہوئے اقبال نے دو بنیادی سیاسی اصولوں کا ذکر کیا تھا جو اسلامی سیاسی آئین کی اساس ہیں:۔

"۱۔ خدائی قانون کو قطعی برتری حاصل ہے اور اسلام کے سماجی ڈھانچے میں کسی ہیئت حاکم کا مقام اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ وہ اس قانون کا شارح ہے۔

۲۔ اُمتِ اسلامیہ کے تمام ارکان کی مطلق مساوات۔ اسلام ایک وحدت ہے جس میں کوئی امتیازات نہیں اور اس وحدت کی حفاظت انسانوں کے دو سادہ اصولوں پر ایمان کی دعوت سے ہوتی ہے یعنی خدا کی احدیت اور رسولؐ کی رسالت۔"

اسی مضمون میں آگے چل کر اقبال کا یہ اعلان بھی موجود ہے کہ:۔

"جمہوریت اسلام کا بحیثیت ایک سیاسی نصب العین کے اہم ترین پہلو ہے۔"[۱]

اقبال جس طرح کے سیاسی نظام کی سفارش کرتے ہیں اسے جسٹس ایس۔ اے رحمان کے لفظوں میں 'الٰہی جمہوریت' کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا جمہوری نظام ہے جو اپنی تنظیم کے لیے ایک الہامی ضابطۂ حیات کا محتاج ہے اور یہ کہ یہ ضابطہ سب پر یکساں طور حاوی ہوگا۔ اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید کے چھٹے خطبے میں اقبال کہتے ہیں:۔

"آج کے مسلمان کا فرض ہے کہ اپنے مقام کو پہچانے اپنی سماجی زندگی کی تعمیر اساسی اصولوں کی روشنی میں کرے اور اسلام کے تاحال جزوی طور پر مکشوف مقصد کو سامنے رکھ کر اس روحانی جمہوریت کی نشوونما کرے جو اسلام کی غرض و غایت ہے۔"[۲]

۱۔ بیدبعبدالواحد (مرتب) THOUGHTS & REFLECTIONS OF IQBAL لاہور ۱۹۶۴ء ص ۵۱-۵۵۔

۲۔ محمد اقبال RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM لاہور ۱۹۷۱ء ص ۱۸۰

اقبال نے ۱۹۱۶ء میں "مسلم جمہوریت" کے عنوان پر NEW ERA میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا ایک اقتباس پروفیسر نکلسن نے اپنے اسرارِ خودی کے انگریزی ترجمے کے مقدمے میں نقل کیا ہے۔ اس میں اقبال لکھتے ہیں:۔

"یورپ کی جمہوریت جس پر اشتراکی شورش اور سماجی خوف کے سائے منڈلا رہے ہیں، دراصل یورپی ملکوں کے معاشیاتی تجدد کی پیداوار ہے۔ نیٹشے اس "سلطانیٔ انبوہ" سے بیزار ہے اور عوامی انسان سے مایوس ہو کر اس نے ثقافتِ اعلیٰ کو کلیتہً فوق البشر انسانوں کی اشرافی جماعت کی ترقی و تربیت پر مبنی کر دیا لیکن کیا عوامی آدمی قطعی طور پر ناکارہ ہے؟ اسلامی جمہوریت کا مبدا اقتصادی مواقع کی توسیع نہ تھا۔ یہ ایک روحانی اصول ہے جس کے امکانات ایک خاص قسم کے کردار کی تخلیق سے بروئے کار لائے جا سکتے ہیں۔ اس عوامی مواد سے اسلام نے زندگی اور قوت کے اعلیٰ ترین نمونوں کی تشکیل کی۔ لہٰذا کیا قرونِ اولیٰ کی اسلامی جمہوریت نیٹشے کے خیالات کا تجربی رد پیش نہیں کرتی"۔ [۱]

اقبال مغرب کے جمہوری نظام کو ہی ناپسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ ہر اس نظام اور نظریے کے مخالف ہیں جس میں مذہب کو شامل نہ کیا گیا ہو۔ چنانچہ سوشلزم کے تئیں اقبال کا ردِعمل بھی اسی نقطۂ نظر سے جانچا جانا چاہیئے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں کئی جگہ سوشلزم، انقلابِ روس، کارل مارکس اور لینن کے بارے میں توصیفی کلمات کہے ہیں، جن سے بدیہی طور پر یہ گمان ہوتا ہے کہ اقبال سوشلزم کے حامی تھے۔ وہ یقیناً سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں کارل مارکس کے سیاسی نظام یعنی اشتمالیت کو سراہتے ہیں، لیکن کلامِ اقبال کے غائر مطالعے سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اس کی لادینی کے سبب اسے بھی کج نہاد اور ناپائیدار خیال کرتے ہیں۔ 'جاوید نامہ' میں جہاں ان کی ملاقات جمال الدین افغانی کی روح سے ہوتی ہے، وہ 'پیغامِ افغانی' کے عنوان سے روس کے موجودہ نظام کی تعریف میں روسیوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:۔

---

[۱] آر۔ اے نکلسن۔ مقدمہ اسرارِ خودی (انگریزی) ص XXIX (فٹ نوٹ)۔

زندہ طرح دیگری انداختی ! — دل ز دستور کہن پرداختی
ہم چنیں اسلامیاں اندر جہان — قیصریت را شکستی استخوان
تا بر افروزی چراغ در ضمیر — غیرتے از سرگذشتِ ما بگیر
پائے خود محکم گزار اندر نبرد — گرد این لات و ہبل دیگر مگرد
ملتے می خواہد این دنیائے پیر — آنکہ باشد ہم بشیر و ہم نذیر

اس تعریف و توصیف کے بعد یہ صلاح دیتے ہیں:-

کردہ کار خداوندان تمام — بگذر از لا جانب الا خرام
در گذر از لا اگر جوئندۂ — تاز لا اثبات گیری زندۂ
اے کہ می خواہی نظام عالمی — جستہ او را اساس محکمی

اسی طرح اور کئی نظمیں اردو اور فارسی میں ہیں جن میں اشتمالیت کو ایک پہلو سے سراہا گیا ہے اس ضمن میں پیام مشرق میں "قسمت نامہ" "خضر راہ" "لینن خدا کے حضور میں" "اشتراکیت" اور "کارل مارکس کی آواز" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جن میں اشتمالیت کی تحسین کا پہلو خاصا نمایاں اور واضح ہے اقبال سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں سے آگاہ تھے وہ اس بات سے بھی واقف تھے کہ کس طرح سے سرمایہ دار مزدور کی سادگی کا استحصال کر کے اسے افلاس اور جہالت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے "قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور" میں سرمایہ دار جس چالاکی اور چرب زبانی سے مزدور کی سادگی اور اس کے جذبۂ ایثار سے فائدہ اٹھاتا ہے وہ واقعی دیکھنے کی چیز ہے۔ سرمایہ دار مزدور سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ یہ فولادی کارخانے جن میں ہر دم شور و غوغا رہتا ہے یہ میری مملکت ہیں اور ایسے تمام نغمے جو بلبل کے نغموں کی طرح میٹھے اور دلکش ہیں وہ میں تمہیں دیتا ہوں۔ باغات اور درختوں پر چونکہ ٹیکس دینا پڑتا ہے لہٰذا وہ میری مملکت ہیں اور جنت کے باغات میں تمہارے لئے چھوڑتا ہوں۔ شراب چونکہ تلخ ہوتی ہے اور دردِ سر پیدا کرتی ہے اس لئے وہ میری ملکیت ہے اور تم جنت کی شراب طہور کے مالک بن جاؤ۔ غرض اس طرح سے سرمایہ دار مزدور کی سادگی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس لئے تمام

مادی وسائل اپنی ملکیت میں رکھتا ہے اور باقی تمام روحانی چیزیں مزدور کے لیے چھوڑتا ہے۔ تبسم کاشمیری اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور ظالم و مظلوم طبقوں کی نظم ہے۔ اس میں ایک ثقافت ظالم کی ہے جس میں ہر طرح کا سکھ چین اور سکون ہے۔ زندگی دنیا میں بہشت کا نمونہ ہے اور اس کے مقابلے میں دوسری ثقافت مظلوم طبقے کی ہے جس میں محرومیوں اور ناآسودگیوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ مسلسل تڑپنے اور ہمیشہ مایوس رہنے کا ایک استمراری عمل ملتا ہے۔ یہ دونوں ثقافتیں کس نے تخلیق کی ہیں؟ یہ سرمایہ دارانہ ذہن کا شاہکار ہے جس نے یہ دو سماجی طبقے پیدا کئے ہیں۔ اور اس تقسیم سے سرمایہ دار اپنا حق سمجھ کر مزدور سے اس کی محنت خریدتا ہے اور اس سے بے پناہ مادی فوائد شب و روز منتقل کرتا رہتا ہے یعنی مزدور کی شکل میں بدلتی رہتی ہے اور اس میں بیش بہا اضافہ ہوتا رہتا ہے مگر مزدور کی محنت قلیل معاوضے سے آگے نہیں بڑھتی۔" ؎

اقبال نے مزدوروں کے درد کو محسوس کیا اور سرمایہ دارانہ نظام سے انھیں نفرت پیدا ہوگئی 'نوائے مزدور' کی نظم میں انھوں نے اس ظلم وستم کی تصویر کشی کی ہے جو سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور پر روا رکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح 'خضر راہ' کے ایک بند میں اقبال مزدور سے خطاب کرتے ہوئے سرمایہ دار کے ہاتھوں اس کے استحصال پر اپنے دلی کرب کا اظہار کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی اسے یہ خوش خبری بھی سناتے ہیں کہ اب مشرق و مغرب میں اسی کے دور کا آغاز ہو رہا ہے لیکن اس قبیل کی نظموں یا اس طرح کے اشعار سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اقبال اشتراکی تھے غلط ہے۔ اصل میں ان اشعار میں اقبال موجودہ صورت حال سے اپنی شدید بے اطمینانی کو ظاہر کرتے ہیں اور سرمایہ داری کے استحصالی ماحول میں پیدا شدہ خرابیوں اور صنعتی اور زرعی محنت کشوں کی زبوں حالی کا تذکرہ کرتے ہیں جہاں تک ان خرابیوں کی تنقیص کا

؎ - اقبال اور نئی قومی ثقافت - تبسم کاشمیری - ص ۱۵۶

سوال ہے اقبال کارل مارکس اور اُن کے پیروؤں سے اتفاق کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ کارل مارکس کے لیئے کلیمِ بے تجلّی اور مسیحِ بے صلیب کے القابات استعمال کرتے ہیں لیکن جہاں اس نظام کے بدل کا مسئلہ آتا ہے اقبال مارکس سے قطعی الگ ہو جاتے ہیں۔ اقبال تمام سماجی امراض کے لیے قرآنی حل ہی کو اکسیرِ اعظم کا درجہ دیتے ہیں۔ ضربِ کلیم کی ایک نظم اشتراکیت میں فرماتے ہیں:۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم ۔۔۔ بے سود نہیں روس کی یہ گرمیِ گفتار

اندیشہ ہوا شوخیِ گفتار پہ مجبور ۔۔۔ فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار

انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر ۔۔۔ کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں ۔۔۔ اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرفِ قُلِ العفو میں پوشیدہ ہے اب تک ۔۔۔ اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اقبال صرف اسلام اور اسلام کے پیش کردہ نظامِ حیات ہی کو انسان کی تمام ضرورتوں کو خواہ وہ جسمانی ہوں یا روحانی، پورا کرنے کا اہل سمجھتے ہیں۔ یہ ان کا ابتدائی مسلک بھی تھا۔ اور آخر وقت تک وہ اسی پر قائم رہے۔ ہاں ۱۹۲۰ء کے بعد کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کی شاعری پر اس دور میں مزدوروں کی نسبت اُن کے رویئے کو دیکھ کر بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ شکوک پیدا ہو گئے تھے کہ اقبال سوشلزم کے فلسفے کے قائل ہو گئے ہیں اس لئے اس دور میں بہت سے خطوط ایسے ملتے ہیں جن میں انہوں نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے ان میں سے اکثر خطوط ۱۹۲۳ء میں لکھے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پیامِ مشرق اور بانگِ درا کی کچھ نظمیں ہی ان شکوک کی بنیاد بنی تھیں۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ایک خط میں سوشلزم کے بارے میں استفسار کیا تو اقبال نے جواب میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:۔

"میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم اور زمانۂ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوعِ انسان کے لیے ہر نقطۂ نگاہ سے موجبِ نجات ہو سکتی ہے۔ میرے کلام پر ناقدانہ نگاہ ڈالنے سے پہلے حقائقِ اسلامیہ کا

مطالعہ ضروری ہے۔ آپ نے میرے کلام کا بھی بالاستعیاب مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اس طرف بھی توجہ کریں۔“ [۱]

اس ضمن میں اقبال کا وہ خط جو انہوں نے مدیر 'زمیندار' کے نام لکھا اور جو ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کو شائع ہوا خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس خط کا پس منظر یہ ہے کہ ۲۳ جون ۱۹۲۳ء کے روزنامہ 'زمیندار' میں 'انقلاب' کے سابق ایڈیٹر شمس الدین حسن کا ایک مضمون شائع ہوا۔ موصوف سرگرم اشتراکی تھے۔ اس مضمون میں انہوں نے کامریڈ غلام حسن کا دفاع کیا تھا۔ کامریڈ غلام حسن پشاور کے ایک کالج میں استاد تھے۔ ملازمت چھوڑ کر لاہور آ گئے تھے اور اشتراکی تحریک کے سرگرم رکن بن گئے تھے۔ انہیں حکومت نے بالشویک سازش میں گرفتار کیا تھا۔ مذکورہ بالا مضمون میں شمس الدین حسن نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اشتراکیت کی حمایت کوئی قابل تعزیر جرم نہیں ہے کیوں کہ علامہ اقبال بھی بالشویک خیالات رکھتے ہیں۔ انہوں نے لکھا تھا:

”اگر بالشویک خیالات کا حامی ہونا جرم ہے تو پھر ہمارے ملک کا سب سے بڑا شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کیوں قانون کی زد سے بچ سکتا ہے کیوں کہ بالشویک نظام حکومت کارل مارکس کے فلسفہ سیاسیات کا لب لباب ہے اور کارل مارکس کے فلسفہ کو عام فہم زبان میں سوشلزم یا کمیونزم کہا جاتا ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی تھوڑی سی عقل کا مالک بھی سر محمد اقبال کی 'خضر راہ' اور 'پیام مشرق' کو بغور دیکھے تو وہ فوراً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ علامہ اقبال یقیناً ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغ اعلیٰ بھی ہیں۔ 'پیام مشرق' میں 'قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور' اور 'نوائے وقت' کے عنوان سے جو مختصر سی نظمیں لکھی ہیں، ان سے قطع نظر کر کے صفحہ ۱۵۶، کی غزل کا مطلع ملاحظہ ہو:

بامن میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست	تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست

کیا ایسے اشعار کی موجودگی میں کسی کو شک ہو سکتا ہے کہ علامہ اقبال ایک انتہائی خیالات رکھنے والے اشتراکی نہیں۔“ [۲]

---

[۱] اقبال نامہ جلد دوم۔ ص ۳۱۴ ؛ [۲] بحوالہ گفتار اقبال۔ مرتبہ محمد رفیق افضل، لاہور ۱۹۶۹ء ص ۵۰ ؛

'زمیندار' میں یہ مضمون چھپا تو کسی نے اقبال سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے اسی دن ایک خط 'زمیندار' کے ایڈیٹر کے نام لکھا جو اگلے روز یعنی ۲۴ جون ۱۹۳۳ء کو شائع ہو گیا۔ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال 'بالشویک خیالات' کے بارے میں ذکی الحس تھے اور انہیں یہ گوارا نہیں تھا کہ انہیں 'اشتراکی' کہا جائے۔ یہ خط اس وجہ سے خاصا اہم ہے کہ اس سے اقبال کا نقطۂ نظر مکمل طور پر معلوم ہو جاتا ہے اور اس ضمن میں کسی قسم کی غلط فہمی کا امکان ہی باقی نہیں رہتا۔ اس خط کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے مکمل طور پر نقل کیا جاتا ہے:-

"میں نے ابھی ایک دوست سے سنا ہے کہ کسی صاحب نے آپ کے اخبار میں یا کسی اور اخبار میں (میں نے اخبار ابھی تک نہیں دیکھا) میری طرف بولشویک خیالات منسوب کئے ہیں۔ چونکہ بولشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے اس واسطے اس تحریر کی تردید میرا فرض ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قانون میراث، حرمتِ ربا اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے اور فطرتِ انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابلِ عمل بھی ہے۔ روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردِ عمل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بولشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے اور جس کا میں نے اوپر اشارتہً ذکر کیا ہے۔ شریعت حقہ اسلامیہ کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے اور اس مدعا کے حصول کے لیے میرے عقیدے کی رُو سے

وہی راہ آسان اور قابلِ عمل ہے جس کا انکشاف شارع علیہ السلام نے کیا ہے۔ اسلام سرمایہ کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا بلکہ فطرتِ انسانی پر ایک عمیق نظر ڈالتے ہوئے اسے قائم رکھتا ہے اور ہمارے لئے ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی نعمت ہے۔ میرا عقیدہ ہے فأصبحتم بنعمته اخواناً میں اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن نہیں جس کا مقصود سرمایہ داری کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنا ہے۔ یورپ اس نکتہ کو نظرانداز کرکے آج آلام و مصائب کا شکار ہے۔ میری دلی آرزو ہے کہ بنی نوع انسان کی تمام قومیں اپنے اپنے ممالک میں ایسے قوانین وضع کریں جن کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق و تولید ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کرکے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی جس کے اصولِ اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے۔ موجودہ حالات میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محمود کیوں نہ ہو ان کے طریق عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کے پولیٹیکل اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآنِ کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظرِ غائر ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔ لاہور کی پیپر یونین کے مسلمان ممبر بالخصوص اس طرف توجہ کریں۔

مجھے ان کے اغراض و مقاصد کے ساتھ دلی ہمدردی ہے مگر مجھے امید ہے کہ وہ کوئی ایسا طریق عمل یا نصب العین اختیار نہ کریں گے جو قرآنی تعلیم کے منافی ہو۔" [۱]

اس خط کے علاوہ جو اصل میں بالشویک خیالات سے اعلان برأت کی حیثیت رکھتا ہے اقبال نے کئی اور خطوط میں بھی اس موضوع کو چھیڑا ہے۔ خواجہ غلام السیدین کے نام ایک خط میں اقبال لکھتے ہیں:۔

"سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا جس کی تشریح میں نے اپنی تحریروں میں جابجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے۔ اس کی تردید میں نے جابجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔" [۲]

'ایک قسم کا سوشلزم' کہہ کر اقبال نے اسلام کے اندر اس روح کی نشاندہی کی ہے جو سوشلزم کا بھی مقصود ہے۔ یہاں اقبال کے پیش نظر اسلام کا وہ سماجی نظام ہے جس میں سماجی انصاف کے حصول کے لیے وافر سامان موجود ہے۔ بالشوزم اور اسلام کے اقتصادی نظام کے بنیادی فرق کو ظاہر کرتے ہوئے اقبال ڈاکٹر ریاض الحسن کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اسلامی معاشیات کی روح یہ ہے کہ سرمائے کی بڑی مقدار میں اضافے کو ناممکن بنا دیا جائے۔ مسولینی اور ہٹلر کا انداز فکر بھی یہی تھا۔ بالشوزم نے سرمایہ داری کا کلیتاً خاتمہ کرکے انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسلام زندگی کے تمام پہلوؤں میں ہمیشہ اعتدال کا راستہ اختیار کرتا ہے، قرآن کہتا ہے:۔

---

[۱] خطوط اقبال۔ رفیع الدین ہاشمی۔ ص ۱۵۵۔۱۵۷ [۲] اقبال نامہ۔ جلد اول۔ ص ۳۱۸

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ
يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔" ؎۱

سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام اقبال نے ۳۰ جولائی ۱۹۳۱ء کے خط میں بالشوزم اور اسلام کے مدغم ہونے کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔ یہ خط سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع ہوا تھا۔ اس خط میں اقبال نے اُمید ظاہر کی ہے کہ حالات سُدھرتے ہی روسی مذہب کی طرف لوٹ آئیں گے۔ اقبال لکھتے ہیں:۔

"ذاتی طور پر میں نہیں سمجھتا کہ روسی فطرتاً لا مذہب ہیں۔ اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ روسی عورتیں اور مرد بڑے گہرے مذہبی رجحانات رکھتے ہیں اور روسی ذہن کا موجودہ منفی رجحان ہمیشہ باقی نہیں رہے گا کیونکہ کوئی عمرانی نظام دہریت کی اساس پر باقی نہیں رہ سکتا۔ جونہی اس ملک میں حالات ٹھیک ہو جائیں گے اور اس کے باشندوں کو اطمینان سے غور کرنے کا وقت ملے گا وہ مجبوراً اپنے نظام کی کوئی مثبت بنیاد تلاش کریں گے۔"

"چونکہ بالشویت کے ساتھ خدا کا قائل ہونا اور اسلام تقریباً ایک ہی چیز ہیں۔ اس لئے مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوگا کہ اگر وقت گزرنے پر روس اسلام کو ہضم کر لے یا اسلام روس کو۔ میری نظر میں نتیجہ بڑی حد تک اس مقام پر ہوگا جو نئے آئین کے تحت ہندوستانی مسلمانوں کو دیا جائے گا۔" ؎۲

یہاں اقبال کا قطعی یہ مطلب نہیں ہے کہ کمیونزم اور خدا پر ایمان کا ملغوبہ عینِ اسلام ہے۔ یہاں لفظ "تقریباً" خاص طور پر توجہ طلب ہے۔ یہاں بھی اقبال کی مُراد وہی ہے جس کا اظہار انہوں نے غلام السیدین کے نام مکتوب میں "ایک قسم کا سوشلزم" کہہ کر کیا ہے جس کی وضاحت اوپر آ چکی ہے۔ بہرحال یہاں اس بات کا اعادہ کرنا کچھ ایسا بے جا نہ ہوگا کہ اسلام اور سوشلزم میں مماثلت کم اور تخالف زیادہ ہے۔ اسلام کا لفظ ایک ہمہ جہت لفظ ہے اس کی معنویت کا احاطہ کوئی دوسرا لفظ

؎۱ خطوطِ اقبال۔ رفیع الدین ہاشمی۔ ص ۲۲۹۔
؎۲ بحوالہ اقبال اور سوشلزم۔ جسٹس ایس۔ اے رحمان، دہلی، ص ۱۴۱۔

نہیں کر سکتا اور یہ خود اپنے اندر مختلف نظاموں اور زندگی کی مختلف اُمنگوں کا ترجمان ہے۔ یہ لفظ ایک معاشی نظام کا بھی ترجمان ہے اور ایک روحانی نظام کا بھی۔ یہ لفظ ایک تہذیبی ڈھانچے اور مادی نظام کا احاطہ بھی کرتا ہے اور یہ سب ایک دوسرے سے نہ صرف مربوط ہیں بلکہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بھی ہیں۔ اس میں سے اگر اس کے روحانی نظام کو ہم الگ کر دیں، تو اس کا سارا ڈھانچہ منہدم ہو جائے گا۔ اسلام کا درجہ دوسرے نظام ہائے زندگی سے اس لئے بھی بلند اور جُدا ہے کہ اس میں افراط و تفریط کے بجائے اعتدال کی راہ ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوشلزم اور اسلام آپس میں منطبق نہیں ہو سکتے، ان کے معاشی نظام بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ سوشلزم جہاں سرمایہ داری کو کلی طور پر اپنے نظام سے خارج کر دیتا ہے۔ اسلام اسے اعتدال کے ساتھ اپنے معاشی نظام میں باقی رہنے کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام کی رُو سے سرمایہ داری اگر اپنے حدود میں رہے تو انسانی معیشت میں تخریب کے بجائے اس کی تعمیر کے لیے کام کرے گی۔ اسلام میں سرمائے کو غیر مرتکز کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اسی بنا پر جب اقبال اسلام اور اشتراکیت کو تقریباً ایک ہی چیز کہتے ہیں تو اس سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے اس ضمن میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی یہ رائے بڑی وقیع ہے جو انہوں نے سوشلزم کے بارے میں اقبال کے رویئے کے سلسلے میں پیش کی ہے وہ لکھتے ہیں :-

"سوشلزم کے متعلق اقبال کا رویہ ہمدردانہ ہے۔ وہ سرمایہ داری کی موجودہ صورت کو انسانیت کے لیے مضر سمجھتے ہیں۔ انہیں مزدوروں کے ساتھ سچی ہمدردی ہے اور وہ دولت کی منصفانہ تقسیم کے مؤید ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال اشتراکیت کے مادی فلسفے کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں مگر وہ اس جور و استبداد کا خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں جو قیصریت کے پردے میں مزدوروں پر روا رکھا جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا نظام چاہتے ہیں جس میں مزدوروں کو اُبھرنے کا موقعہ ملے اور وہ انسانیت کے کسی حق سے محروم نہ رکھے جائیں۔"

اپنی نظم خضرِ راہ میں انہوں نے سرمایہ و محنت کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے موصوف، سرمایہ دارانہ نظام کی مذمت کی تھی اور مزدوروں کی حمایت میں اپنی آواز

بُننی کی تھی۔ انہوں نے مزدوروں کو ایک روشن مستقبل کی خوشخبری سُنائی تھی۔ پیامِ مشرق میں بھی انہوں نے اس کی ہمنوائی کی ہے۔

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز — مئے کہ شیشہ گدازد بہ ساغر اندازیم
مغان و دیرِ مغان را نظامِ تازہ دہیم — بنائے میکدہ ہائے کہن را بر اندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم — بہ بزمِ غنچہ و گُل طرحِ دیگر اندازیم
بہ طوفِ شمع چو پروانہ زیستن تا کے — ز خویش این ہمہ بیگانہ زیستن تا کے [1]

اقبال کو سوشلزم سے اگر کوئی دلچسپی تھی تو صرف اس حد تک کہ اس کی وجہ سے ملوکیت، کلیسا کی پاپائیت اور سامراجیت کے بت ٹوٹتے نظر آنے لگے تھے۔ اقبال نے کہیں بھی سوشلزم کے معاشی نظریات سے ان معنوں میں کوئی وابستگی یا پسندیدگی ظاہر نہیں کی ہے کہ یہ نظام اسلام کے معاشی نظام پر کسی طرح کا تفوق رکھتا ہے۔ اقبال جیسا کہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے۔ اسلام کو ایک بھرپور نظامِ حیات تصور کرتے تھے محمد علی جناح کے نام ایک خط میں وہ اسلام کو ہی موجودہ اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"کوئی سیاسی جماعت جو عام مسلمانوں کی بہبودی کی ضامن نہ ہو عوام کے لیے باعثِ کشش نہیں ہو سکتی۔ جواہر لال نہرو کی منکرِ خدا اشتراکیت مسلمانوں میں کوئی تاثر پیدا نہیں کر سکے گی۔ لیگ کا مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لیے کیا کوشش کرتی ہے۔ خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ میں اس مسئلے کا حل موجود ہے۔ اس کے لیے ملک کی تقسیم کے ذریعے ایک یا زائد اسلامی ریاستوں کا قیام اشد ضروری ہے۔ کیا آپ کی رائے میں اس مطالبے کا وقت نہیں آ پہنچا؟" [2]

ہندوستانی سیاست اور تصورِ پاکستان:۔ اقبال نے عملی سیاست میں اگرچہ بہت بعد میں قدم

---

[1] ۔ اسلوب احمد انصاری ۔ اقبال شاعرِ صد رنگ (مرتبہ سلیم اختر) ص ۱۰۳ - ۱۰۴۔

[2] ۔ روحِ مکاتیبِ اقبال ۔ محمد عبداللہ قریشی ۔ ص ۳۸۶۔

رکھا، لیکن سیاست سے انہیں آغازِ شعور ہی سے لگاؤ رہا جس کا اظہار ان کی ابتدائی دَور کی شاعری میں ہوتا ہے۔ ان کی اس دَور کی کئی نظمیں اس بات کی شاہد ہیں کہ وہ ہندوستان کے سیاسی مسائل سے نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے بلکہ ان مسائل پر غور وفکر بھی کرتے تھے اور غور وفکر کا نچوڑ اپنی شاعری کے ذریعے عوام تک پہنچاتے تھے۔ 'ہمالہ'، 'نیا شوالہ'، 'پرندہ کی فریاد'، 'صدائے درد'، 'سید کی لوحِ تربت' وغیرہ نظمیں جو ۱۹۰۵ء سے قبل لکھی گئی ہیں، ان کے اس دَور کے سیاسی افکار کی ترجمان ہیں۔ ان نظموں میں جہاں اقبال نے وطن پرستی کا پرچار کیا ہے وہاں فرقہ پرستی سے بیزاری بھی ظاہر کی ہے اور ہندوستان کی غلامی کا ماتم بھی کیا ہے۔ اسی دَور کی ایک نظم 'ترانۂ ہندی' کے بارے میں مہاتما گاندھی نے ۱۹۳۸ء میں لکھا تھا کہ:۔

"ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بارے میں کیا لکھوں؛ لیکن میں اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم 'ہندوستاں ہمارا' پڑھی تو میرا دل بھر آیا اور واردھا جیل میں تو سینکڑوں بار میں نے اسی نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔" لہ

غرض اس دور میں اقبال نے جن خیالات کا اظہار اپنی نظموں میں کیا وہ اپنے سیاسی ماحول سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہیں۔ وطن سے محبت اور غلامی کا احساس اس دَور کے سیاسی شعور کی نمایاں خصوصیات رہی ہیں اور یہ خصوصیات اقبال کے یہاں بھرپور انداز میں اُبھری ہیں۔ فرقہ پرستی کی ابتداء اگرچہ اس دَور میں ہو چکی تھی اور آخر میں اس کی جڑیں ذرا گہری ہو چکی تھیں تاہم اس میں وہ تندی اور تلخی ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی، جو بعد کو دیکھنے میں آئی۔ اقبال نے اس فرقہ پرستی کے خلاف اپنے ردِ عمل کا اظہار بھی کیا۔ ۱۹۰۵ء میں اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ یہاں سے اقبال کی زندگی کا دوسرا دَور شروع ہوتا ہے۔ یہ سال اس وجہ سے بھی ہندوستان سیاست میں ایک اہم سال ہے کہ اس سال انگریزوں نے بنگال کی تقسیم کی جس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف کی آگ بھڑک اٹھی۔ مسلمان اس تقسیم کے حق میں تھے کیونکہ اس طرح سے انہیں مشرقی بنگال میں واضح

لہ جوہر (اقبال شمارہ) ۱۹۳۸ء۔ (خط بنام ایڈیٹر)

اکثریت حاصل ہو جاتی تھی۔ لیکن ہندوؤں نے اس تقسیم کی مخالفت کی اور اس طرح سے متعدد مقامات پر ہندو مسلم فسادات رونما ہوئے۔ بنگال کے ان واقعات کا اثر سارے ملک پر پڑا اور ہندو مسلم اختلاف کی خلیج زیادہ وسیع ہو گئی۔ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کے چند مقتدر اشخاص نے جن میں نواب محسن الملک اور وقار الملک شامل تھے، وائسرائے کے سامنے مسلمانوں کے حقوق سے متعلق ایک یادداشت پیش کی۔ یہ یادداشت آغا خان کی قیادت میں ایک وفد نے پیش کی۔ اس میں اور باتوں کے علاوہ جداگانہ انتخاب پر زور دیا گیا تھا اور سرکاری ملازمتوں میں مناسب حصہ طلب کیا گیا تھا۔[۱]

اسی سال یعنی دسمبر ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس طرح سے مسلمان پہلی بار ایک سیاسی پلیٹ فارم پر آ گئے۔ لندن میں بھی سید امیر علی کی کوششوں سے ایک کمیٹی قائم ہوئی جس کا الحاق کل ہند مسلم لیگ سے کیا گیا۔ اقبال اس زمانے میں انگلستان میں تھے اور وہ بھی اس کمیٹی کے ممبر بن گئے۔[۲] ۱۹۰۶ء میں ہندوؤں نے ایک جماعت "ہندو مہاسبھا" کے نام سے قائم کی۔ اس جماعت نے جداگانہ انتخاب اور مسلمانوں کے لیے نشستوں کے تعین کے خلاف تحریک شروع کر دی۔ منٹو مارلے اسکیم کی منظوری تک یعنی ۱۹۰۹ء تک مسلمانوں اور ہندوؤں میں سیاسی کشمکش جاری رہی۔ ۱۹۰۹ء کے اواخر میں یہ اسکیم قانون بن گئی اور ۱۹۱۰ء میں اس کا نفاذ ہو گیا اور اس کی رو سے مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دیا گیا اور پنجاب کے علاوہ تمام صوبائی کونسلوں میں ان کے لیے کچھ علاحدہ نشستیں بھی متعین کر دی گئیں۔ ہندو مہاسبھا تو پہلے ہی مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کی مخالفت کرتی تھی، کانگریس نے بھی تقسیم بنگال اور جداگانہ انتخاب پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۱۱ء میں دہلی میں دربار تاجپوشی کے موقعہ پر تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کیا گیا۔ یہ اعلان مسلمانوں کے اس اعتماد پر جو انہیں انگریزوں پر تھا، برق بن کر گرا۔ چنانچہ جہاں کانگریس نے اس اعلان کا خیر مقدم کیا وہاں مسلم لیگ نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔

---

[۱] یادداشت کے متن اور وفد کے ممبران کی فہرست کے لیے دیکھیے۔ تحریک پاکستان تاریخی دستاویزات۔ (انگریزی) مرتبہ جی۔ علانہ۔ ص ۵۔ ۱۵۔

[۲] سیاست ملیہ۔ از محمد زبیر مارہروی (آگرہ ۱۹۴۱ء) ص ۵۹۔

اور انگریزی حکومت کے تئیں مسلمانوں کے رویئے میں زبردست تبدیلی آگئی۔ اس زمانے میں ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جن سے مسلمانوں میں بے چینی اور بے اطمینانی پیدا ہوئی۔ جنگ بلقان اور خلافتِ ترکیہ کے معاملات میں انگریزوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا، اس سے مسلمان کے دل حکومت کی طرف سے بالکل پھر گئے، ملک کے اندر جو واقعات ہوئے ان میں پہلا تو بنگال کی تقسیم کی تنسیخ کا اعلان اور مسجد کانپور کی شہادت کا واقعہ۔ شہادتِ مسجد کانپور کے سلسلے میں مسلمانوں نے زبردست احتجاج کیا چنانچہ حکومت حرکت میں آگئی اور اس سلسلے میں کئی مسلمان شہید ہو گئے۔ مولانا محمد علی جوہر اور سر وزیر حسن لندن گئے کہ حکومت برطانیہ کے سامنے واقعات کی توضیح کی جائے لیکن وزرائے سلطنتِ برطانیہ نے ملنے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کی وجہ سے مسلمانوں کے جذبات میں ایک تلاطم پیدا ہو گیا۔ اس زمانے میں اقبال ۱۹۰۸ء تک تو انگلستان اور جرمنی میں تھے، ۱۹۰۸ء میں وہ واپس ہندوستان آئے۔ قیام یورپ کے دوران میں ہی ان کے سیاسی خیالات میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے وہ وطن کے پرستار تھے، وطن کو ہی وہ مرکزِ اتحاد سمجھتے تھے لیکن اب ان کی لے بدل گئی تھی۔ اب وطن کے بجائے ملت ان کی نظروں میں مرکزِ اتحاد بن گئی۔ ان زمانے کی غزلوں میں ان کا ایک شعر یہ بھی ہے:۔

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اس موضوع پر غالباً ان کا یہ پہلا شعر ہے۔ اقبال کے نقطۂ نظر میں یہ ایک واضح اور غیر مبہم تبدیلی تھی۔ مولانا عبدالسلام ندوی اس تبدیلی کے دو اسباب بیان کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ قیام یورپ کے زمانے میں اقبال کو مغربی وطن پرستی کے نتائج سے آگاہی ہوئی کہ تصورِ وطنیت کا راست نتیجہ قوموں کی آپس میں رشک و رقابت ہے۔ دوسرے لفظوں میں وطن کو انسانوں کے لیے اتحاد کا مرکز بنانا خود انسانیت کے لیے مضرت رساں ہے۔ دوسرا سبب انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ قیام یورپ سے پہلے اقبال کے خیالات کا رخ مادیت کی طرف تھا جبکہ اس قیام کے بعد وہ روحانیت کی طرف مائل ہو گئے اور اس لئے انھوں نے انسانی اخوت کی بنیاد مادیت کی بجائے روحانی ملت پر رکھی۔

خود اقبال نے اس ذہنی تبدیلی کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:۔

"میں نظریۂ وطنیت کی تردید اس زمانے سے کر رہا ہوں جب کہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریۂ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔"[1]

اقبال نے وطنیت کے نظریۂ کو ترک کرکے ملیت کے مسلک کو جن وجوہ کی بنا پر اختیار کیا، ان میں غالباً ایک وجہ ہندوستان کے سیاسی حالات اور ہندو اور مسلمانوں کی حصولِ اقتدار کے لیے باہمی کشمکش بھی تھی۔ ہندوستان کے سیاسی حالات نے اقبال کے ذہن وفکر پر اثر ڈالا یا نہیں۔ اس بارے میں رائے کا اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اس حقیقت سے اختلاف کرنا مشکل ہے کہ اقبال کے ذہن وفکر کی اس تبدیلی نے ہندوستان کی سیاست پر گہرے نقوش چھوڑے اس تبدیلی نے ہندوستان میں مسلم قومیت کی نشوونما کے لیے ایک فلسفیانہ بنیاد فراہم کردی اور پہلی بار ہندوستان میں مسلم تشخص کے تحفظ کی بات ہونے لگی، ۲۸ مارچ ۱۹۰۹ء کو اقبال منشی غلام قادر فرخ امرتسری کے نام ایک خط میں اس ذہنی تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"میں خود اس خیال کا حامی رہ چکا ہوں کہ امتیازِ مذہب اس ملک سے اُٹھ جانا چاہیئے اور اب تک پرائیویٹ زندگی میں اس پر کاربند ہوں مگر اب میرا یہ خیال ہے کہ قومی شخصیت کو محفوظ رکھنا ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے مفید ہے۔ ہندوستان میں ایک مشترک قومیت پیدا کرنے کا خیال اگرچہ نہایت خوبصورت ہے اور شعریت سے معمور ہے، تاہم موجودہ حالات اور قوموں کی نادانستہ رفتار کے لحاظ سے ناقابل عمل ہے۔"[2]

---

[1] مضامین اقبال۔ مرتبہ تصدق حسین تاج۔ (حیدر آباد دکن) ص۔ ۱۶۱۔

[2] روح مکاتیب اقبال۔ محمد عبداللہ قریشی۔ ص ۸۵۔

انگلستان سے واپسی پر اقبالؔ کچھ دیر تک پروفیسری اور بیرسٹری کرتے رہے ڈیڑھ سال کے بعد انہوں نے پروفیسری چھوڑ دی اور صرف وکالت کرتے رہے۔ اِس دور میں بھی وہ سیاسیات سے بالکل علاحدہ نہیں رہے بلکہ جو تعلق انہیں لندن میں مسلم لیگ سے پیدا ہو چکا تھا، اسے یہاں آکر بھی برقرار رکھا۔ ان کے ایک قریبی دوست مرزا جلال الدین لکھتے ہیں:۔

"تعلیم سے فارغ ہو کر جب وہ وطن واپس آئے تو صوبائی مسلم لیگ کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ اِس لیگ کے صدر مولوی شاہ دین مرحوم تھے۔ سر محمد شفیع سکریٹری تھے اور میں اسسٹنٹ سکریٹری۔ اقبالؔ آئے تو قدرتی طور پر لیگ کی جاذبیت نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ بھی ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو گئے۔" [ا]

مسلم لیگ میں ان کی شمولیت دراصل اِس سیاسی عقیدہ کی بناء پر تھی کہ:۔

"مسلمان کسی دوسری جماعت میں مدغم ہو کر اپنی ملی حیثیت کو کھو دینے کی بجائے اپنی سیاسی تنظیم کے لیے خود کوشش کریں۔" [۲]

۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان ہوا جس کا ذکر قبل ازیں آچکا ہے۔ اس اعلان سے مسلمان بد دل ہو گئے۔ اقبالؔ نے اس تنسیخ کا کیا اثر لیا۔ اِس کا اظہار اس خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے ۱۴ دسمبر ۱۹۱۱ء کو عطیہ بیگم فیضی کو لکھا۔ لکھتے ہیں کہ:۔

"ہندوؤں نے بنگال کے دو حصّوں (ہندو بنگال اور مسلم بنگال) میں تقسیم کو حکومت کی طرف سے بنگالی قومیت کے قلب پر ضرب کاری سے تعبیر کیا ہے لیکن حکومت نے دہلی کو دار السلطنت قرار دے کر اپنے فیصلے کی خود ہی پوری ہوشیاری سے تنسیخ بھی کر دی ہے۔ بنگالی سمجھتا ہے جیت اس کی رہی لیکن اسے نظر نہیں آتا کہ اِس کی اہمیت گھٹا کر صفر کر دی گئی ہے۔ اِس مسئلہ سے متعلق دو شعر ہو گئے ہیں:۔

[ا]، [۲] ملفوظات اقبال۔ مرتبہ محمود نظامی (لاہور) ص ۶۴۔

مندمل زخمِ دلِ بنگال آخر ہو گیا — وہ جو تھی پہلے تمیزِ کافر و مومن گئی
تاجِ شاہی آج کلکتے سے دہلی آگیا — مل گئی بابو کو جوتی اور پگڑی چھن گئی ؎ ل

جولائی ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ ہندوستان کی دونوں سیاسی پارٹیوں کانگریس اور مسلم لیگ نے حکومت کو اپنے اپنے تعاون کی پیش کش کی۔ کانگریس نے تعاون کے سلسلے میں یہ شرط لگادی کہ حکومت اپنے لوکل سیلف گورنمنٹ کے وعدے کو پورا کرے۔ کانگریس میں کچھ لوگوں کو اس سے اختلاف تھا چنانچہ ہوم رول لیگ قائم ہوئی اور انتہا پسند اس میں شامل ہو گئے۔ ترکی کے جنگ میں شامل ہونے سے ہندوستانی مسلمان مضطرب ہو گئے۔ اور حکومت نے مسلم لیڈروں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کو ترکی سے ہمدردی رکھنے کی بناء پر قید کیا ان کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خان کی نظر بندی عمل میں آئی۔ ۱۹۱۶ء میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا عزیز گل کو ریشمی رومال کی سازش میں گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔ ظاہر ہے ان گرفتاریوں کے باعث مسلمانوں میں حکومتِ برطانیہ کے خلاف ایک مرتبہ پھر نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ لیکن اس سے ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ مسلمان اور ہندو دونوں اس میں مفاہمت کی باتیں سوچنے لگے۔ اور ۱۹۱۶ء میں دونوں جماعتوں کے مابین وہ معاہدہ طے پایا گیا جو میثاقِ لکھنؤ کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ میثاق ہندوستانی سیاست میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میثاق نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپسی کش مکش کا خاتمہ کر کے انہیں متحد کر دیا۔ اس کے ذریعہ مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دیا گیا تھا اور صوبائی لیجسلیچروں میں مسلم نشستوں کا تعین اس طرح سے کیا گیا تھا کہ جہاں مسلمان اکثریت میں تھے وہاں ان کی آبادی کے تناسب سے کچھ نشستیں کم کر دی گئی تھیں اور جہاں وہ اقلیت میں تھے وہاں ان کو آبادی کے تناسب سے کچھ زیادہ نشستیں دی گئی تھیں۔ اسی طرح سے مرکزی کونسل میں بھی مسلمانوں کی نشستوں کی تعداد ایک تہائی کے برابر مان لی گئی تھی۔ اس میثاق کی باضابطہ توثیق کانگریس اور لیگ کے علاحدہ علاحدہ اجلاسوں میں لکھنؤ میں ہوئی۔ اس زمانے میں لیگ اور کانگریس کے اجلاس ایک ہی

ل۔ اقبال نامہ۔ حصہ دوم۔ ص ۱۵۲۔ ۱۵۳۔

جگہ منعقد ہوتے تھے اور اس میثاق کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کی کوششیں ہوتی تھیں۔

اس زمانے میں اقبالؔ نے سیاسی معاملات میں عملاً کوئی دلچسپی نہیں لی بلکہ وہ ان سارے ہنگاموں سے الگ تھلگ اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کی تخلیق میں مصروف تھے۔ اسرارِ خودی کی تصنیف سے وہ ۱۹۱۵ء میں فارغ ہوئے اور رموزِ بے خودی جو ۱۹۱۵ء میں ہی شروع کی تھی ۱۹۱۸ء میں پایۂ تکمیل تک پہنچی۔ اس دور میں اُن کی ذہنی کیفیت کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے ۱۹۱۴ء میں مولانا شوکت علی کے نام لکھا تھا۔ مولانا شوکت علی نے اقبالؔ کو اولڈ بائز ایسوسی ایشن ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ اقبالؔ شرکت سے معذرت چاہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"بھائی شوکت، اقبالؔ عزلت نشین ہے اور اس طوفانِ بے تمیزی کے زمانے میں گھر کی چار دیواری کو کشتی نوح سمجھتا ہے۔ دنیا اور اہلِ دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ضرور ہے مگر محض اس وجہ سے کہ روٹی کمانے کی مجبوری ہے۔ تم مجھے علی گڑھ کالج بلاتے ہو۔ میں ایک عرصہ سے خدا گڑھ میں رہتا ہوں اور اس مقام کی سیر کئی عمروں میں ختم نہیں ہو سکتی۔ علی گڑھ والوں سے میرا سلام کہئے۔ مجھے ان سے غائبانہ محبت ہے اور اس قدر کہ ملاقاتِ ظاہری سے اس میں کچھ اضافہ ہونے کا امکان بہت کم ہے۔" ؎

اس خط سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پہلی عالمی جنگ کے دوران ہندوستان اور ہندوستان سے باہر جو حالات تھے اسے اقبالؔ طوفانِ بے تمیزی سے تعبیر کرتے ہیں اور خود نہ صرف سیاسی بلکہ غیر سیاسی جلسوں اور جلوسوں سے بھی اجتناب کرتے ہیں۔ جنگ کے بعد ۱۹۱۹ء میں رولٹ بل پاس ہوا جس کی رُو سے عدالتوں اور پولیس کے اختیارات میں زبردست اضافہ ہوا۔ اس قانون کی مخالفت ہوئی اور گاندھی جی نے اس قانون کے خلاف ستیہ گرہ کا اعلان کر دیا۔ اسی دوران میں جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آیا جہاں جنرل ڈائر نے نہتے اور پُر امن عوام پر گولیاں چلوائیں۔ پورے پنجاب میں مارشل لا لگو کیا گیا جس کے

؎۔ اقبال نامہ۔ حصہ اوّل۔ ص ۲۵۵۔

نتیجے میں عوام پر مظالم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ رولٹ ایکٹ اور مظالم پنجاب کے باعث سارے ملک میں ایک اشتعال پیدا ہوا جس کا نتیجہ ترک موالات کی صورت میں نکلا۔ اور ۱۹۲۰ء میں سارا ملک اس تحریک میں شریک ہو گیا۔ مسلمان بھی اس دور کی سیاست میں مکمل طور پر شریک تھے۔ اس کے علاوہ خلافت کے مسئلے نے مسلمانوں کو خاص طور پر بھڑکایا۔ ۱۹۱۹ء میں ہی خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی حکومت پر دباؤ ڈال کر اسے خلافت ترکیہ کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنے سے روکا جائے چنانچہ خلافت کمیٹی نے پہلے تو سارے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف احتجاجی جلسے کروائے اور پھر ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں ایک وفد یورپ روانہ کیا تاکہ اس مسئلے پر وہاں کی رائے عامہ کو استوار کیا جائے اور حکومت برطانیہ کے ارباب حل و عقد کے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کی وضاحت کی جائے لیکن یہ وفد اپنے مقاصد میں ناکام رہا۔

مسلمان حکومت برطانیہ کے رویئے سے رنجیدہ تھے ہی ہندوؤں نے بھی اس رویئے کو سخت نفرت سے دیکھا اور مسلمانوں کے اس دکھ میں شریک ہوئے۔ نتیجتاً تحریک ترک موالات خاصی کامیاب رہی۔ اسی اثنا میں علی برادران کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں دو سال کی قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ سول نافرمانی کی تحریک ابھی پھیل ہی رہی تھی کہ چورا چوری کا واقعہ پیش آیا اور گاندھی جی نے اس تحریک کو ختم کر دیا۔ ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی گرفتار ہوئے اور انہیں چھ برس کی سزا دی گئی۔

اس واقعے کے بعد ہندوستان کی سیاسی فضا کچھ بدلنے لگی۔ حکومت سے عدم تعاون کی تحریک کمزور پڑ گئی۔ پنڈت موتی لال نہرو کی قیادت میں سوراج پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اسی زمانے میں شردھانند جی نے شدھی (یعنی مسلمانوں کو ہندو بنانا) اور لالہ لاجپت رائے نے سنگھٹن (یعنی ہندوؤں کے مختلف فرقوں میں اتحاد پیدا کرنا) تحریک کا آغاز کیا اور دونوں تحریکوں نے آگے چل کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کی راہیں مسدود کر دیں بلکہ یہ تحریکیں کئی فسادات کی موجب بنیں۔

اس سارے دور میں اقبال بظاہر سیاسی سرگرمیوں سے لاتعلق رہے۔ اس دوران میں انہوں نے اپنی کتاب 'پیام مشرق' کی تکمیل کی۔ ہاں کبھی کبھی اشعار میں اپنے ارد گرد میں پیش آنے والے واقعات

اور حالات پر اپنا تاثر اور ردِ عمل ظاہر کرتے تھے، مثلاً مولانا محمد علی جوہر کی نظر بندی کے بارے میں انہوں نے یہ اشعار لکھے:۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند — قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے — مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر — کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دامِ قفس سے بہرہ مند
شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست — این سعادت قسمتِ شہباز و شاہین کردہ اند

خلافت تحریک کے سلسلے میں جب مولانا محمد علی جوہر کی سرکردگی میں ایک وفد یورپ بھیجے جانے کی بات طے ہو رہی تھی جس کا مقصد یورپی اقوام اور خاص طور پر حکومتِ برطانیہ کے اربابِ حل و عقد کے سامنے ادارۂ خلافت کی اہمیت، مسلمانوں کی اس سے وابستگی اور مملکتِ ترکیہ کی بقا و حفاظت کے مسئلے کو واضح کرنا تھا، اقبال نے اس سے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے یہ قطعہ لکھا:۔

بہت آزمایا ہے غیروں کو تو نے — مگر آج ہے وقتِ خویش آزمائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا — خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے — مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی
"مرا از شکستن چنیں عار ناید — کہ از دیگران خواستن مومیائی" [۱]

اس تضمین سے بادی النظر میں یہ شبہ ہوتا ہے کہ اقبال تحریکِ خلافت اور وفدِ خلافت کے خلاف تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کو وہ بنظرِ استحسان دیکھتے تھے بلکہ مستقبل میں اس کے دور رس اور اہم نتائج کے بارے میں پُر امید تھے۔ چنانچہ جب یہ وفد تقریباً سات ماہ کے بعد اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ناکام واپس آیا،

---

[۱] اقبال نامہ۔ حصہ اول۔ ص ۱۰۵۔ یہ تضمین بانگِ درا میں "دریوزۂ خلافت" کے عنوان سے شامل ہے۔ اقبال نے بانگِ درا میں شامل کرتے وقت اس کا پہلا شعر یوں بدل دیا:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے + تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی

تو اقبال نے سید سلیمان ندوی کے نام جو وفدِ خلافت کے ایک سرگرم رُکن تھے، ایک خط لکھا جس میں اس وفد کی کارکردگی کی تعریف کی۔ یہ خط ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو لکھا گیا ہے جبکہ وفد ۸ اکتوبر کو لوٹا تھا، لکھتے ہیں :۔

" مراجعت مع الخیر مبارک۔ آپ نے بڑا کام کیا ہے جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گزاری کی صورت میں مل رہا ہے اور دربار نبوی سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا۔ وزرائے انگلستان کا جواب وہی ہے جو ان حالات میں ہمیشہ دیا گیا ہے۔ انؤمن لبشرین مثلنا وقومہما لنا عبدون۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ ہندی وفد کا سفر یورپ بڑے اہم نتائج پیدا کرے گا۔" [1]

اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال وفدِ خلافت کے سفر کو مفید اور مناسب خیال کرتے تھے یہاں البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے پھر مذکورہ تضمین میں وفدِ خلافت پر پھبتی کیوں کسی تھی حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس تضمین میں مسلمانوں کو ان کی کمزوری کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اس میں خلافت تحریک پر طنز نہیں ہے اور نہ تحقیر ہے۔ زیادہ سے زیادہ اسے ایک ہمدرد کی تنقید کہا جا سکتا ہے۔ اگر فقیر سید وحید الدین کی وہ روایت جو اس سلسلے میں انہوں نے اپنی کتاب 'روزگار فقیر' میں درج کی ہے صحیح مان لی جائے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اقبال خود بھی اس تحریک سے نہ صرف وابستگی رکھتے تھے بلکہ پنجاب کی خلافت کمیٹی کے سکرٹری بھی رہ چکے تھے۔ فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں کہ اقبال نے اپنے بھائی شیخ عطا محمد سے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ :۔

" وہ (اقبال) بھی خلافت کمیٹی کے سکرٹری رہ چکے ہیں اور ساتھ ہی یہ ذکر بھی کیا کہ انہوں نے اس سے استعفےٰ دیا تھا۔" [2]

بایں ہمہ اقبال کو خلافت تحریک سے مجموعی طور پر اتفاق نہیں تھا اور نہ تحریک عدم تعاون سے۔ چنانچہ عدم تعاون کے سلسلے میں جب مولانا محمد علی لاہور آئے اور چاہا کہ اسلامیہ کالج لاہور کے اساتذہ

---

[1] اقبال نامہ۔ حصہ اول۔ ص ۱۱۲ ؎

[2] روزگار فقیر۔ جلد دوئم۔ مصنفہ سید وحید الدین (کراچی) ص ۔۱۸۰ ؎

اور طلباء بھی علی گڑھ کے اساتذہ اور طلباء کی طرح اس تحریک میں شامل ہوں تو اقبال نے اس کی مخالفت کی۔ اقبال ان دنوں اسلامیہ کالج کے سکریٹری تھے۔ بہر حال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہنگامہ آرائی کے اس پورے دور میں اقبال گوشہ نشین ہی رہے۔ اس کی کئی وجوہات تھیں سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ اقبال عملی سیاست سے عمداً خود کو الگ رکھنا چاہتے تھے انہوں نے اپنے لئے ایک جداگانہ دائرہ کار مقرر کیا تھا بلکہ ملک و ملت کے حالات و کوائف سے وہ بہر حال باخبر رہتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سیاسیات سے ان کی وابستگی عملی نہیں بلکہ ایک گونہ علمی تھی۔ عملی سیاست میں باقاعدہ وہ ۱۹۲۶ء میں آئے جب انہوں نے پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا چناؤ لڑا۔ ۱۹۲۳ء میں بھی ان کے دوستوں کا اصرار تھا کہ اقبال کونسل کی ممبری کے لیے بطور امیدوار کھڑے ہو جائیں لیکن اقبال نے کچھ تو اپنی افتادِ طبع کے باعث اور زیادہ تر میاں عبدالعزیز کے خیال سے جن سے ان کے دیرینہ تعلقات تھے، دوستوں کی یہ پیش کش نامنظور کر دی۔ ۱۹۲۶ء میں دوستوں کا اصرار بڑھا اور لاہور کے مختلف طبقوں کے وفود ان سے ملے اور انہیں مجبور کیا کہ اب کی دفعہ وہ ممبری کے لیے الیکشن لڑیں۔ اقبال کو پھر میاں عبدالعزیز کے مقابلے میں الیکشن لڑنے میں تامل تھا۔ اسی اثنا میں میاں عبدالعزیز اقبال کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ چنانچہ اقبال نے ۲ر جولائی ۱۹۲۶ء کو باقاعدہ اپنی امیدواری کا اعلان کیا۔ اس اعلان میں انہوں نے اور باتوں کے علاوہ کہا۔

"مسلمانوں کو معلوم ہے کہ میں اب تک اس قسم کے مشاغل سے بالکل علاحدہ رہا محض اس لئے کہ دوسرے لوگ یہ کام انجام دے رہے تھے اور میں نے اپنے لئے دوسرا دائرہ کار منتخب کر لیا تھا لیکن اب قوم کی مصیبتیں مجبور کر رہی ہیں کہ اپنا حلقہ عمل قدرے وسیع کر دوں، شاید میرا ناچیز وجود اس طرح اس ملت کے لیے زیادہ مفید ہو سکے جس کی خدمت میں میری زندگی کے تمام لیل و نہار گذرے ہیں۔" [1]

۵ر دسمبر ۱۹۲۶ء کو اقبال پنجاب کونسل کے رکن منتخب ہو گئے۔ پنجاب کی لیجسلیٹو کونسل میں آپ ایک فعال رکن رہے اور وقتاً فوقتاً کچھ اہم اور مفید تجاویز پیش کیں۔ اقبال نے اپنے زمانہ رکنیت کونسل

[1] اخبار زمیندار لاہور ۲۰ جولائی ۱۹۲۶ء (بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ از محمد احمد خان۔ ص ۱۳۶)۔

میں جن امور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ان میں صوبہ کی عام معاشی خوشحالی غریبوں کی مالی امداد، بزرگان دین کی توہین کا انسداد، امتناعِ شراب نوشی، شمشیر کی آزادی، یونانی و آیورویدک طریقہ علاج کی ہمت افزائی، دیہات کی بہتر صفائی، عورتوں کی طبی امداد، جبری ابتدائی تعلیم کا نفاذ، مسلم تعلیمی اداروں کی بہتر مالی امداد، محصول آمدنی کو صوبوں کے سپرد کرنے کی تجویز، اونچی تنخواہوں میں تخفیف، صوبہ کی صنعتی ترقی کے مسائل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پنجاب کونسل میں ایک رُکن کی حیثیت سے اقبال کا طرزِ عمل نہ صرف مثبت رہا بلکہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا انہوں نے بہت ہی مفید اور نتائج کے لحاظ سے کئی دور رس تجاویز پیش کیں خصوصاً لگان کے بارے میں ان کی تجویز اپنی نوعیت کے اعتبار سے انوکھی ہی نہیں بلکہ چھوٹے کاشتکاروں کے حق میں ایک نعمت تھی۔ کونسل میں ان کی ایک تجویز یہ بھی تھی کہ محصول آمدنی کو صوبوں کے سپرد کر دیا جائے اور مرکز ہر صوبے سے حصہ رسدی وصول کرے۔ اس زمانے کے حالات کے پیشِ نظر یہ تجویز مناسب بھی تھی کیونکہ صورت حال یہ تھی کہ صوبوں میں دوعملی حکومت (DIARCHY) تھی یعنی کچھ معاملات میں صوبے کی کونسل بحث و مباحثہ کرنے اور ان کا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتی تھی، جبکہ بعض معاملات گورنر کی تحویل میں ہوتے تھے جن پر کونسل کو کوئی اختیار نہیں تھا، چنانچہ صوبوں کو آمدنی کے جو مدات دیئے گئے تھے ان میں ذرائع بہت ہی محدود تھے لہٰذا قومی تعمیر و ترقی کے فرائض وہ پوری طرح انجام نہیں دے پاتے تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کا دستوری ارتقاء جن خطوط پر ہو رہا تھا اس سے یہ امر متعین ہو چکا تھا کہ ایک نہ ایک دن صوبوں کو حکومت خود اختیاری دے دی جائے گی۔ اقبال نے اس صورتِ حال کو بھانپ لیا تھا۔

کونسل سے باہر بھی اقبال اس دور میں سماجی اور سیاسی کاموں میں خاصے مصروف رہتے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں سوامی شردھانند کے قتل کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں زبردست کشیدگی پیدا ہوئی ہندو اخبارات میں اسلام پر حملے کیے جانے لگے اس ضمن میں پنجاب کے پرتاپ اور ملاپ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جنہوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کچھ لوگوں نے صورت حال کو قابو میں لانے کے لیے زبردست کوششیں کیں۔ ان میں اقبال پیش پیش تھے چنانچہ جنوری ۱۹۲۷ء میں لاہور میں موچی دروازے کے پاس دو جلسے کیے گئے اور دونوں جلسوں میں اقبال نے تقریریں کیں اور لوگوں کو یہ کہہ کر شرم دلائی کہ

"ہندوستان اور ہندوستان سے باہر دیگر ممالک میں ہر جگہ ہماری رسوائی کے چرچے ہیں، ہمارے باہمی تنازعات بہت ہی افسوس ناک ہیں۔" [۱]

آخر میں آپ نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے پُر امن رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے صداقت کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ خدا کے لیے حقائق کی طرف دیکھو اور آپس میں نہ لڑو۔ ہندوستان میں بعض ایسے لوگ ہیں، جو اپنی اغراض کے لیے تمہارے درمیان پھوٹ ڈالنے کی مساعی میں رہتے ہیں۔ اگر تم آپس میں لڑو گے تو ملک میں بدامنی ہوگی، سب کو تکلیف اٹھانی پڑے گی۔" [۲]

مئی ۱۹۲۷ء میں لاہور میں زبردست ہندو مسلم فساد ہوا۔ اقبال نے شہر کے مختلف علاقوں کا دورہ کر کے مسلمانوں کو صبر و تحمل کی تلقین کی۔ مسلمان اپنے شہیدوں کا جلوس نکالنا چاہتے تھے اور اندیشہ تھا کہ اس جلوس کی وجہ سے مزید اشتعال نہ پیدا ہو۔ اقبال نے کچھ اور سرکردہ لوگوں کی معیت میں اس جلوس کی رہنمائی کر کے اسے بے قابو ہونے سے بچایا۔ مولانا محمد علی جوہر اقبال کی ان مساعی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے اخبار 'ہمدرد' مورخہ ۸ مئی ۱۹۲۷ء میں لکھا:۔

"میں نے جب اخبارات میں پڑھا کہ کس طرح علامہ اقبال نے مسلمانوں کو ایک بار نہیں بلکہ بار بار اور دن رات صبر و تحمل کی تلقین فرمائی تو میرے دل سے اس سچے محبِ وطن کے لیے دعا نکلی۔" [۳]

اس سے پہلے اس بات کا ذکر آچکا ہے کہ عدم تعاون کی تحریک کے خاتمے کے بعد شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کی گئی تھیں، جن کے جواب میں مسلمانوں نے بھی اپنی تبلیغ و تنظیم کی متوازی اور متخالف تحریکیں شروع کر دی تھیں۔ میر غلام بھیک نیرنگ جن سے اقبال کے قریبی تعلقات تھے انجمن تبلیغ الاسلام کے معتمد تھے۔ اقبال کو نہ صرف تبلیغ کی تحریک سے مکمل اتفاق تھا بلکہ وہ اسے وقت کی

۱، ۲۔ اخبار زمیندار لاہور ۲ فروری ۱۹۲۷ء (بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ۔ از محمد احمد خان۔ ص۔ ۱۵۵)۔

۳۔ اخبار ہمدرد ۸ مئی ۱۹۲۷ء (بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ۔ از محمد احمد خان۔ ص ۱۵۶)۔

اہم ضرورت سمجھتے تھے چنانچہ ۱۹۲۸ء میں نیرنگ کے خط کے جواب میں اقبال تبلیغ کی ضرورت اور اہمیت مسلمانوں اور اسلام کو ہندوستان میں درپیش خطروں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"میرے نزدیک تبلیغ الاسلام کا کام اس وقت تمام کاموں پر مقدم ہے اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاسیات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبودی ہے اور حفاظت اسلام اس کا عنصر نہیں ہے جیسا کہ آج کل کے قوم پرستوں کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ یہ بات میں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں اور سیاسیات حاضرہ کے تھوڑے سے تجربہ کے بعد ہندوستان کی سیاسیات کی روش جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے خود مذہب اسلام کے لیے ایک خطرۂ عظیم ہے۔ میرے خیال میں شدھی کا خطرہ اس خطرے کے مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتا یا کم از کم یہ بھی شدھی ہی کی ایک غیر محسوس صورت ہے۔ بہرحال جس جانفشانی سے آپ نے تبلیغ کا کام کیا ہے۔ اس کا اجر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہی دے سکتے ہیں۔ میں انشاء اللہ جہاں جہاں موقع ہوگا۔ آپ کے ایجنٹ کے طور پر کہنے سننے کو حاضر ہوں۔" [1]

۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں مسلمان لیڈروں کا ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت محمد علی جناح نے کی۔ اس اجتماع میں وہ تجاویز منظور کی گئیں جنہیں تجاویز دہلی کہا جاتا ہے۔ ان تجاویز میں جداگانہ انتخاب سے مشروط طور پر دستبرداری کی پیش کش بھی شامل تھی لیکن ہندو مہاسبھا نے ان تجاویز کی سخت مخالفت کی اور غالباً اسی مخالفت کے باعث سر شفیع جنہوں نے دہلی کے اجلاس میں نہ صرف ان تجاویز کی تائید کی تھی بلکہ یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ:-

"یہ سب تجاویز خود ان ہی کی پیش کردہ ہیں اور وہ اپنے زمانۂ وزارت میں انہیں ایک یادداشت کی شکل میں تحریر فرما چکے ہیں۔" [2]

---

[1] - اقبال نامہ، حصہ اول - ص ۲۰۹؛ [2] - اخبار 'ہمدرد' ۲۹ جنوری ۱۹۲۸ء (بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ - از محمد احمد خان - ص ۱۶۰)؛

لاہور میں صوبائی مسلم لیگ کا ایک اجلاس طلب کیا اور اپنی صدارتی تقریر میں جداگانہ انتخاب سے مشروط دستبرداری کی پیش کش کی مخالفت کی۔ اقبال نے بھی اس جلسے میں شرکت کی اور سر شفیع کی تائید کی۔ اقبال نے اس اجلاس میں یہ قرارداد پیش کی کہ:۔

"پنجاب پراونشل مسلم لیگ اپنے اس عقیدے کا اعادہ کرتی ہے کہ ملک کے موجودہ سیاسی حالات میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب ہی کے ذریعہ مرکزی مجلس وضع قوانین اور صوبوں کی مجالس وضع قوانین، باشندگان ہند کی حقیقی نمائندہ مجالس بن سکتی ہیں۔ حلقہ ہائے انتخاب کی علاحدگی ہی سے باشندوں کے جائز حقوق و فوائد محفوظ رہ سکتے ہیں اور اسی صورت میں وہ فرقہ وارانہ کش مکش دور ہو سکتی ہے جو وقتاً فوقتاً پیش آتی رہتی ہے اور جو مخلوط اور مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب سے پیدا ہوگی۔ اس لئے لیگ کی یہ قطعی رائے ہے کہ جب تک اقلیتوں کے حقوق کی موثر حفاظت کا انتظام نہ ہو اس وقت تک مسلمان فرقہ وار حلقہ ہائے انتخاب کو دستور ہند کے ایک اساسی جز کی حیثیت سے قائم رکھنے پر لازماً مصر رہیں۔"[1]

اس قرارداد کو پیش کرنے کے ساتھ اقبال نے ایک تقریر بھی کی جس میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ وہ پہلے ہندوستانی ہیں جس نے ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت اور ضرورت کا احساس کیا۔ ساتھ ہی آرزو کا بھی اظہار کیا کہ یہ اتحاد مستقل حیثیت اختیار کرلے لیکن موجودہ حالات ایسے نہیں ہیں کہ حلقہ ہائے انتخاب مشترک ہوں۔ انہوں نے مسلمانوں کے بارے میں ہندو لیڈروں کی ذہنیت پر تاسف کا اظہار کیا۔ آخر میں انہوں نے مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔ ایک طرف ہندوؤں کی کوششیں ان کے خلاف ہو رہی ہیں، دوسری طرف حکومت کے موجودہ نظام کی سرگرمیاں مسلمانوں کے خلاف جاری ہیں۔ ان مصیبتوں میں بچاؤ کی صورت محض یہ ہے کہ مسلمان اپنے پاؤں

---

[1] اخبار انقلاب لاہور ۳ مئی ۱۹۲۷ء (بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ، ص ۱۶۱، ۱۶۲)۔

پر کھڑے ہوجائیں اور مردانہ وار مصیبت کا مقابلہ کریں۔"[۱]

قرارداد اور تقریر سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اقبال تجاویز دہلی سے مجموعی طور پر اختلاف نہیں کرتے ہیں بلکہ صرف جُداگانہ انتخاب سے دستبرداری کی پیش کش سے اختلاف کرتے ہیں۔ باوصف اس کے کہ یہ پیش کش مشروط تھی۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اقبال کا خیال تھا کہ مخلوط انتخاب پر عمل درآمد سے بالآخر ایک ایسی قومیت کی تشکیل ہوگی جو اسلام کے صحیح نصب العین کے منافی ہے۔

مولانا محمد علی جو ہندو مسلم اتحاد کے پُرجوش حامی تھے تجاویز دہلی کی مکمل طور پر حمایت کرتے تھے۔ ان تجاویز کو کانگریس اور مسلم لیگ سے منوانے کی خاطر انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اپنے اخبار "ہمدرد" میں اس نقطۂ نظر کی تائید میں متعدد مضامین لکھے تقریریں کیں اور دورے کئے اور ایک سال بعد یعنی ۲۲ مارچ ۱۹۲۸ء کو اپنے اخبار میں یہ دعویٰ کیا کہ:۔

"سات کروڑ مسلمانوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے کم از کم اس کام میں مجھ سے زیادہ وقت صرف کیا ہو اور مجھ سے زیادہ جان کھپائی ہو۔"[۲]

اقبال ان کی ان مساعی کو بنظرِ استحسان نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ اپریل ۱۹۲۸ء میں انہوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں ان مساعی پر نہایت بلیغ انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:۔

"بزمِ اغیار کی رونق ضرور تھی، اسلام کا ہندوؤں کے ہاتھ بک جانا گوارا نہیں ہوسکتا۔ افسوس اہلِ خلافت اپنی اصلی راہ سے بہت دور جا پڑے۔ وہ ہم کو ایک ایسی قومیت کی راہ دکھا رہے ہیں جس کو کوئی مخلص مسلمان ایک منٹ کے لیے بھی قبول نہیں کرسکتا۔"[۳]

نومبر ۱۹۲۷ء میں حکومت برطانیہ نے سائمن کمیشن کی تقرری کا اعلان کیا۔ یہ کمیشن ہندوستان کا دورہ کرکے شہادتیں قلمبند کرنے تجاویز وصول کرنے اور حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد مزید دستوری اصطلاحات کے متعلق سفارشات پیش کرنے والا تھا۔ اس کمیشن کے تمام اراکین انگریز تھے اسی لئے

---

[۱]، [۲]۔ اخبار انقلاب لاہور ۳ مئی ۱۹۲۷ء (بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ، ص ۱۶۲، ۱۶۳)۔

[۳]۔ اقبال نامہ۔ حصہ اول۔ ص ۱۵۸۔

ہندوستانی لیڈروں کو بالعموم اس پر اعتراض تھا اور وہ کمیشن کی اس طرح کی تشکیل کو ہندوستان کی عزت اور وقار پر حملہ کے مترادف سمجھتے تھے۔ اس بنا پر یہ تحریک شروع ہوئی کہ کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے اور جب یہ کمیشن ہندوستان میں قدم رکھے تو اس کے خلاف مظاہرے کئے جائیں۔ اقبال کی رائے اس بارے میں مختلف تھی چنانچہ ۹ نومبر کو انہوں نے اس کمیشن کی تشکیل سے متعلق جو بیان جاری کیا۔ اس میں اگرچہ کمیشن میں کسی ہندوستانی ممبر کے نہ ہونے کو "غیر متوقع، مایوس کن اور تکلیف دہ" قرار دیا لیکن ساتھ ہی اس کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ کہا کہ "اس کی وجہ بے اعتمادی اور بدظنی ہے جو ہندوستان کی مختلف اقوام کو ایک دوسرے کے متعلق ہے"۔ ۱۳ نومبر کو سر شفیع کے مکان پر صوبائی مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اقبال کا موقف یہ تھا کہ بائیکاٹ "ملکی زاویہ نگاہ سے علی العموم اور اسلامی نقطۂ نظر سے علی الخصوص نقصان رساں ہوگا"۔ مسلمان راہنماؤں میں محمد علی جناح اور مولانا محمد علی جوہر بائیکاٹ کے حامیوں میں سرفہرست تھے۔ چنانچہ اقبال کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد علی جوہر نے اپنے اخبار ہمدرد کی ۱۵ نومبر کی اشاعت میں لکھا کہ:

"یہ پنجاب کی بدقسمتی ہے کہ سر محمد اقبال جیسے لیڈر، سر محمد شفیع جیسے وفادار کو اپنی آزادخیالی کی سطح تک نہ ابھار کر لا سکے بلکہ برخلاف اس کے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی سر محمد شفیع کی وفاداری کی پست سطح پر اتر آئے ہیں۔"[۵]

محمد علی جناح نے بھی دسمبر ۱۹۲۷ء میں کمیشن کی تشکیل پر سخت تنقید کی اور مسلمانوں سے اس کا بائیکاٹ کرنے کی اپیل کی۔ اقبال نے اس کے جواب میں پانچ اور مسلم راہنماؤں کے ساتھ ۸ دسمبر کو اخبارات کے لیے ایک بیان جاری کیا جس میں جناح کے بیان کو موجودہ ناگوار حالات کی طرف سے بے حسی پر مبنی قرار دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کو خدشہ تھا کہ کمیشن کا بائیکاٹ کر کے مسلمان اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے موقعہ سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور اس طرح سے وہ اپنے حقوق کا تحفظ حاصل نہیں کر پائیں گے جو بقول ان کے "ہندو ہمیں دینے سے انکار کر رہے ہیں"۔ اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کمیشن سے تعاون یا عدم تعاون کے معاملے میں اقبال کا موقف یہ تھا کہ یا تو ہندو اکثریت، مسلم اقلیت کے حقوق اور مطالبات تسلیم کرے یا پھر ان مطالبات کو کمیشن کے

۵۔ اخبار ہمدرد: ۱۵ نومبر ۱۹۲۷ء (بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ۔ ص ۱۷۰)

سامنے پیش کیا جائے۔ اگر ہندو انہیں تسلیم کرتے ہیں تو کمیشن سے تعاون کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر ہندو انہیں نہیں مانتے ہیں تو پھر حکومت سے منوانے کے لیے کمیشن سے تعاون کرنا چاہیے۔" یہ رائے اقبال نے صرف ذاتی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ صوبائی مسلم لیگ کے معتمد کی حیثیت سے بھی دی تھی۔ یہاں یہ واضح رہے کہ مسلم لیگ کے مستقل صدر یعنی محمد علی جناح کمیشن سے تعاون کے خلاف تھے۔ اس طرح سے صوبائی مسلم لیگ اور کل ہند مسلم لیگ میں ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوگئی چنانچہ اسی بنا پر آگے چل کر مسلم لیگ دو حصوں میں بٹ گئی ایک جناح لیگ کہلائی اور دوسری شفیع لیگ۔ چنانچہ شفیع لیگ نے ایک یادداشت مرتب کی جو کمیشن کے سامنے پیش کی گئی اور اس کے بعد لیگ کے ایک وفد نے جس میں اقبال بھی شامل تھے کمیشن کے سامنے شہادت دی۔ چنانچہ سائمن کمیشن نے جداگانہ انتخاب کو برقرار رکھنے کی سفارش کی لیکن اس کے باوجود اقبال بحیثیت مجموعی سائمن کمیشن کی رپورٹ سے مطمئن نہیں تھے اور انہوں نے سر ذوالفقار علی خان کے ساتھ ایک بیان جاری کیا جس میں کمیشن کی سفارشات سے بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ :-

"رپورٹ کی تہہ میں جو پالیسی کارفرما ہے اس کا مطلب ہمارے نزدیک اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کے اہم مطالبات کو ٹھکرا کر انتہا پسند ہندوؤں کو خوش کرنا مقصود ہے۔"[1]

۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء کی ہندوستانی سیاست نہرو رپورٹ کے اطراف میں گھومتی ہے۔ نہرو رپورٹ اور شعیب قریشی[2] کے اختلافی نوٹ کی اشاعت کے بعد ہی سے مسلمانوں کے اندر ایک بے چینی سی پیدا ہوگئی تھی تاہم آل پارٹیز کانفرنس کا انتظار تھا جس میں اس رپورٹ پر مولانا شوکت علی اور حسرت موہانی کے اعتراضات کو رد کر دیا گیا تو مسلمانوں کا وہ گروہ جو نہرو رپورٹ کے خلاف تھا ہی اب زیادہ سرگرم کار ہوگیا چنانچہ نہرو رپورٹ کے جادو کے توڑ میں دلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا جو مسلمان لیڈر اس رپورٹ میں ترمیم چاہتے تھے وہ کلکتہ کے اجلاس میں شریک ہوئے ان میں مولانا محمد علی جوہر اور محمد علی جناح شامل تھے وہاں جناح کی تینوں ترمیمات رد کر دی گئیں۔ دلی کے اجلاس میں جو آغا خان کی صدارت

ل۔ اخبار انقلاب۔ ۲۶ جون ۱۹۳۰ء (بحوالہ اقبال کا سیاسی کارنامہ ص ۱۸۵)

ل۲۔ شعیب قریشی اور سر امام علی اس کمیٹی کے ممبر تھے جنھوں نے نہرو رپورٹ تیار کی تھی۔

ہیں ہوا اس رپورٹ کی مذمت کی گئی۔ اور مسلم مطالبات کے سلسلے میں ایک دس نکاتی قرارداد منظور کی گئی۔ اس قرارداد میں جداگانہ انتخاب اور تعین نشست کے ساتھ سندھ کے لیے علاحدہ مستقل صوبہ کی حیثیت بلوچستان اور سرحد میں اصلاحات کے نفاذ، پنجاب اور بنگال کی مجالس وضع قوانین میں مسلم اکثریت کی برقراری اور باقی اختیارات (RESIDUARY POWERS) صوبوں کو دینے کے مطالبات کئے گئے تھے۔ یہ قرارداد سر شفیع نے پیش کی اور اقبال نے اس کی تائید میں ایک مدلل تقریر کی۔

غرض نہرو رپورٹ نے مسلمانوں کو دو گروہوں میں منقسم کر دیا۔ موافق گروہ وحدانی (UNITARY) طرزِ حکومت اور مشترکہ انتخابات کو رائج کرنا اور کسی فرقہ کو مخصوص حقوق اور تحفظات نہیں دینا چاہتا تھا دوسرا گروہ جو اس رپورٹ کا مخالف تھا، وہ وحدانی طرزِ حکومت کے برعکس ایک ایسا نظام رائج کرنا چاہتے تھے جس میں اقلیتوں کے لیے تحفظات بھی ہوں اور اکثریت کے خلاف توازن قوت بھی۔ اقبال اسی مخالف گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور اس ضمن میں انہوں نے کافی کام کیا۔

اکتوبر ۱۹۲۹ء میں پہلی گول میز کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا، اقبال نے اس کانفرنس کا خیر مقدم کیا لیکن انہوں نے اس سلسلے میں دو شرائط رکھیں ایک تو یہ کہ اس تاریخی اجتماع میں جانے سے پہلے ہندو مسلم اختلافات طے ہو جانے چاہئیں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ جو نمائندے اس کانفرنس میں جائیں وہ حقیقی معنوں میں اپنی قوم کے نمائندے ہونے چاہئیں لیکن یہ دونوں شرطیں پوری نہ ہوئیں۔ سول نافرمانی کے باعث کانگریس کا کوئی نمائندہ اس میں شریک نہ ہوا۔ چنانچہ یہ کانفرنس کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر ہی ملتوی کر دی گئی۔ اقبال کی یہ رائے تھی کہ گول میز کانفرنس میں شامل ہونے سے پہلے خود ہندوستانیوں کو آپس میں متحد ہو جانا چاہیے اور انگلستان میں متحدہ طور پر اپنے مطالبات پیش کرنے چاہئیں۔ بہر حال کانفرنس کے دوران حکومت نے مسلمان نمائندوں پر زور ڈالا کہ وہ ہندوؤں سے مفاہمت کر کے مخلوط انتخاب کو قبول کر لیں۔ یہ خبر اس شکل میں ہندوستان پہنچی کہ گول میز کانفرنس کے مسلم ممبر اس قسم کی مفاہمت پر راضی ہو گئے ہیں۔ اقبال اس خبر سے مضطرب ہو گئے اور انہوں نے آغا خان کے نام جو مسلم مندوبین کے سربراہ تھے ایک تار روانہ کیا۔ جس میں کہا گیا کہ مسلمانانِ پنجاب اس مفاہمت کے لیے تیار نہیں ہیں اور یہ مشورہ دیا گیا کہ اگر ہندو مسلم

مطالبات کو نہیں مانتے تو مسلم مندوبین کو کانفرنس چھوڑ کر چلے آنا چاہیئے۔ اس تار پر ہندو اخبارات میں بہت شور اٹھا۔ اخبار ٹریبون (TRIBUNE) نے لکھا:۔

"ہندو مسلم مفاہمت نہ ہونے کے سب سے زیادہ ذمہ دار ڈاکٹر اقبال ہیں جنہوں نے گول میز کانفرنس کے مسلم مندوبین کو اس وقت تار دیا جبکہ وہ مخلوط انتخاب پر راضی ہو چکے تھے۔"[ل]

اقبال نے مسلمانوں میں اس قسم کی مفاہمت کے خلاف عملی اقدام کرنے کی ایک تجویز نومبر ۱۹۳۰ء میں ایک انٹرویو میں پیش کی جو انہوں نے مسلم آؤٹ لک کے نمائندے کو دیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کی تجویز یہ تھی کہ شمالی و مغربی ہند اور پنجاب کے مسلمان لاہور میں ایک اجلاس منعقد کر کے اس مفاہمت کے متعلق پُر زور طریقے پر اپنی رائے کا اظہار کریں۔ یہ تجویز آل انڈیا مسلم کانفرنس کے نام سے معروف ہوئی۔ اس سلسلے میں ایک استقبالیہ کمیٹی بھی بن گئی جس میں اقبال بھی شامل تھے خیال تھا کہ یہ کانفرنس دسمبر ۱۹۳۰ء میں بلائی جائے گی لیکن اس مہینے چونکہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کے لیے اقبال کا انتخاب عمل میں آ چکا تھا اس لئے طے پایا کہ یہ کانفرنس بجائے دسمبر ۱۹۳۰ء کے جنوری ۱۹۳۱ء کے آخر میں لاہور میں منعقد کی جائے۔ یہ کانفرنس کئی وجوہ کے باعث منعقد نہ ہو سکی، سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ آغا خان نے تار کے جواب میں کسی قسم کی مفاہمت کی تردید کی۔ پہلی گول میز کانفرنس جس میں اس مفاہمت کا شوشہ چھوڑا گیا تھا کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ہی ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء کو برخاست ہو گئی۔ لہٰذا مجوزہ کانفرنس کا وقتی محرک بھی ختم ہو گیا۔ سید نذیر نیازی جو اقبال کے آخری برسوں میں ان کے بہت قریب تھے اس کانفرنس کے انعقاد پذیر نہ ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اس کی سب سے بڑی وجہ گول میز کانفرنسوں کا انعقاد تھا جن میں خود حضرتِ علامہ کو شریک ہونا پڑا۔ یہ کہنا کہ اس کانفرنس کی ناکامی میں بعض افراد کا بھی ہاتھ ہے غلط ہو گا کیونکہ حضرتِ علامہ کسی فرد یا جماعت کے چکر میں نہیں آئے خواہ اس فرد یا

ل۔ اخبار ٹریبون یکم جنوری ۱۹۳۱ء (بحوالہ گفتار اقبال۔ ص ۱۰۹)۔

جماعت کے عزائم کچھ بھی ہوں، گول میز کانفرنس کی کارروائی اور اس کے نتائج کا اظہار بہر کیف ضروری تھا اور اس طرح حضرت علامہ کے ارادوں میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوا لیکن جب صورت حالات یہ تھی کہ ہر شخص کی آنکھیں لندن پہ لگی ہوئی تھیں، اور ارباب سیاست لندن ہی کی گفتگوؤں کے پیش نظر اپنا موقف طے کر رہے تھے نہ کہ بحیثیت ایک تحریک ایک اجتماع مدنی، ایک ہیئت سیاسی اور ایک عالم گیر تہذیب اسلام کی بنا پر تو اس کانفرنس کا انعقاد کیسے عمل میں آتا! عملی اور ذہنی دونوں اعتبار سے حالات اس کے مساعد نہ تھے۔ پھر جب ۱۹۳۳ء میں گول میز کانفرنس سے واپسی پر کچھ سفر کی کلفت اور کچھ اس وقت کے مخصوص احوال کے پیش نظر حضرت علامہ نے یہی بہتر سمجھا کہ اپنے اس ارادہ کو چند دن اور ملتوی رکھیں حتیٰ کہ ۱۹۳۴ء کے آغاز میں حضرت علامہ خود ہی بیمار ہو گئے اور یہ کانفرنس رہ گئی۔" [۱]

حقیقت یہ ہے کہ اس کانفرنس کے انعقاد کا خیال اقبال کو کافی عرصے تک رہا لیکن جیسا کہ سید نذیر نیازی نے بھی لکھا ہے بعض وجوہ ہی کی بنا پر یہ کانفرنس کبھی منعقد نہ ہو سکی۔ ۱۹ اپریل ۱۹۳۱ء کو اقبال سید نذیر نیازی کو لکھتے ہیں کہ "آل انڈیا کانفرنس کا جلسہ بھی انشاء اللہ ہو گا۔" [۲] سید نذیر نیازی کی روایت یہ بھی ہے کہ الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس میں اپنا خطبہ صدارت پڑھ کر جب اقبال واپس آئے تو اس کانفرنس کے انعقاد کا انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا بلکہ ایک خطبہ (ایڈریس) بھی لکھنا شروع کر دیا تھا جو شاید بعد میں تلف کر دیا گیا۔" [۳] یہ باتیں تو ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء کی ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں بھی یہ خیال اُن کے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا، اس کی شہادت اس خط سے ملتی ہے جو ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو انہوں نے جناح کے نام لکھا جس میں شمالی مغربی ہند کے مسلمانوں کو مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا محور بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ [۴] دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الٰہ آباد میں منعقد ہونا طے پایا اور اس کی صدارت کے لیے

---

[۱]، [۲]، [۳]۔ مکتوبات اقبال۔ سید نذیر نیازی، ص ۶۶-۶۷، ۳۴، ۶۳-۶۵

[۴]۔ اقبال کے خطوط جناح کے نام (انگریزی) ص ۲۱-۲۲

اقبال کو مدعو کیا گیا۔ اقبال نے اس اجلاس میں ایک خطبۂ صدارت انگریزی میں پڑھا جو اس وقت کی مسلم سیاست کا آئینہ دار تھا۔ اس خطبے میں انہوں نے سب سے پہلے فاضلانہ انداز میں اسلام کو بحیثیت ضابطۂ حیات کے پیش کیا اور اس کے عمرانی نظام کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ پھر ہندوستان کے مختلف سیاسی مسائل جداگانہ و مخلوط انتخاب مرکزی وفاق، دفاعِ ہند، صوبہ جات بنگال، پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے حالات پر بحث کی، گول میز کانفرنس پر تبصرہ کیا، برصغیر کے بنیادی مسئلہ کو ایک بین الاقوامی مسئلہ قرار دیا، اجلاس کے صدر کی حیثیت سے مسلم لیگ کے چودہ نکات کی پرزور تائید کی اور اپنی شخصی حیثیت میں شمال مغربی ہند کی مسلم اکثریت والے سلاتوں کی ایک فیڈریشن بنانے کی تجویز ان الفاظ میں پیش کی۔

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبۂ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست سے ملا دیا جائے، خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے، خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔" [1]

اس خطبے کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ خطبہ اساسِ پاکستان میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے ذہن میں اس وقت ہندوستان کے باہر ایک متفقدر مسلم ریاست کے قیام کا کوئی خیال نہیں تھا، وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے اندر جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان کا وفاق قائم کرکے وہاں مسلمانوں کو اپنا کلچر، اپنی تہذیب، اپنی زبان اور اپنا تشخص برقرار رکھنے کا موقعہ فراہم کر دیا جائے۔ اس خطبے سے جو یہ تاثر لیا گیا ہے کہ اقبال ایک علاحدہ مسلم ریاست کے خواہاں تھے خود اقبال نے متعدد جگہ اس کی تردید کی ہے۔ اس ضمن میں جب یہ خدشہ ظاہر کیا گیا کہ مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں میں مسلمان حکومت بننے سے شمال مغربی سرحدیں باقی نہ رہیں گی، تو اقبال نے لندن ٹائمز کے ذریعے ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ایڈورڈ تھامپسن کے نام ایک کھلے خط میں لکھا ہے کہ:-

---

[1] خطبات اقبال۔ رضیہ فرحت بانو۔ ص ۳۶+

"...I am all for a redistribution of India into provinces with effective majorities of one community or another on the lines advocated by the Nehru and Simon reports. Indeed my suggestion regarding Muslim Provinces merely carried forward this idea. A series of well-contended and well organised Muslim Provinces on the North West frontier of India would be the good work of India in the British Empire against the hungry generations of the Asiatic highlands".

اس بیان سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال شمال مغربی علاقے میں ایک منتظم اور خود کفیل صوبے کی تشکیل کے خواہاں تھے یہاں یہ بات خاص طور پر ملحوظ نظر رہے کہ اس بیان میں اقبال نے پراونس (PROVINCE) کا لفظ استعمال کیا ہے STATE کا نہیں۔ اس کے علاوہ اقبال نے ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء میں پروفیسر تھامپسن کے نام کچھ خطوط لکھے جو حال ہی میں علی گڑھ سے شایع ہوئے ہیں۔ ان کا خطوط کا تعلق اگرچہ مجوزہ "رہوڈس لیکچرز" سے ہے جن کے لیے انہیں آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے دعوت دی گئی تھی تاہم ان میں بھی انہوں نے بعض جگہ اپنا سیاسی نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ خط بہت ہی اہم ہے جو انہوں نے ۴ مارچ ۱۹۳۴ء کو لکھا ہے۔ اس خط کی اہمیت کے پیش نظر اسے ذیل میں مکمل طور پر پیش کیا جاتا ہے:۔

"میری کتاب پر آپ کا تبصرہ مجھے ابھی موصول ہوا ہے بہت ہی عمدہ ہے اور میرے بارے میں آپ نے جو مشفقانہ باتیں تحریر کی ہیں اس کے لیے میں سپاس گذار ہوں لیکن آپ سے ایک غلطی سرزد ہوئی ہے جس کی نشاندہی میں بہ عجلت کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ میں اسے بہت ہی اہم سمجھتا ہوں، آپ مجھے اس سکیم کا حامی بتاتے ہیں جو پاکستان کے نام

سے موسوم ہے، پاکستان میرا منصوبہ نہیں ہے۔ میں نے اپنے خطبے میں جو اسکیم پیش کی تھی وہ یہ تھی کہ مسلم اکثریت والے علاقے کا ایک صوبہ شمال مغربی ہندوستان میں بنایا جائے اور میری سکیم کے مطابق یہ صوبہ مجوزہ انڈین فیڈریشن کا ایک حصہ ہوگا۔ پاکستان کی سکیم ایک علاحدہ فیڈریشن تجویز کرتی ہے جو براہ راست انگلستان سے ایک علاحدہ ڈومینین کے طور پر وابستہ ہو۔ یہ سکیم اصل میں کیمبرج میں پیدا ہوئی۔ اس سکیم کے خالق سمجھتے ہیں کہ ہم گول میزیوں[1] نے مسلمانوں کے مفادات کو ہندو یا نام نہاد ہندوستانی نیشنلزم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا۔"[2]

اس خط سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ اقبال اپنے آپ کو اس سکیم سے وابستہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے جو اسکیم پاکستان کے نام سے موسوم تھی۔ ۲۶ جولائی ۱۹۳۴ء کے خط میں انہیں پھر لکھتے ہیں:۔

"ذاتی طور پر میرا ہمیشہ عقیدہ رہا ہے کہ شمال مغربی ہند کے صوبوں کا ادغام انگلستان، ہندوستان اور اسلام (مسلمانوں) کے لیے سودمند ہوگا۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں جمہوریت پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ بہرحال جمہوریت کی طرف قدم (جو میری رائے میں مہلک ہے) اٹھایا جا چکا ہے۔ ہمیں اب اقتصادی تباہی، سیاسی افراتفری اور ہندو ازم کی تخلیل کے لیے تیار رہنا چاہیے جو اس وسیع، غیر منظم اور فاقہ کش ملک کو جمہوریت سے متعارف کرنے سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ حریص سیاستدانوں کے طور طریقوں کے نتائج سے ہمیں کوئی بھی قرطاس ابیض محفوظ نہیں رکھ سکتا، جنہوں نے ہندوستان کے بارے میں ایسی تصویر کھینچی ہے جس نے ہندوستان کے اندر اور باہر بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے۔"[3]

غرض اس دور تک اقبال ہندوستانی مسلمانوں کی علاحدہ مملکت کے خواہاں نہیں تھے بلکہ جیسا کہ اس سے قبل بیان میں آچکا ہے وہ شمال مغربی ہند کے مسلم اکثریتی صوبوں کا ایک وفاق چاہتے تھے تاکہ مسلمان اپنے تہذیبی، تمدنی، مذہبی اور قومی تشخص کو برقرار رکھ سکیں۔

۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۷ء تک کا زمانہ کئی لحاظ سے ہندوستانی سیاست میں اہم ہے۔ گول میز کانفرنس

---

[1] ROUND-TABLERS

[2]، [3]۔ انگریزی سے ترجمہ۔

میں ہندو مسلم مفاہمت کی کوششیں ناکام ہوئی تھیں اور اس دور میں ان دونوں فرقوں میں مزید دوریاں پیدا ہو گئیں۔ ۱۹۳۳ء میں جب جدید دستور کا خاکہ شائع کر دیا گیا تھا جسے قرطاسِ ابیض کا نام دیا جاتا ہے اس پر خاص طور پر مسلمانوں کو سخت اعتراض تھا۔ اقبالؔ نے بھی اس کی تنقید کی۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اس میں مسلمانوں کی حق تلفی کی گئی ہے اور جہاں انہیں اکثریت ملنی چاہیئے تھی وہاں اکثریت نہیں دی گئی اور جہاں پاسنگ (WEIGHTAGE) ملنا چاہیئے تھا، وہاں پاسنگ نہیں ملا۔ مزید یہ کہ عورتوں کو جداگانہ انتخاب کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ گورنروں کے اختیارات میں وسعت پیدا کی گئی ہے اور شخصی تحفظات کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اقبالؔ نے فرقہ وارانہ فیصلے کو ایک حد تک مسترد کر دیا۔ ادھر سے کانگریس نے اعلان کیا کہ وہ اس کو نہ تو منظور کرتی ہے اور نہ مسترد۔ اقبالؔ نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ جرأت سے اس فیصلے کی حمایت کریں۔ اس سارے دور میں یعنی ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۴ء تک مسلم لیگ عملی سیاست سے تقریباً الگ ہی رہی۔ جناح جو لیگ کے مستقل صدر تھے انگلستان جا کر وہاں سکونت پذیر ہو گئے۔ ۱۹۳۴ء میں جناح نے واپس آ کر لیگ کو دوبارہ متحرک کر دیا۔ ۱۹۳۵ء میں جب نیا دستور بن کر آیا تو مسلمانوں کے حقوق خاصے محفوظ تھے مگر ان کی اجتماعی زندگی میں جمود کا غلبہ تھا۔ سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی اگرچہ مفید کام کر رہی تھی تاہم اس کی سیاست ایک مخصوص طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور نتیجتاً عوام نے اس میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات نزدیک آ رہے تھے اور چونکہ یہ انتخابات جداگانہ تھے لہٰذا جناح نے کوشش کی کہ یونینسٹ پارٹی سے مفاہمت ہو جائے مگر یہ مفاہمت نہ ہو سکی۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں لیگ کا اجلاس ہوا جس میں پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل ہوئی۔ ۱۲ مئی ۱۹۳۶ء کو مسلم لیگ کا ایک اور جلسہ اقبالؔ کی صدارت میں ہوا جس میں کئی قرار دادیں منظور کی گئیں۔ بہر حال الیکشن کی تیاریاں زور و شور سے ہو رہی تھیں اور اقبالؔ اگرچہ علالت کی وجہ سے اس میں عملاً شریک نہ ہو سکے مگر وہ اس سے علاحدہ بھی نہ تھے۔ بیماری اور کمزوری کے باعث انہوں نے زمان مہدی خان کو پنجاب مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ کا ڈپٹی پریذیڈنٹ بنا دیا۔ نشر و اشاعت کی کمیٹی میں بھی اقبالؔ شامل تھے چنانچہ جب لیگ کی طرف سے انتخابات میں حصہ لینے کے اعلان کا موقع آیا تو انہوں نے انہیں ایک خط میں لکھا:۔

"مجھے امید ہے کہ جو اعلان بورڈ شائع کرے گا اس میں پوری سکیم کے جملہ پہلوؤں پر اچھی طرح بحث کی جائے گی اور اس سلسلے میں مخالفوں کی طرف سے جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کا بھی شافی جواب موجود ہوگا۔ بورڈ کو چاہیئے کہ اپنے اس بیان میں اس امر کی وضاحت بھی کرے کہ آج ایک طرف حکومت اور دوسری طرف ہندو اور ان دونوں کے درمیان خود مسلمانوں کی حیثیت کیا ہے؟ بورڈ کا فرض ہے کہ اس بیان کے ذریعے لوگوں کو متنبہ کر دیا جائے کہ اگر انہوں نے مسلم لیگ کی موجودہ سکیم کو منظور نہ کیا تو گزشتہ پندرہ سال میں ہم نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ تمام تر ضائع کر بیٹھیں گے۔ یہی نہیں بلکہ مسلمان خود اپنے ہاتھ سے اپنے قومی شیرازے کو پارہ پارہ کر دیں گے"۔[1]

الیکشن میں اگرچہ لیگ نے خاصی کامیابی حاصل کی مگر کئی مسلمان ممبر جو منتخب ہو گئے تھے کانگریس میں شامل ہو گئے اور اس طرح سے لیگ کی کامیابی مؤثر ثابت نہ ہو سکی۔ کسی بھی صوبائی وزارت میں مسلم لیگ کے ارکان اکثریت حاصل نہ کر سکے۔ اس طرح سے لیگ کے وقار کو سخت دھکا لگا۔ ادھر سے کانگریس نے تحریک رابطہ مسلم عوام چلائی اور اس ضمن میں تمام ملک کے دورہ کرنے کا پروگرام مرتب کیا گیا۔ اسی دور میں لیگ کے تمام لیڈروں میں اقبالؔ ایک واحد شخص تھے جو عوام اور خواص دونوں میں مقبول تھے۔ عاشق حسین بٹالوی جو خود بھی لیگ کے ممبروں میں شامل تھے اسی بات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"جناح کا نام ابھی اکثر لوگوں نے نہیں سنا تھا مگر اقبالؔ کا نام ایک ایسا سکہ تھا جسے ہم بے دریغ چلاتے تھے اور میں نے انہی دنوں یہ محسوس کیا کہ اقبالؔ پڑھے لکھے لوگوں ہی میں نہیں بلکہ عوام میں بھی کتنا مقبول تھا۔ مجھے رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ کاش ڈاکٹر صاحب کی صحت اچھی ہوتی اور وہ پنجاب کے بڑے بڑے شہروں کا ایک دفعہ دورہ کر لیتے تو فضا بالکل صاف ہو جاتی"۔[2]

فضا میں یہ تکدر اصل میں تحریک رابطہ مسلم عوام کے باعث پیدا ہو گیا تھا۔ اس مہم کے جلسوں میں

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوم، ص ۴۰-۵۰ و [2] اقبالؔ کے آخری دو سال، عاشق حسین بٹالوی، ص ۳۶۴-۳۶۵۔

لیگ کے لیڈروں خاص طور پر جناح کے خلاف بہت کچھ کہا جاتا تھا اور اس سے مسلمانوں میں ہیجان بپا ہو گیا۔ اقبال نے اس صورتِ حال سے متاثر ہو کر لیگ اور جناح کے حق میں ایک بیان جاری کیا جس میں انھوں نے کہا۔

"مسٹر جناح آج مسلمانوں کے سب سے بڑے لیڈر ہیں۔ انھوں نے اپنے ملک کی جو خدمت کی ہے وہ کسی اور لیڈر سے کم نہیں لیکن مسٹر جناح تخیل کی دنیا میں پرواز کرنے کی بجائے حقیقت بینی کو ترجیح دیتے ہیں اس لئے ان کی قوم پرستی اور حب الوطنی حقائق و واقعات کے صحیح تجزیے پر مبنی ہے۔"[۱]

انھوں نے اس بیان میں پنڈت جواہر لال نہرو پر بھی تنقید کی جنھوں نے دہلی میں منعقدہ نیشنل کنونشن کے اجلاس میں لیگ اور جناح کے خلاف ایک زبردست تقریر کی تھی۔

"پنڈت نہرو کو ہرگز زیب نہیں دیتا کہ وہ اس بات کا شور مچاتے پھریں کہ مسٹر جناح مسلمانوں کے متوسط درجے کے بالائی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں یہ مسٹر جناح کو مسلمانوں کے افلاس اور فاقہ زدگی کا کوئی علم نہیں ہے یہ کہ وہ (نہرو) مسلمانوں اور ہندوؤں کی یکساں نمائندگی کرتے ہیں۔"[۲]

پنڈت نہرو کے اسی خطبے کی طرف توجہ دلانے کے لیے اقبال نے جناح کے نام ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء کو خط لکھا جس میں اس خطبے کے بارے میں جناح کو کچھ مشورے بھی دیئے۔

"نئے آئین نے ہندوستان کے مسلمانوں کو کم از کم اس بات کا نادر موقعہ ضرور دیا کہ وہ ہندوستان اور ایشیا میں رونما ہونے والے سیاسی حالات کے پیش نظر قومی تنظیم کر سکیں۔ بلاشبہ ہم ملک کی دیگر ترقی پسند جماعتوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کے لیے تیار ہیں لیکن ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ ایشیا میں اسلام کی اخلاقی اور سیاسی طاقت کے مستقبل کا انحصار بہت بڑی حد تک خود ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی تنظیم ہے۔ اس لئے میری رائے یہ ہے کہ آل انڈیا نیشنل کنونشن کو ایک مؤثر جواب دینا

---

[۱]، [۲]۔ اقبال کے آخری دو سال' عاشق حسین بٹالوی۔ ص ۳۷۳، ۳۷۵

ضروری ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ فوراً دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کریں جس میں صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کے علاوہ دیگر اکابر کو بھی جمع کریں۔ اس کنونشن میں آپ پوری صفائی سے یہ حقیقت بیان کیجئے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ ہستی کے مالک ہیں اور اس حیثیت سے ان کا مطمح نظر کیا ہے؟ یہ امر بے حد ضروری ہے کہ اندرون و بیرون ہند کی تمام دنیا کو بتا دیا جائے کہ ملک میں محض اقتصادی مسئلہ ہی تنہا ایک مسئلہ نہیں ہے۔ کلچر کا مسئلہ بھی کسی طرح اقتصادی مسئلے سے کم اہم نہیں ہے۔ اس کنونشن سے ایک طرف مسلمانوں کی مختلف پارٹیوں کے اغراض و مقاصد کا پتہ چل جائے گا اور دوسری طرف ہندوؤں پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ باریک سے باریک سیاسی چال بھی مسلمانوں کو فریب نہیں دے سکتی اور وہ اپنی جداگانہ ہستی کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔"[1]

اسی سلسلے کی دوسری کڑی ۲۲ اپریل ۱۹۳۷ء کا خط ہے جس میں اقبال نے اسی مسئلے یعنی مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کی طرف جناح کی توجہ مبذول کرائی ہے اور مسئلے کی سنجیدہ نوعیت کے پیش نظر انہیں جلد از جلد عملی کارروائیاں شروع کرنے کا مشورہ دیا ہے:۔

"چونکہ صورت حال نازک تر ہوتی جا رہی ہے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اس مسئلے پر جلد از جلد غور کر کے اولین فرصت میں فیصلہ کریں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس تو اگست تک ملتوی ہو چکا ہے لیکن حالات کا تقاضا یہ ہے کہ مسلم پالیسی کا مکرر اعلان کیا جائے۔ اگر کنونشن کے انعقاد سے پہلے بڑے بڑے مسلمان لیڈر ملک کا دورہ کر لیں تو کنونشن کی کامیابی یقینی ہے۔"[2]

اقبال چاہتے تھے کہ مسلم لیگ پنجاب میں خاص طور پر اپنی تحریک میں تیزی پیدا کرے کیونکہ کانگریس کی تحریک رابطہ مسلم کے اثر سے پنجاب کے مسلمان تیزی کے ساتھ کانگریس کے حامی ہوئے جا رہے تھے۔ چنانچہ

---

[1]، [2]۔ اقبال نامہ حصہ دوم ص ۹-۱۲، ۱۲-۱۳

اقبالؔ کی تحریک سے مسلم لیگ نے اپنی عملی کاروائیاں تیز تر کردیں اور وہ اپنے موقف کے اور بھی سختی سے پابند ہو گئے۔ نتیجۃً اقبالؔ کے منشا کے مطابق نکلا۔ عوام نے کانگریس کا ساتھ دینے کے بجائے جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہونا شروع کیا۔ تحریکِ رابطۂ مسلم عوام کی مہم نہ صرف اپنے مقصد میں ناکام ہوئی بلکہ اس کا الٹا اثر ہوا۔ چنانچہ اس تحریک پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر امبیدکر اپنی کتاب "پاکستان" میں لکھتے ہیں:۔

"کانگریس کی جاری کردہ تحریکِ رابطۂ مسلم عوام نے یہ تمام فتنے کھڑے کر دیئے ہیں۔ اس لئے یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں میں پاکستان کا تصور پیدا کرنے کی بہت بڑی ذمہ داری اس احمقانہ تحریک کے سر عائد ہوتی ہے۔" لہ

اقبالؔ نے اسی زمانے میں یہ محسوس کیا تھا کہ لیگ کے بارے میں کانگریسیوں کا یہ اعتراض بہت حد تک صحیح تھا کہ یہ ایک عوامی ادارہ نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے متوسط اور اعلیٰ طبقے کی ترجمان ہے چنانچہ اس ضمن میں انہوں نے جناح کو لکھا:۔

"لیگ کو آخرکار یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ وہ بدستور ہندوستان کے مسلمانوں کے بالائی طبقوں کی ایک جماعت بنی رہے گی یا ان مسلمان عوام کی ایک اجتماعی ادارے کی صورت اختیار کرے گی جنہوں نے اب تک بعض معقول وجوہ کی بنا پر لیگ سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس سیاسی جماعت کے زندہ رہنے کا اب کوئی امکان نہیں جو عامۃ المسلمین کی حالت سدھارنے یا اُن کی فلاح و بہبود کے کاموں کی طرف توجہ کرنے سے گریز کرتی ہے۔ روٹی کا مسئلہ شدید سے شدید تر ہوتا جارہا ہے مسلمان اب یہ محسوس کر رہا ہے کہ گذشتہ دو صدیوں میں وہ پست سے پست تر ہوتا جارہا ہے۔ عام حالات میں تو خیر وہ یہی سمجھتا ہے کہ اس کی غربت کا باعث ہندو سود خوار یا سرمایہ دارانہ نظام ہے لیکن ابھی اس پر یہ ادراک طلوع نہیں ہوا کہ یہ سب کچھ تو غیر ملکی حکومت کی بنا پر ہے لیکن

لہ۔ پاکستان از امبیدکر۔ ص ۳۳۷۔

بالآخر اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے جواہر لال نہرو کا منکرِ خدا سوشلزم مسلمانوں کے لیے باعثِ کشش نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی غربت کیسے دُور ہو؟" [۱]

اسی خط میں وہ جناح کو مشورہ دیتے ہیں کہ برصغیر میں کشت و خون سے بچنے اور دائمی امن قائم کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ملک کو آزاد مسلم مملکت کے قیام کو ناگزیر بتلاتے ہیں:

"اس ملک میں شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ اور اس کا ارتقا ایک یا ایک سے زائد آزاد مسلم مملکتوں (A FREE MUSLIM STATE OR STATES) کے قیام کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ کئی برسوں سے میرا یہ ایماندارانہ ایقان رہا ہے اور میں اب بھی مسلمانوں کے روٹی کے مسئلے کو حل کرنے اور ساتھ ہی ایک پُرامن ہندوستان حاصل کرنے کا اسی کو واحد طریقہ سمجھتا ہوں۔" [۲]

۲۱ جون ۱۹۳۷ء کا خط اس معاملے میں زیادہ اہم ہے جس میں اقبالؔ نے واضح الفاظ میں اپنے اس خیال کا اعادہ کیا ہے کہ ہندوستان میں پائیدار امن اور مسلمانوں کے معاشی مسائل کا حل صرف ہندوستان کی تقسیم میں مضمر ہے۔

"میرے نزدیک واحد ہندوستانی فیڈریشن کا حامل نیا آئین کا ملاً ناقابل قبول ہے۔ اگر ایک پُرامن ہندوستان مطلوب ہے اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبے سے بچانا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ میری تجویز کے مطابق از سرِ نو بنائے مسلم صوبوں پر مشتمل ایک الگ فیڈریشن A SEPARATE FEDERATION OF MUSLIM PROVINCES بنائی جائے۔ آخر شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو کیوں نہ ایسی قومیں سمجھا جائے جنہیں ہندوستان کے اندر اور باہر کی دوسری قوموں کی طرح حقِ خود ارادیت حاصل ہو۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ

---

[۱] ، [۲] ۔ اقبالؔ نامہ حصہ دوئم ۔ ص ۱۴، ۱۴ ۔ ۱۵ + (بحوالہ رُوحِ مکاتیبِ اقبالؔ)

اس وقت شمالی مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو مسلم اقلیتی صوبوں کو نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ یہی وہ بہترین راستہ ہے جو مسلم اکثریتی اور مسلم اقلیتی دونوں قسم کے صوبوں کے مفاد میں ہے۔“ ؎۱

یہ بات بالکل واضح اور کسی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ مئی اور جون ۱۹۳۷ء میں محمد علی جناح سے خط و کتابت کرتے ہوئے اقبال نے جو تجویزیں پیش کیں وہ قطعی طور پر تقسیم ہند اور ایک علاحدہ آزاد وفاقی مسلم مملکت کی تجویز تھی اور یہ بات خود ان کے قول کے مطابق کئی برسوں سے ان کے ذہن میں پرورش پا رہی تھی۔ کئی برسوں کا تعین کرتے ہوئے محمد احمد خان اپنی کتاب اقبال کا سیاسی کارنامہ میں لکھتے ہیں کہ ”۱۹۳۰ء سے ہی ان کا یہ ایماندارانہ ایقان تھا کہ ملک کو تقسیم کر کے ایک علاحدہ آزاد مقتدر مملکت بنائی جائے۔“ ؎۲ اس طرح سے در اصل وہ اقبال کے اس خیال کو دسمبر ۱۹۳۰ء میں دیئے گئے خطبہ الہ آباد تک کھینچ لاتے ہیں لیکن تھامپسن خطوط میں اقبال نے اس طرح کی تقسیم سے لاتعلقی ظاہر کی اور یہ خطوط ۳۳-۱۹۳۴ء میں لکھے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ۱۹۳۴ء تک اگرچہ اقبال ایک خود مختار مسلم صوبے کی تشکیل کے حامی تھے لیکن بعد میں انہوں نے اپنی رائے بدل دی تھی؛ اور اب وہ مکمل طور پر ایک مقتدر اسلامی مملکت کے قیام کے خواہاں تھے، جیسا کہ ان خطوط سے بالکل واضح ہو جاتا ہے جو انہوں نے محمد علی جناح کے نام لکھے۔ یہ خطوط انہوں نے ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء میں لکھے۔ جناح کے نام ان کا آخری خط ۱۰ نومبر ۱۹۳۷ء کو لکھا گیا ہے یعنی انتقال سے صرف پانچ مہینے پہلے اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ ان آخری مہینوں میں اقبال کی صحت روز بروز گرتی رہی مختلف عوارض نے انہیں آگھیرا اور اب وہ زیادہ غور و فکر اور تحریر و تقریر کے متحمل نہیں رہے تھے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا کہ آخری دنوں میں اپنی رائے بدل دی تھی جیسا کہ ایڈورڈ تھامپسن نے اپنی کتاب ENLIST INDIA FOR FREEDOM میں کہا ہے قرینِ صحت نہیں ہے۔ تھامپسن کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ اقبال نے پاکستان سکیم کی حمایت اس لئے کی تھی کہ وہ مسلم لیگ کے سیشن کے صدر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے جہاں بحیثیت صدر اجلاس مسلم لیگ حمایت کی مجبوری کا

؎۱ اقبال نامہ۔ حصہ دوم۔ ص ۱۸-۲۳۰ ؎۲ اقبال کا سیاسی کارنامہ۔ محمد احمد خان۔ ص ۴۹۶

ذکر ٹامپسن کے نام خط میں کیا ہے وہاں وہ صاف لفظوں میں اُس قرطاسِ ابیض کی بات کر رہے ہیں جو حکومت نے ہندوستان میں نئے آئین کے سلسلے میں جاری کیا تھا جس کی حمایت کرنے کا مسلم لیگ نے فیصلہ کیا تھا پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی تھامپسن کی روایت ہی پر اپنی کتاب تلاش ہند (DISCOVERY OF INDIA) میں لکھا ہے۔

"Iqbal was one of the early advocates of Pakistan and yet he appears to have realised its inherent danger and absurdity. Edward Thompson has written that, in course of conversation, Iqbal told him that he had advocated Pakistan because of his position as President of the Muslim League Session, but he felt that it would be injurious to India as a whole and to Muslim specially. Probably he had changed his mind, or he had not given much thought to the question previously as it had assumed no importance then".[1]

حقیقت یہ ہے کہ تھامپسن کو تسامح ہوا ہے جب وہ یہ کہتے ہیں اقبال نے تقسیم ملک اور پاکستان سکیم کی حمایت اس لئے کی تھی کہ وہ ان دنوں لیگ کے صدر تھے لہٰذا حمایت کے لیے مجبور تھے۔ یہ حمایت جیسا کہ اُوپر ذکر آیا ہے "قرطاسِ ابیض کے بارے میں تھی جس پر اگرچہ اقبال کو کچھ اعتراض بھی تھا جس کا قبل ازیں آچکا ہے" تاہم انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اس کی حمایت کریں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اقبال نے تھامپسن سے یہ باتیں کسی گفتگو میں نہیں جیسا کہ نہرو نے لکھا ہے بلکہ خط میں بیان کی ہیں۔ اصل میں پنڈت نہرو کو

---

[1] Discovery of India - پنڈت جواہر لال نہرو ص: ۵۵-۳۵۴؂

یہ غلط فہمی تھامپسن کے اس جملے سے ہوئی ہے جس میں تھامپسن نے WRITING کے بجائے SPEAKING کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تھامپسن کی عبارت یوں ہے:۔

In the Observer I once said that he supported the Pakistan plan. Iqbal was a friend, and he set my mis-conception right after speaking of his despondency at the chaos he saw coming on 'his vast un-disciplined starving land'"

یہ تھامپسن اصل اس خط کا حوالہ دے رہے ہیں جو اقبال نے انہیں ۴ مارچ ۱۹۳۴ء کو لکھا جس کا حوالہ ہم اس سے پہلے دے چکے ہیں۔ اس خط میں اقبال نے واقعی پاکستان سکیم سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا ہے لیکن اقبال نے جس خط میں اپنے وسیع غیر منظم اور فاقہ کش ملک کی بات کی ہے وہ ۲۶ جولائی ۱۹۳۴ء کو لکھا گیا ہے اور اس میں ہندوستان میں جمہوریت کے نفاذ پر تبصرہ کیا ہے۔ اقبال کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

"...We must now prepare ourselves for the financial ruin, the political chaos and the dissolution of Hinduism which are likely to follow the introduction of democracy in this vast undisciplined and starving country".

ظاہر ہے تھامپسن نے اپنی کتاب لکھتے ہوئے یا تو اپنی یادداشت پر ہی بھروسہ کیا یا پھر جان بوجھ کر غلط مبحث کرنے کی کوشش کی ہے۔

ENLIST INDIA FOR FREEDOM — Edward Thompson
(as quoted in Times of India, May 31, 1983)

اقبالؔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال کر گئے۔ دو برس بعد یعنی مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں مسلم لیگ نے وہ قرار داد منظور کی جو قرار داد پاکستان کے نام مشہور ہوئی۔ جس میں پہلی بار مسلم لیگ نے پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک مقتدر اسلامی مملکت پاکستان کے نام سے وجود میں آئی اور اس طرح سے اقبالؔ کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی کہ:۔

"مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قایم کرنا پڑے گی۔" ؎[1]

[1] خطبہ الہ آباد بحوالہ اقبالؔ ۔ تصور قومیت اور پاکستان ۔ ص ۱۸۸

اقبال کے چند مخصوص مکتوب الیہم

اقبال کے احباب کا دائرہ بہت ہی وسیع تھا، ان کے سوانح نگار اس بات پر متفق ہیں کہ ان کے پاس کسی بھی وقت کوئی بھی شخص آجا سکتا تھا، کسی قسم کی پابندی یا تخصیص نہیں تھی۔ اسی طرح ان کی مراسلت کا حلقہ بھی کافی وسیع تھا، اقبال کے دستیاب خطوط کی تعداد تقریباً تیرہ ۱۳۰۰ سو تک پہنچتی ہے، اسی طرح ان کے مکتوب الیہم کی تعداد بھی تقریباً ڈیڑھ سو ہے، جن میں ہر طرح کے لوگ ہیں، ادنیٰ بھی اعلیٰ بھی ادیب شاعر بھی ہیں، زمیندار اور جاگیردار بھی ہیں، اساتذہ بھی ہیں اور طالب علم بھی۔ وہ لوگ بھی ہیں جنہیں اقبال کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا شرف بھی حاصل تھا اور وہ لوگ بھی جنہوں نے اقبال کو کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ ان میں مسلمان بھی تھے ہندو بھی تھے اور سکھ اور عیسائی بھی۔ غرض ہر طرح کے لوگوں سے اقبال کی مراسلت اور مکاتبت ہوئی ہے۔ اس باب میں ہم صرف اُن کے چند مکتوب الیہم کے نام لکھے گئے خطوط کا جائزہ لیں گے جنہیں یہ تخصیص حاصل ہے کہ ان کے نام نہ صرف یہ کہ خطوط کی تعداد زیادہ ہے بلکہ یہ خطوط مواد کے اعتبار سے بھی خاصے قابلِ توجہ ہیں۔ ان مکتوب الیہم میں سید سلیمان ندوی، مولانا غلام قادر گرامی، خان محمد نیاز الدین خان اور سید نذیر نیازی شامل ہیں، ان کے نام لکھے گئے مکاتیب میں جہاں اقبال کی شخصیت کے بہت سے پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں، وہاں ان سے اقبال کے مافی الضمیر، ان کی فکر اور اس فکر کے مآخذات اور اس کے علاوہ انکی علمی اور ادبی دلچسپیوں

مختلف کتابوں کے بارے میں ان کی رائے اور مختلف ذرائع سے ان کے کسب فیض کا احوال لکھتا ہے۔ اس ضمن میں پہلے ہم ان خطوط کو لیں گے جو انہوں نے سید سلیمان ندوی کے نام لکھے ہیں۔

مکاتیب بنام سید سلیمان ندوی: مولانا سید سلیمان ندوی جنہیں اقبال نے "علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد" کہا تھا، ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء[1] کو دیسنہ ضلع پٹنہ بہار میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا اپنے وقت کے مشہور اطبا میں تھے اور طب میں کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مولانا کے والد سید ابوالحسن بھی اپنے دور کے ماہر طبیب تھے۔ سید سلیمان ندوی نے ابتدائی تعلیم خلیفہ انور علی اور پھر مولوی مقصود علی سے حاصل کی۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں ختم کر لینے کے بعد عربی میں میزان و منشعب اپنے بڑے بھائی مولوی ابو حبیب سے پڑھیں مولانا اسماعیل شہید کی مشہور کتاب "تقویۃ الایمان" بھی اپنے بڑے بھائی سے سنی تھی۔ چنانچہ مولانا نے اس کتاب کے متعلق اپنے تاثر کو قلمبند کرتے ہوئے لکھا کہ "یہ پہلی کتاب تھی جس نے مجھے دین حق کی باتیں سکھائیں" ۱۸۹۹ء میں آپ پھلواری شریف پٹنہ آئے وہاں ایک سال خانقاہ مجیبی میں رہ کر مولانا محی الدین سجادہ نشین پھلواری شریف سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھلواری سے آپ دربھنگہ آئے جہاں مدرسۂ امدادیہ میں بھی چند مہینے تعلیم پائی۔ ۱۹۰۱ء میں آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، یہیں انہوں نے اپنے علم کی تکمیل کی۔ جب ۱۹۰۵ء میں مولانا شبلی ندوۃ العلماء میں آئے تو انہوں نے سید سلیمان کی استعداد اور قابلیت کو بھانپ لیا اور غیر معمولی شفقت سے ان کی تربیت کی۔ جب ۱۹۰۷ء میں سید سلیمان ندوۃ العلماء کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو مولانا شبلی نے انہیں رسالہ "الندوہ" کا سب ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ مولانا شبلی نے ۱۹۱۲ء کے اجلاس میں سید سلیمان ندوی کے بارے میں کہا۔

"ندوہ نے کیا کیا، کچھ نہیں کیا، صرف ایک سلیمان کو پیدا کیا تو یہی کافی ہے۔"

۱۹۱۱ء میں جب مولانا شبلی نے سیرت النبیؐ کی تدوین و ترتیب کا شعبہ قائم کیا تو مولانا سلیمان ندوی کو اس کا لٹریری اسسٹنٹ مقرر کیا۔ ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی دعوت پر آپ "الہلال" کے سٹاف میں شامل ہو گئے لیکن بعض وجوہ سے ایک سال کے بعد الہلال کی ادارتی سٹاف سے سبکدوش ہو گئے۔

---

[1] یہ تفصیل تذکرہ سلیمان از غلام محمد (بی اے عثمانیہ) ص ۳۱-۳۳ سے ماخوذ ہے۔

مولانا شبلی کی وفات کے بعد تلامذۂ شبلی نے انہیں سید الطائفہ کا لقب دے کر علامہ شبلی کا جانشین بنا دیا۔ چنانچہ آپ پونہ سے اعظم گڈھ آ گئے۔ ۱۹۱۶ء میں انہوں نے معارف کا اجرا کیا جسے اہلِ نظر نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس رسالے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اقبال نے مولانا سلیمان کے نام ایک خط میں لکھا کہ:۔ "یہی ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارتِ ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔"

——— مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنے ایک خط میں معارف پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"معارف کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں صرف یہی ایک پرچہ ہے اور تو ہر طرف سناٹا ہے بحمد اللہ کہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائیگاں نہ گئیں اور صرف آپ کی بدولت ایک جگہ ایسی بن گئی جو صرف خدمتِ علم اور تصنیف و تالیف کے لیے وقف ہے۔" [۱]

معارف میں قابلِ قدر مضامین اور شذرات کے علاوہ مولانا نے کئی مستقل کتابیں بھی تصنیف کیں جن میں سیرت النبی کی پانچویں اور چھٹی جلد سب سے اہم ہے کہ اس طرح سے انہوں نے اپنے استاد مولانا شبلی کے ایک معرکتہ الآرا کارنامے کو تکمیل تک پہنچایا۔ ارض القرآن اور سیرت النبیؐ کے علاوہ مولانا کی تصانیف میں سیرتِ عائشہ، خیام، خطباتِ مدراس، عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہاز رانی قابلِ ذکر ہیں۔ سیرتِ عائشہ کے بارے میں اقبال نے انہیں ایک خط میں لکھا:۔

"سیرتِ عائشہ کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ یہ ہدیۂ سلیمانی نہیں سرمۂ سلیمانی ہے اس کتاب کے پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا۔" [۲]

اسی طرح جب خیام شائع ہوئی تو اقبال نے اِس پر ان الفاظ میں مولانا کو مبارکباد دی:۔

"عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔ الحمد للہ کہ اس بحث کا خاتمہ آپ کی تصنیف پر ہوا۔" [۳]

مولانا سید سلیمان ندوی خود ایک شمعِ انجمن تھے جن سے تالیف و تصنیف کے علاوہ مختلف تحریکوں کے جو اس زمانے میں پیدا ہوئیں، چراغ جلتے تھے وہ ہر اس تحریک کی آبیاری کرتے جس کو وہ مسلمانوں کے لیے

---

[۱] معارف۔ سلیمان نمبر ص ۱۷۔ [۲]، [۳]۔ اقبال نامہ۔ جلد اوّل۔ ص ۱۱۳، ۱۷۸۔

مفید سمجھتے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں انہوں نے جلسہ علمائے بنگال کی صدارت کی۔ ۱۹۱۹ء میں وہ تحریک خلافت کے سرگرم رکن تھے اور ۱۹۲۰ء میں جب خلافت کا ایک وفد ترکی کے معاملے میں انصاف چاہنے کے لیے یورپ گیا تو وہ بھی اس وفد میں شامل تھے۔ یہ وفد سات ماہ کے دورہ یورپ سے واپس آیا تھا ترک موالات کے سلسلے میں بھی انہوں نے دوسرے علماء اور زعماء کے ساتھ ہندوستان کے دورے کیے۔ سیاست میں انہوں نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا اور بعد میں پاکستان کے قیام کے بعد ۱۹۵۰ء میں ہجرت کی اور پاکستان میں ہی مقیم ہو گئے جہاں انہوں نے اپنے علم و فضل سے بہتوں کو مستفید کیا۔ آخر کار ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کو انہوں نے انتقال فرمایا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرت، تاریخ اور ادب کو نیا لب و لہجہ دیا۔ اپنے استاد علامہ شبلی کے نقش قدم پر چل کر انہوں نے اپنے ادب میں جو اثرات چھوڑے ہیں وہ انمٹ ہیں۔ ان کی تحریریں اعتدال، شکوہ، توازن، متانت اور سنجیدگی کی آئینہ دار ہیں۔ اپنے دائرے میں وہ منفرد اور ممتاز ہیں۔ مولانا شاہ معین الدین نے ان کے کمالات کی فہرست اور ان کی غرض و غایت کو ایک جگہ سموتے ہوئے لکھا کہ:۔

"ان کے علمی و دینی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے مگر ان سب کی غرض و غایت تقریباً ایک ہے یعنی اسلامی تعلیمات و احکام کی صحیح اور دلنشین ترجمانی اور اسلامی علوم و فنون، اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب و ثقافت اور مسلمانوں کے علمی اور تمدنی کارناموں کی محققانہ موقعہ نگاری، یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس میں پوری اسلامی تاریخ آجاتی ہے اور ان کی بیشتر بلکہ کل تصانیف اور مضامین کا محور و مرکز یہی نقطہ ہے۔ گو ان کے ہمہ گیر علم و قلم کی عناں کبھی کبھی خالص علم و ادب کی جانب مڑ جاتی تھی۔ مگر بہت کم مضامین ایسے نکلیں گے جو کسی نہ کسی حیثیت سے اصل مرکزی مقصد سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔" [1]

---

[1] معارف۔ سلیمان نمبر۔ ص ۱۷۷۔ ۱۷۸

—— ، صاحب کی نثر پر مولانا عبدالماجد دریابادی نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:۔

"سید صاحب کی نثر پر اگر قلم اُٹھایئے تو دیدۂ دل حیران کہ شروع کہاں سے کیجیے.....
شستگی، متانت، شرافت یہ تو اُن کے اسلوبِ تحریر کے جوہرِ اصلی ہیں اور اس پر جابجا شوخی و ظرافت کی گلکاریاں اور حسنِ صناعت کی سحر طرازیاں جیسے خاتمِ سلیمانی میں نگین" [۱]

سید صاحب شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور خود بھی شعر کہتے تھے۔ غزلیں، قطعات، رباعیات وغیرہ لکھی ہیں، کبھی کبھی فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ سید صاحب کی شاعری تبرک کا ہی درجہ رکھتی ہے اور یُوں بھی یہ ان کے لیے وجہِ شہرت نہیں، بہت کم لوگ ان کی اس حیثیت سے واقف ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک غزل اقبال کو بھجوائی تھی، اقبال نے انہیں لکھا:۔

"آپ کی غزل لاجواب ہے بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا ہے۔

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں — وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا اور جو چند نظمیں انہوں نے لکھی تھیں، وہ نہایت مقبول ہوئیں غزل کے ساتھ وہ بھی جاری رکھیے۔" [۲]

مولانا کو شاعری سے صرف اسی حد تک لگاؤ رہا کہ جب ان پر کوئی خاص کیفیت طاری ہوتی تو کوئی نظم یا کوئی غزل کہہ دیتے ورنہ ان کا زیادہ تر وقت تصنیف و تالیف میں ہی صرف ہوتا۔

سید سلیمان ندوی اور اقبال ۱۹۲۷ء میں ایک دوسرے سے ملے لیکن مراسلت بہت پہلے سے تھی، معارف کے مئی ۱۹۲۷ء کے شمارے میں مولانا نے لاہور میں اقبال سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"ڈاکٹر اقبال سے یہ میری پہلی ظاہری ملاقات تھی اور مراسلت کی باطنی ملاقات تو ۱۹۱۴ء سے قائم ہے۔" [۳]

مولانا کے اس بیان کے مطابق مراسلت کی ابتدا ۱۹۱۴ء میں ہوئی ہے جبکہ دستیاب خطوط میں پہلا خط

---

[۱] معارف سلیمان نمبر ص ۲۳۲ ٭ [۲] اقبال نامہ حصہ اول ص ۷۶، ۷۷ ٭ [۳] معارف مئی ۱۹۲۷ء ٭

یکم نومبر ۱۹۱۶ء کا ہے۔ مولانا کے نام اقبال کے ۷ خط اقبال نامے میں شایع ہوئے ہیں۔ یہ خطوط معارف میں ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۵ء کے مختلف شماروں میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں طاہر تونسوی نے ان خطوط کو ایک الگ مجموعے کی صورت میں اقبال اور سید سلیمان ندوی کے نام سے شایع کر دیا۔ اس کتاب کا ہندوستانی ایڈیشن ۱۹۷۹ء میں شایع ہوا۔ ان سب میں خطوط کی تعداد دو سو نشتر ہے ان میں پہلا خط یکم نومبر ۱۹۱۶ء کا اور آخری خط ۷ اگست ۱۹۳۰ء کا ہے۔ مجلہ اقبال لاہور کے اکتوبر ۱۹۷۶ء کے شمارے میں ایک اور خط بھی شائع ہوا ہے (ص ۵۱-۵۲) اس خط کی تلخیص محمد عبداللہ قریشی نے روح مکاتیب اقبال میں بھی دی ہے (ص ۶۹۸) مولانا کے خطوط جو انہوں نے اقبال کو لکھے تھے اور جنہیں اقبال محفوظ رکھتے تھے آج تک دستیاب نہیں ہو سکے۔ اقبال نے ان خطوط کو حفاظت سے رکھنے کے بارے میں خود ۷ اپریل ۱۹۲۶ء کو لکھا ہے۔

"آپ کے بعض خطوط میرے پاس محفوظ ہیں اور یہ آخری خط بھی جو نہایت معنی خیز ہے اور جس کے مضمون سے مجھے بحیثیت مجموعی پورا اتفاق ہے محفوظ رہے گا۔"

طاہر تونسوی لکھتے ہیں کہ انہوں نے ان خطوط کی تلاش کی تھی چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے پروفیسر مرزا محمد منور کی معرفت ڈاکٹر جاوید اقبال سے بھی رابطہ قایم کیا تھا لیکن ڈاکٹر جاوید اقبال نے ان خطوط کی موجودگی سے قطعی لاعلمی ظاہر کی۔[1] اسی طرح سید صباح الدین عبدالرحمن جنہوں نے اقبال اور سلیمان ندوی پر تقریظ لکھی ہے اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ :-

"عرصہ سے اس کی تلاش ہے کہ حضرت سید صاحب نے علامہ محمد اقبال کو جو خطوط لکھے وہ کہیں مل جائیں لیکن ابھی تک کامیابی نہ ہو سکی۔ ان خطوط کی نقلیں دارالمصنفین میں بھی نہیں ہیں۔ لاہور آکر معلوم ہوا کہ علامہ اقبال کے علمی ذخایر میں بھی یہ خطوط نہیں ہیں، وہ اگر مل جاتے تو علمی خزانے کی ایک وقیع دولت شمار ہوتے۔"[2]

یہ خطوط اگر مل جاتے تو یقیناً سید سلیمان ندوی اور اقبال کے تعلقات پر مزید روشنی پڑتی اور زیادہ

---

[1] ماخوذ از دیباچہ اقبال اور سلیمان ندوی۔ طاہر تونسوی۔ ص ۸۔

[2] ایضاً۔ تقریظ از سید صباح الدین عبدالرحمن۔ ص ۱۲۔

اہم بات یہ ہوتی کہ اقبال نے ان سے جو خطوط میں مختلف سوالات پوچھے ہیں یا مسائل کی توضیح چاہی ہے تو مولانا کے جوابات کی روشنی میں یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ اقبال نے کس حد تک ان سے استفادہ کیا ہے۔ پھر بھی اقبال نے وقتاً فوقتاً جو تاثرات مکاتیب میں مولانا کے بارے میں ظاہر کئے ہیں ان سے ایک بات تو بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا کو وہ کس درجہ احترام و عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور یہ کہ وہ کس حد تک مولانا کے علم و فضل سے متاثر تھے۔

جیسا کہ ذکر آیا ہے مولانا کے نام ان کا پہلا خط یکم نومبر ۱۹۱۶ء کا ہے۔ اس خط میں بین السطور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلا خط نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی خط و کتابت کا سلسلہ رہا ہے۔ خط مختصر ہے۔

"مخدومی! السلام علیکم۔

اورینٹل کالج لاہور میں ہیڈ پرشین ٹیچر کی جگہ خالی ہوئی ہے۔ اس کی تنخواہ ایک سو بیس روپے ماہوار ہے۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اس جگہ کو اپنے لئے پسند فرماتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو آپ کے لیے سعی کی جائے۔ آپ کا لاہور میں رہنا پنجاب والوں کے لیے بے حد مفید ہوگا۔

والسلام!

آپ کا خادم

محمد اقبال بیرسٹر لاہور"[1]

اس خط میں بھی اور دیگر خطوط میں بھی اقبال نے مولانا کو مخدومی کے لفظ سے خطاب کیا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ اقبال مولانا کا بہت ہی احترام کرتے تھے۔ علاوہ ازیں خط کے آخری جملے سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ مولانا کی پنجاب میں موجودگی اہل پنجاب کے لیے فائدہ مند سمجھتے تھے۔ مولانا اس منصب کے لیے نہ آسکے۔ اقبال کو اس کا افسوس ہوا۔ اور ۱۲ نومبر ۱۹۱۶ء کو اپنے دوسرے خط میں اس کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ ملازمت قبول نہ کریں گے لیکن سنڈیکیٹ کے بعض ممبروں کی تعمیل ارشاد میں آپ کو لکھنا ضرور تھا۔ کسی قدر خود غرضی کا شائبہ بھی میرے خط میں تھا

---

[1] اقبال نامہ۔ جلد اول۔ ص ۷۵

اور وہ یہ کہ میں چاہتا تھا کہ جس طرح پنجاب کو صوبۂ متحدہ کے علماء و فضلاء سے پیشتر فائدہ پہنچا ہے اب بھی وہ سلسلہ آپ کے یہاں رہنے سے بدستور جاری رہے۔" لہ

اس کے بعد تیسرا خط پورے ایک سال کے بعد کا ہے یعنی ۱۳ر نومبر ۱۹۱۷ء کا۔ یہ خط مولانا کے خط کے جواب میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس خط میں اقبال نے سید سلیمان ندوی کے کام کی تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ جو کام آپ کر رہے ہیں جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس کے علاوہ اس میں اقبال نے تصوف کو سرزمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا کہا ہے۔ اس بات کا انکشاف بھی اسی خط سے ہوتا ہے کہ اقبال سلسلۂ قادریہ میں بیعت رکھتے تھے۔ رموزِ بے خودی کے بارے میں لکھا ہے کہ قریب الاختتام ہے۔ تیسرا خط جو ۲۸۔ اپریل ۱۹۱۸ء کو لکھا گیا ہے اس میں رموزِ بے خودی پر مولانا کے ریویو کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ اسی خط میں یہ بات بھی کھلتی ہے کہ مولانا آزاد اور اقبال کی بھی آپس میں مراسلت تھی چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"آج مولانا ابو الکلام کا خط آیا ہے انہوں نے بھی میری ناچیز کوشش کو بہت پسند فرمایا ہے۔"

مولانا سید سلیمان ندوی کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے انہیں استاذ الکل کہا ہے۔ ۱۰ مئی ۱۹۱۸ء کے خط میں معارف میں چھپے ہوئے رموزِ بے خودی کے ریویو کے لیے مولانا کا شکریہ ادا کیا تھا اور ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی ہے کہ انہیں زبان کی ان لغزشوں سے بھی آگاہ کریں جن کی جانب مولانا نے اپنے ریویو میں اشارہ کیا تھا۔ اس میں کسی قسم کے اختلاف کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ فراخدلی اور بلند نظری کی بنا پر یہ درخواست کی ہے۔ اس خط کی ایک سطر سے اقبال کی خاکساری اور فروتنی ظاہر ہوتی ہے۔ جب مولانا کئی مہینے تک ان تسامحات کی نشاندہی کرنے سے گریز کرتے رہے تو اقبال نے نہایت اصرار کے ساتھ انہیں لکھا کہ:۔ ان اسقام کی نشاندہی کریں۔ افسوس تو یہ ہے کہ مولانا کے خطوط ہمارے سامنے نہیں ہیں لیکن اقبال کے ان خطوط کے مطالعے سے جو اس ضمن میں لکھے گئے ہیں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مولانا نے جن تسامحات کی طرف توجہ دلائی تھی ان میں سے اکثر و بیشتر سے اقبال کو اختلاف تھا۔ اور انہوں نے اساتذہ کی اسناد پیش کر کے مولانا کو مطمئن کرنے کی کوشش کی اور غالباً

لہ۔ اقبال نامہ جلد اول، ص ۷۶۔

مولانا مطمئن بھی ہو گئے۔ اقبالؔ اپنی فروتنی اور عالی ظرفی سے انہیں برابر لکھتے رہے کہ میری خامیوں سے ضرور آگاہ کیجئے' آپ کو زحمت تو ہو گی لیکن مجھے فائدہ ہو گا (۳ اپریل ۱۹۱۹ء) اور پھر شاعری کے بارے میں اپنے مطمحِ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء کے خط میں لکھا۔

"شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا کہ فن کے باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں' مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدِ نظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔" لہ

یہ بحث کئی خطوط پر محیط ہے جن خطوط میں اس کا ذکر آیا ہے وہ ۱۰ مئی ۱۹۱۸ء' ۳ اکتوبر ۱۹۱۸ء' ۲۳ اکتوبر ۱۹۱۸ء' ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء' ۲۰ نومبر ۱۹۱۸ء اور ۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو لکھے گئے ہیں۔ یعنی کم و بیش ایک سال تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مولانا کے نام اقبالؔ کے خطوط کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ ان میں مذہبی معاملات خاص طور پر فقہ کے مسائل اور اسلامی مابعد الطبیعاتی مسائل کا ذکر آیا ہے۔ اقبالؔ عموماً ان خطوط میں اپنے شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لیے ان سے استفسارات کرتے رہتے ہیں۔ اقبالؔ میں ایک سچے عالم کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔ وہ اپنے علم کی بلندی اور گہرائی کا اظہار پسند نہیں کرتے تھے' سب سے بڑی بات یہ تھی کہ انہیں اپنے محدودات کا علم تھا اور جو بات انہیں معلوم نہیں ہوتی تھی' اس کے معلوم کرنے میں وہ کسی قسم کا تکلف نہیں برتتے تھے اور نہ اسے اپنی شہرت اور عظمت کے منافی سمجھتے تھے' اس ضمن میں مولانا سید سلیمان ندوی کے نام خطوط زیادہ اہم ہیں کہ ان کا معتد بہ حصہ اسی طرح کے سوالات سے پُر ہے' ان استفسارات کو اگر سنہ وار مرتب کر دیا جائے تو ان سے اُن کے ذہنی تجسس اور تفحص کے ساتھ ان کے ذہنی ارتقا کا اندازہ بھی ہو گا۔ ہم اسی غرض سے ان استفسارات کو اقبالؔ کے الفاظ میں ہی ترتیب زمانی کے ساتھ درج کرتے ہیں۔

۱۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ مؤکلین وکلا کے پاس جب مقدمات کی پیشی کے لیے آتے

لہ۔ اقبالؔ نامہ۔ جلد اوّل، ص۔ ۱۰۷۔

ہیں تو ان میں سے بعض پھل پھول یا مٹھائی کی صورت میں ہدیے لے آتے ہیں۔ یہ ہدایا فیس مقررہ کے علاوہ ہوتے ہیں اور وہ لوگ اپنی خوشی سے لاتے ہیں۔ کیا یہ مال مسلمان کے لیے حلال ہے۔"

—————— ۱۰ر نومبر ۱۹۱۹ء

۲۔ "یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ حمیرا والی سب احادیث موضوعات میں ہیں۔ کیا کلمینی یا حمیرا بھی موضوع ہے؟"

—————— ۲۳ر دسمبر ۱۹۲۰ء

۳۔ کیا حکمائے صوفیہ اسلام میں کسی نے زمان و مکان کی حقیقت پر بحث کی ہے۔؟"

—————— ۵۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء

۴۔ "دو باتیں دریافت طلب ہیں، (۱) متکلمین میں سے بعض نے علم مناظرہ مرایا کی رُو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدا تعالیٰ کی رویت ممکن ہے۔ یہ بحث کہاں ملے گی۔ میں اس مضمون کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ (۲) مرزا غالب کے اس شعر کا مفہوم آپ کے نزدیک کیا ہے۔

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود رحمۃ للعالمینے ہم بود

حال کے ہیئت دان کہتے ہیں کہ بعض سیاروں میں انسان یا انسانوں سے اعلیٰ تر مخلوق کی آبادی ممکن ہے۔ اگر ایسا ہو تو رحمۃ للعالمین کا ظہور وہاں بھی ضروری ہے۔ اس صورت میں کم از کم محمدیت کے لیے تناسخ یا بروز لازم آتا ہے۔ شیخ اشراق تناسخ کے ایک شکل میں قائل تھے۔ ان کے اس عقیدے کی وجہ یہی تو نہ تھی۔"

—————— ۲۰۔ اپریل ۱۹۲۲ء

۵۔ "مردانِ خدا خدا نباشند لیکن ز خدا جُدا نہ باشند

کس کا شعر ہے۔"

—————— ۳۔ اگست ۱۹۲۲ء

۶۔ مولانا حکیم برکات احمد صاحب بہاری ثم ٹونکی کا رسالہ تحقیق زمان مطبوعہ ہے یا قلمی؟ اگر قلمی ہے تو کہاں سے عاریتاً ملے گا۔ علیٰ ہٰذا القیاس مولانا شاہ اسمٰعیل کی عبقات، قاضی محب اللہ کی جواہر الفرد اور حافظ امان اللہ بنارسی کی تمام تصانیف کہاں سے دستیاب ہوں گی.....

جن کتابوں کا آپ نے اپنے والا نامے میں ذکر فرمایا ہے، کیا آپ کے کتب خانہ دار المصنفین میں موجود ہیں؟ اگر ہوں تو میں چند روز کے لیے وہیں حاضر ہو جاؤں اور آپ کی مدد سے ان میں سے بعض کو دیکھ سکوں..... حضرت ابن عربی کی بحث زمان کا ملخص اگر عطا ہو جائے تو بہت عنایت ہو گی۔"

۲۲، اگست ۱۹۲۲ء

"۷۔ آپ حضرت اویسؒ اور ان تمام صوفی روایات کے متعلق جو ان سے منسوب ہیں، کیا خیال رکھتے ہیں۔ اگر امام مالک کی تحقیق زیر نظر ہو تو از راہ عنایت حوالے سے آگاہ کیجیے۔"

۲۳ جنوری ۱۹۲۴ء

"۸۔ مسلمانوں نے منطق استقرائی پر جو کچھ لکھا ہے اور جو اضافے انہوں نے یونانیوں کی منطق پر کیے ہیں، اس کے متعلق میں کچھ تحقیق کر رہا ہوں۔ میں آپ کا نہایت شکر گزار رہوں گا۔ اگر از راہ عنایت اپنی وسیع معلومات سے مجھے مستفیض فرمائیں، کم از کم ان مقالوں کے نام تحریر فرمائیے جن کو پڑھنا ضروری ہے۔"

یکم فروری ۱۹۲۴ء

"۹۔ کیا روسی مسلمانوں میں بھی ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب نجدی کے حالات کی اشاعت ہوئی تھی؟ اس کے متعلق آگاہی کی ضرورت ہے۔ مفتی عالم جان جن کا حال میں انتقال ہو گیا ہے ان کی تحریک کی اصل غایت کیا تھی؟ کیا یہ محض تعلیمی تحریک تھی یا اس کا مقصود ایک مذہبی انقلاب بھی تھا۔"

یکم مئی ۱۹۲۴ء

"۱۰۔ حال میں امریکہ کی مشہور یونیورسٹی کولمبیا نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام مسلمانوں کے نظریہ متعلقہ مالیات ہے۔ اس کتاب میں لکھا ہے اجماع امت نص قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے اب یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے۔"

۸، اگست ۱۹۲۴ء

"۱۱۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اجماع سے نص کی تخصیص جائز رکھی ہے۔ ایسی تخصیص یا تعمیم کی مثال اگر کوئی ہے تو اس سے آگاہ فرمائیے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہے کہ

ایسی تخصیص یا تعمیم صرف اجماعِ صحابہ ہی کر سکتا ہے یا علمائے مجتہدین اُمت بھی کر سکتے ہیں۔
کوئی حکم ایسا بھی ہے جو صحابہ نے نصِ قرآن کے خلاف نافذ کیا ہو اور وہ کون سا حکم ہے۔؟"

۲۷ اگست ۱۹۲۴ء

۱۲۔ "آپ نے کسی گزشتہ خط میں مجھے لکھا تھا کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو آپ بعض دفعہ وحی کا انتظار فرماتے۔ اگر وحی نازل ہوتی تو اس کے مطابق جواب دیتے اور اگر وحی کا نزول نہ ہوتا تو قرآن شریف کی کسی آیت سے استدلال فرماتے... اس کا حوالہ کون سی کتاب میں ملے گا؟ کیا یہ قاضی شوکانی کی کتاب ارشاد الفحول سے آپ نے لیا ہے؟"

۱۶ اکتوبر ۱۹۲۴ء

۱۳۔ "آیۂ توریث میں حصص بھی ازلی و ابدی ہیں یا قاعدۂ توریث میں جو اصول مضمر ہے صرف وہی ناقابلِ تبدیل ہے اور حصص میں حالات کے مطابق تبدیلی ہو سکتی ہے۔ آیۂ وصیت پر بھی جو ارشادات ہیں میری سمجھ میں نہیں آئے۔ اس زحمت کے لیے معافی چاہتا ہوں، جب فرصت ملے جزئیات سے بھی آگاہ فرمائیے۔ اس احسان کے لیے ہمیشہ شکرگزار رہوں گا۔"

۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء

۱۴۔ "امام ایک شخص واحد ہے یا جماعت بھی امام کے قائم مقام ہو سکتی ہے۔ ہر اسلامی ملک کا اپنا امام ہو یا تمام اسلامی دنیا کے لیے ایک واحد امام ہو۔ مؤخر الذکر صورت موجودہ فرق اسلامیہ کی موجودگی میں کیونکر بروئے کار آ سکتی ہے؟"

۷ اپریل ۱۹۲۶ء

۱۵۔ "اجتہاد کی بنا محض بشری اور تجربہ و مشاہدہ ہے یا یہ بھی وحی میں داخل ہے۔ اس پر آپ کیا دلیل قائم کرتے ہیں.... وحی غیر متلو کی تعریف نفسیاتی اعتبار سے کیا ہے؟ کیا وحی متلو اور غیر متلو کے امتیاز کا پتہ رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک میں چلتا ہے یا یہ اصطلاحات بعد میں وضع کی گئیں؟"

۱۶۔ "حضورؐ نے اذان کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ کیا یہ مشورہ نبوت کے تحت میں آئے گا یا

امامت کے تحت ہیں؟"

۱۷۔ "امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک طلاق یا خاوند کی موت کے دو سال بعد بھی اگر بچہ ہوا تو قیاس اس بچے کے ولد الحرام ہونے پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس مسئلہ کی اساس کیا ہے؟ کیا یہ اصول محض ایک قاعدۂ شہادت ہے یا جزوِ قانون ہے۔ اس سوال کے پوچھنے کی وجہ یہ ہے کہ مروجہ ایکٹ شہادت[1] کی رو سے تمام وہ قواعدِ شہادت جو اس ایکٹ کے نفاذ سے پہلے ملک میں مروج تھے منسوخ کئے گئے ہیں۔"

۲۴ اپریل ۱۹۲۶ء

۱۸۔ "شمس بازغہ یا صدرا میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کئے ہیں ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمان خدا ہے۔ بخاری میں ایک حدیث بھی اسی مضمون کی ہے..... کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ بحث کہاں ملے گی؟"

۷ مارچ ۱۹۲۸ء

۱۹۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ آپ زمان کے متعلق امام رازی کے خیالات کا خلاصہ قلمبند فرما کر مجھے ارسال فرمائیں۔ میں اس کا ترجمہ نہیں چاہتا صرف خلاصہ چاہتا ہوں، جس کے لکھنے میں غالباً آپ کا بہت سا وقت ضائع نہ ہوگا۔"

۱۸ مارچ ۱۹۲۸ء

۲۰۔ "مہربانی کر کے یہ فرمائیے کہ لفظ تعار سے کیا مراد ہے اور اس کے تحت میں کون کون سے مراسم یا دستور آتے ہیں؟ اس لفظ کی مفصل تشریح مطلوب ہے۔ جواب کا سخت انتظار رہے گا۔"

۲۲ ستمبر ۱۹۲۹ء

۲۱۔ "حضرت محی الدین ابن عربی کے فتوحات یا کسی اور کتاب میں حقیقتِ زمان[2] کی بحث کس جگہ ہے؟

---

[1] ہندوستانی قانونِ شہادت کی دفعہ ۱۱۲ کی رو سے یہ مدت نو ماہ اور دس دن ہے۔

[2] لارڈ لوتھین کے توسط سے اقبال کو آکسفورڈ میں فکر اسلامی میں تصور زمان و مکان کے موضوع پر لیکچر دینے کی دعوت ملی تھی۔ اس لیکچر کی تیاری کے سلسلے میں انہوں نے نوٹس وغیرہ بھی بنا لئے تھے۔ لیکن صحت کی خرابی کے باعث اقبال یہ لیکچر نہ دے سکے۔

حضرات صوفیہ میں اگر کسی بزرگ نے بھی اس مضمون پر بحث کی ہو تو اس کے حوالے سے بھی آگاہ فرمایئے۔ متکلمین کے نقطۂ خیال سے حقیقت زمان یا آنِ سیال پر مختصر اور مدلّل بحث کون سی کتاب میں ملے گی؟"

________ ۸، اگست ۱۹۳۳ء

۲۲۔ "نور الاسلام کا عربی رسالہ بابت مکان جو رامپور میں ہے کس زبان میں ہے، قلمی ہے یا مطبوعہ؟ نور الاسلام کا زمانہ کون سا ہے؟"

________ ۴ ستمبر ۱۹۳۳ء

۲۳۔ "ملا محب اللہ بہاری کی کتاب جواہر الفرد کہاں ملے گی؟" ۱۰ ستمبر ۱۹۳۳ء

۲۴۔ "اگر دہر ممتد اور مستمر ہے اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے تو مکان کیا چیز ہے؟ جس طرح زمان دہر کا ایک طرح سے عکس ہے اسی طرح مکان بھی دہر ہی کا عکس ہونا چاہیئے یا یوں کہیئے کہ زمان و مکان دونوں کی حقیقت اصلیہ دھر ہی ہے؟ کیا یہ خیال محی الدین ابن عربی کے نقطۂ خیال سے صحیح ہے؟ اس کا جواب شاید فتوحات میں ہی ملے۔ مہربانی کر کے تھوڑی سی تکلیف اور گوارا فرمایئے اور دیکھیئے کہ کیا انہوں نے مکان پر بھی کچھ بحث کی ہے اور اگر کی ہے تو مکان اور دہر کا تعلق ان کے نزدیک کیا ہے؟"

________ ۱۵، دسمبر ۱۹۳۳ء

۲۵۔ "دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے..... نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے۔ ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں ممد ہو سکتا ہے۔ اس مبحث پر اپنے خیالات سے مستفیض فرمایئے۔"

________ ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء

۲۶۔ کیا یہ صحیح ہے کہ متعہ (نکاح موقت) حضرت عمرؓ سے پہلے مسلمانوں میں رائج تھا اور حضرت عمرؓ نے اسے منسوخ کر دیا نیز زمانۂ حال کا کوئی امیر بھی کسی امر کی نسبت ایسا فیصلہ کرنے کا مجاز ہے۔

________ ۲۴ جنوری ۱۹۳۴ء

۲۷۔ "ان معاملات کی ایک فہرست چاہتا ہوں جن کے متعلق رائے قائم کرنا امام کے سپرد ہے جرائم میں ایسے جرم ہیں جن کی تعزیر غالباً قرآن شریف میں مقرر ہے ان کے متعلق امام کیونکر رائے دے سکتا ہے؟"

۲۸۔ آپ فرماتے ہیں کہ تواتر عمل کی ایک مثال نماز ہے۔ مالکیوں اور حنفیوں اور شیعوں میں جو اختلاف

صورت نماز میں ہے وہ کیونکر ہوا۔"

۲۹۔ "احکام منصوصہ میں توسیعِ اختیاراتِ امام کے کیا اصول ہیں؟ اگر امام توسیع کر سکتا ہے تو کیا ان کے عمل کو محدود بھی کر سکتا ہے۔"

۳۰۔ "زمین کا مالک[1] قرآن کے نزدیک کون ہے؟ اسلامی فقہا کا مذہب اس بارے میں کیا ہے؟ قاضی مبارک میں شاید اس کے متعلق کوئی فتویٰ ہے۔ وہ فتویٰ کیا ہے؟"

۳۱۔ "صدقات کی کتنی قسمیں اسلام میں ہیں؟ صدقہ اور خیرات میں کیا فرق ہے؟"

یکم فروری ۱۹۳۴ء

۳۲۔ "قرآن شریف میں جن انبیاء کا ذکر ہے ان میں سے نبی بالہمزہ ہیں اور کون سے بغیر ہمزہ؟"

۳۳۔ "لفظ نار کا روٹ عربی زبان میں کیا ہے؟"

۳۴۔ "لفظ نجات کا روٹ کیا ہے؟ اور روٹ کی رُو سے اس کے معنی کیا ہیں؟"

۶ ستمبر ۱۹۳۴ء

۳۵۔ "کیا فقہِ اسلامی کی رُو سے توہینِ رسولؐ قابلِ تعزیر جرم ہے اگر ہے اس کی تعزیر کیا ہے؟"

۳۶۔ "اگر کوئی شخص جو اسلام کا مدعی ہے یہ کہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو حضور رسالت مآبؐ پر جزوی فضیلت حاصل ہے اس واسطے کہ مرزا قادیانی ایک زیادہ متمدن زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں تو کیا ایسا شخص توہینِ رسولؐ کے جرم کا مرتکب ہے؟ بالفاظ دیگر اگر توہینِ رسولؐ جرم قابلِ تعزیر ہے تو عقیدہ مذکور توہینِ رسولؐ کی حد میں آتا ہے یا نہیں؟"

---

[1] ۔ اس سلسلے میں اقبال نے ۷ جنوری ۱۹۳۲ء کے خط میں خواجہ عبدالرحیم بار ایٹ لا کے نام لکھا گیا ہے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "اسلام کے نزدیک زمین وغیرہ امانت ہے۔ ملکیت مطلقہ جس کو قدیم و جدید قانون دان تسلیم کرتے ہیں میری ناقص رائے میں اسلام میں نہیں ہے۔ فقہا میں بہت سا اختلاف ہے۔" انوار اقبال۔ ص ۲۴۵۔

ــــــ ایک زمانہ میں اس موضوع پر معارف اعظم گڑھ میں بحث بھی چلی تھی اس بحث کے دوران ــــــ مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا ظفر احمد تھانوی کے متعدد مقالات شائع ہوئے۔ ــــــ مولانا مناظر ملکیتِ مطلقہ کے منکر تھے۔ مولانا ظفر احمد تھانوی کو اس رائے سے اختلاف تھا۔

۳۷۔ "اگر توہینِ رسولؐ کی مثالیں کتبِ فقہ میں مذکور ہوں تو مہربانی فرما کر ان میں سے چند تحریر فرمائیے۔"

______ ۱۹ر جولائی ۱۹۳۵ء

۳۸۔ "تکملہ مجمع البحار صفحہ ۸۵ میں حضرت عائشہؓ کا ایک قول نقل کیا گیا ہے یعنی یہ کہ حضور رسالتمآبؐ کو خاتم النبیینؐ کہو لیکن یہ نہ کہو کہ ان کے بعد کوئی اور نبی نہیں ہوگا۔ اس قول کے اسناد کی حقیقت کیا ہے؟"

۳۹۔ "حجج الکرامہ صفحہ ۴۲۷ - ۴۳۱ میں حضرت مسیحؑ کے دوبارہ آنے کے متعلق ارشاد ہے "من قال بسبب بنوتہ کفر حقا" اس قول کی آپ کے نزدیک کیا حقیقت کیا ہے؟"

۴۰۔ "لو عاش ابراہیم لکان نبیاً" اس حدیث کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

۴۱۔ "بخاری کی حدیث واما مکم منکم میں واو حالیہ ہے کیا؟"

۴۲۔ "ختم نبوتؐ کے متعلق اور بھی اگر کوئی بات آپ کے ذہن میں ہو تو اس سے آگاہ فرمائیے۔"

______ یکم اگست ۱۹۳۵ء

۴۳۔ "کیا علمائے اسلام میں کوئی ایسے بزرگ بھی گزرے ہیں جو حیات و نزولِ مسیح ابن مریم کے منکر ہوں؟ اگر حیات کے قایل ہوں تو نزول کے منکر ہوں؟ معتزلہ کا عام طور پر اس مسئلہ میں کیا مذہب ہے؟"

______ ۲۳ر اگست ۱۹۳۵ء

۴۴۔ "لفظ بروز کے متعلق اگر کوئی نکتہ آپ کے ذہن میں ہو یا کہیں صوفیہ کی کتابوں میں اس پر بحث ہو تو اس کا پتہ دیجیے۔"

______ ۷ر اگست ۱۹۳۵ء

ان استفسارات کے جوابات مولانا برابر دیتے رہے۔ افسوس ہے کہ مولانا کے جوابات محفوظ نہیں ہیں۔ محفوظ ہوتے تو یقیناً بہت سے مفید مذہبی، فقہی، تاریخی اور علمی معلومات حاصل ہو جاتے۔ اقبالؔ کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے جوابات سے انہیں مکمل طور پر تشفی ہو جاتی تھی۔ اس سلسلے میں ان کے متفرق خطوط سے مندرجہ ذیل اقتباسات اس تشفی اور اطمینان کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں:

"آپ کا نوازش نامہ قوتِ روح اور اطمینانِ قلب کا باعث ہے۔" (۱۳ر نومبر ۱۹۱۷ء)

"نوازش نامہ ابھی ملا ہے جس کے لیے بہت شکر گزار ہوں، جتنی آگاہی آپ نے دے دی ہے وہ اگر زمانہ فرصت دے تو باقی عمر کے لیے کافی ہے۔" ——— (۲۲، اگست ۱۹۲۲ء)

"آپ اپنے نوازش نامہ کی طوالت کے عذر خواہی کرتے ہیں مگر میرے لئے یہ طویل خط باعث خیر و برکت ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، میں نے اسے کئی دفعہ پڑھا ہے اور گزشتہ رات چودھری غلام رسول مہر سے بھی پڑھوا کر سنا اور احباب بھی اس مجلس میں شریک تھے۔ اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ میں اسلام کی کچھ خدمت کر سکتا" ——— (۲۷، اپریل ۱۹۲۶ء)

علاوہ اس کے کہ ان خطوط کے اقتباسات سے اقبال کے اطمینان کا اظہار ہوتا ہے ان میں ان کا عجز و انکسار، ان کی شرافت اخلاق اور شرافت طبع بھی نمایاں ہے جو اقبال کی طبیعت کا سب سے بڑا جوہر تھا۔ اگرچہ سید صاحب کے خطوط بنام اقبال دستیاب نہیں ہو سکے ہیں، جن سے یہ معلوم ہو جاتا کہ سید صاحب کے دل میں اقبال کے لیے کس طرح کے جذبات تھے تاہم نجی محفلوں میں اقبال سے متعلق تاثرات اور معارف کے شذرات اس بات کے گواہ ہیں کہ انہیں بھی اقبال سے زبردست عقیدت و محبت تھی۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن معارف کے سلیمان نمبر میں اپنے مضمون میں اقبال سے ان کی عقیدت و محبت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

"اپنے معاصرین اہل علم میں ڈاکٹر اقبال سے بڑا گہرا لگاؤ رکھتے، نجی مجلسوں میں کہا کرتے کہ عالم اسلام میں ایک عرصے کے بعد ڈاکٹر اقبال جیسا مفکر اعظم پیدا ہوا ہے ان کو موحد خالص رسول کا شیدائی، دین کامل کا علمبردار، فلسفہ اسلام کا ترجمان اور تجدید ملت کا طلب گار کہا کرتے تھے۔" [1]

اقبال کے انتقال پر سید سلیمان ندوی نے معارف کے شذرے میں بڑا دردناک ماتم کیا، چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔

"صفر کی انیسویں [19] اور اپریل کی اکیسویں [21] کی صبح کو عمر کی اسٹھ [61] بہاریں دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں چالیس [40] برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی قوت اور اسلام کا فخر تھا۔ آج دنیا ان ساری

[1] معارف، سلیمان نمبر، مئی ۱۹۵۵ء، ص ۶۴ - ۶۵۔

عزتوں سے محروم ہوگئی اور ایسا عارف فلسفی عاشق رسولؐ، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خوان صدیوں کے بعد پیدا ہوا، جس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگِ درا، اس کی جانِ حزیں کی ہر آواز زبورِ عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیامِ مشرق، اس کے شعر کا ہر پرپرواز بالِ جبریل تھا۔ اس کی فانی عمر تو ختم ہوگئی لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر ان شاء اللہ باقی رہے گا، اُمید ہے کہ ملت کا یہ غم خوار شاعر عرشِ الٰہی کے سائے میں ہوگا اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہوں گے۔ خداوندا! اس کے دلِ شکستہ کو جو ملت کے غم سے رنجور تھا، غم خواری فرما اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلبِ حزیں کو مسرور کر۔[۱]

اقبال کی وفات کے سانحہ سے وہ اس قدر متاثر تھے کہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی روایت کے مطابق کئی روز تک نہایت رنج و غم میں اُٹھ اُٹھ کر ٹہلتے تھے، ان کو یاد کرتے اور ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں جیسے ان کے کسی عزیز خاص کی المناک موت ہو گئی ہو، بھرّائی ہوئی آواز سے ان کی زندگی کے مختلف واقعات سناتے اور اپنے رفقائے کار سے کئی روز تک ان ہی کا ذکر سننا پسند فرماتے۔[۲]

اقبال کو بھی سید صاحب سے محبت و عقیدت تھی۔ وہ سید صاحب کو ملت اسلامیہ کی ترویج و بقا کے لیے بہت بڑا ستون گردانتے تھے، چنانچہ ۱۹۳۵ء میں ان کی بیماری اور علالت کی وجہ سے خود بھی خاصے متردد رہے۔ نہ صرف سید صاحب بلکہ سید صاحب کے رفقا کو بھی ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے خطوط لکھے، ۲۸ نومبر ۱۹۳۵ء کو مولوی مسعود عالم ندوی کو لکھا:۔

"مولانا سید سلیمان ندوی کی علالت کی خبریں بہت متردد کر رہی ہیں، خدا تعالیٰ ان کو صحت عاجل مرحمت فرمائے۔ میری طرف سے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر استفسارِ حالات کیجیے۔ اس وقت علمائے ہند میں وہ نہایت قابلِ احترام ہستی ہیں۔ خدا تعالیٰ

---

[۱] معارف سلیمان نمبر مئی ۱۹۵۵ء ص ۶۵۔ [۲] اقبال اور سید سلیمان ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن (مضمون مشمولہ اقبال کے ممدوح علما مرتبہ فضل حق قریشی) ص ۹۲

ان کو دیر تک زندہ رکھے۔"[1]

جب سید صاحب صحت یاب ہو گئے تو مولوی مسعود عالم ندوی کے نام ایک اور خط میں اپنی مسرت کا اظہار کیا۔

"اخباروں میں مولانا سید سلیمان ندوی کی صحت کی خبریں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی خدا تعالیٰ اُن کو دیر تک سلامت رکھے ان کا وجود اس ملک میں غنیمت ہے۔"[2]

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں افغانستان کی حکومت کی طرف سے اقبال، سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کو وہاں کے تعلیمی نظام سے متعلق صلاح و مشورہ کے لیے کابل آنے کی دعوت دی گئی۔ سید سلیمان ندوی کو سب سے پہلے اس کی اطلاع خود اقبال نے ہی دی۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۳۳ء کو اقبال سید صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"شاہ افغانستان آپ سے تعلیم مذہبی کے بارے میں مشورہ چاہتے ہیں۔ شاید اسی ماہ ستمبر میں آپ کو کابل سے دعوت آئے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ جانے کے لیے تیار ہوں گے، ممکن ہے کہ سید راس مسعود اور اقبال بھی آپ کے ہمراہ ہوں۔"[3]

وثوق سے تو نہیں کہا جا سکتا لیکن خط کے تیور بتاتے ہیں کہ غالباً سید سلیمان ندوی کے نام دعوت نامہ بھجوانے میں اقبال کی تحریک ہی رہی ہے۔ اس سفر کے سلسلے میں اقبال نے سید سلیمان ندوی سے پروگرام طے کیا اور مختلف خطوں میں اس کی تفصیلات آ گئی ہیں۔ جن خطوط میں یہ تفصیلات طے ہوئی ہیں، اُن کی تعداد آٹھ ہے اور ۱۰ ستمبر ۱۹۳۳ء سے ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۳ء کے عرصے میں لکھے گئے ہیں۔

سید سلیمان ندوی کے نام خطوط میں کچھ خط ایسے بھی ہیں جن کی ادبی اہمیت ہے، جن میں اقبال نے رموزِ بےخودی پر سید صاحب کے کچھ اعتراضات کا جواب دیا ہے ان کی تفصیل تیسرے باب میں آ چکی ہے۔ لہٰذا یہاں اس کا اعادہ کرنا مناسب نہیں ہوگا۔

سید سلیمان ندوی معارف کے ایڈیٹر تھے اور اقبال اس رسالے کے بڑے مدّاح تھے چنانچہ اقبال کبھی کبھی اپنے اشعار بغرضِ اشاعت سید صاحب کو بھیجتے تھے خود سید صاحب بھی اشعار کے لئے تقاضا کرتے

---

[1]، [2]، [3]۔ اقبال نامہ، جلد اوّل، ص ۱۰۱ھ ، ۲۰۲ھ - ۲۰۳ھ ، ۱۶۷ +

تھے۔ رسالہ 'صوفی' میں اقبال کی کوئی نظم شایع ہوئی، تو سید صاحب نے اقبال سے شکایت کی کہ 'معارف' پر 'صوفی' کو ترجیح کیوں دی گئی۔ اقبال نے اس کی تردید کی اور لکھا:۔

"رسالہ 'صوفی' میں میں نے کوئی نظم شایع نہیں کی۔ کوئی پرانی مطبوعہ نظم انہوں نے شایع کردی ہوگی ورنہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں 'صوفی' کو 'معارف' پر ترجیح دوں 'معارف' ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارتِ ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔ میں انشاء اللہ ضرور آپ کے لیے کچھ لکھوں گا۔" [1]

اور یہ وعدہ اقبال نے جلد ہی پورا کیا اور ۲۳ مئی ۱۹۱۸ء کے خط میں سات اشعار کی ایک نظم بلا عنوان اشاعت کے لیے بھیجدی۔ یہ نظم بعد میں 'اور تو' کے عنوان کے تحت بانگ درا میں شامل ہوئی۔ بانگِ درا میں اس نظم کے اشعار کی تعداد نو [9] ہے جو دو [2] اشعار بانگِ درا میں زیادہ ہیں وہ یہ ہیں:۔

دم زندگی رم زندگی، غم زندگی سم زندگی
غم رم نہ کر سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسد اللہی وہی مرحبی وہی عنتری [2]

اس کے علاوہ بانگِ درا والی نظم میں ایک مصرعہ میں ایک لفظ کو بدل دیا ہے۔

تیری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر

خط میں خاک کی جگہ راکھ کا لفظ ہے جو ظاہر ہے بعد میں اقبال نے بدل دیا ہے۔ اسی طرح ۲۷ ستمبر ۱۹۱۹ء کے خط میں وہ اشعار اشاعت کے لیے بھیجدیے تھے جو بعد میں بانگِ درا میں 'دریوزۂ خلافت' کے عنوان سے شایع ہو گئے۔ خط میں اس نظم کا پہلا شعر یوں ہے:۔

بہت آزمایا ہے غیروں کو تو نے
مگر آج ہے وقت خویش آزمائی

بعد میں یہ شعر اقبال نے بالکل بدل دیا۔ بانگ درا میں یہ نظم اس شعر سے شروع ہوتی ہے:۔

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکام حق سے نہ کر بے وفائی [3]

---

[1] اقبال نامہ، حصہ اول ص ۸۰ ؛ [2]، [3] کلیاتِ اقبال (صدی ایڈیشن) ص ۲۵۲، ۲۵۴ ؛

اقبال کے خطوط سید سلیمان ندوی کے نام پہلی بار شیخ عطاء اللہ نے اقبال نامہ میں شائع کئے۔ یہ خطوط بعد میں طاہر تونسوی نے اقبال اور سید سلیمان ندوی کے نام سے ایک الگ مجموعے کی صورت دوبارہ شائع کیے۔ محمد عبداللہ قریشی نے اقبال کے تمام مطبوعہ خطوط کی تلخیص "روح مکاتیب اقبال" کے نام سے ۱۹۷۷ء میں شائع کی۔ طاہر تونسوی اور محمد عبداللہ قریشی نے سید سلیمان ندوی کے نام خطوط اقبال نامے ہی سے لئے۔ نتیجتاً اگر اقبال نامے میں کہیں کوئی غلطی در آئی ہے وہ ان کے یہاں بھی موجود ہے چنانچہ جو خط اقبال نامہ[1]، اقبال اور سید سلیمان ندوی[2] اور روح مکاتیب اقبال[3] میں ۲۲ اگست ۱۹۲۲ء کی تاریخ کا درج ہوا ہے۔ وہ ۱۹۲۲ء کا نہیں ہو سکتا۔ اس خط میں دو باتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ خط ۱۹۳۳ء کا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس خط میں اقبال سید صاحب کو اپنے لیکچروں کی آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے طباعت کی اطلاع دیتے ہیں:۔

"میرے لیکچر آکسفورڈ یونیورسٹی چھاپ رہی ہے۔ اردو ترجمہ نیازی صاحب نے ختم کر لیا ہے اس کی طباعت بھی عنقریب شروع ہو گی۔"

دوسری بات محی الدین ابن عربی کے بحث زمان کی تلخیص کے بارے میں ہے اس سلسلے میں اقبال لکھتے ہیں:۔ "حضرت ابن عربی کے بحث زمان کا ملخص اگر عطا ہو جائے تو بہت عنایت ہو گی۔ آپ کے ملخص کی روشنی میں کتاب میں خود پڑھوں گا۔"

اقبال کے لیکچرز جو انہوں نے مدراس وغیرہ میں ۱۹۲۸ء میں دیئے تھے پہلی مرتبہ ۱۹۳۰ء میں چھپے اور آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے ۱۹۳۳ء میں دوبارہ شائع ہوئے۔ لہذا ۱۹۲۲ء کے خط میں ان لیکچروں کا ذکر ناممکن ہے۔ جہاں تک ابن عربی کی بحث کی تلخیص کا تعلق ہے۔ ۱۸ نومبر ۱۹۳۳ء کے خط میں اقبال دوبارہ اس کی یاددہانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"یہ عریضہ حضرت محی الدین ابن عربی کے مسئلہ زمان و مکان کی تلخیص کی یاددہانی کے لیے لکھتا ہوں۔ مجھے چند روز تک اس کی ضرورت پڑے گی۔"

---

[1] اقبال نامہ، حصہ اول، ص ۱۲۲ [2] اقبال اور سید سلیمان ندوی، ص ۲۶۷ [3] روح مکاتیب اقبال، ص ۲۹۸

پھر ۱۵؍ دسمبر ۱۹۳۳ء کے خط میں تخمیس ملنے پر شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ استدعا، یاددہانی اور شکریے کے خطوط میں دس سال کا وقفہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ چند مہینوں کا ہو سکتا ہے۔ ان شواہد کی بنا پر یہ خط ۲۲۔ اگست ۱۹۳۳ء کا ہے۔ تعجب ہے کہ طاہر تونسوی صاحب کا ذہن اس طرف نہیں گیا حالانکہ انہوں نے خطوط کی سنہ وار ترتیب ٹھیک کرنے کا دعویٰ بھی کیا ہے۔[۱] اسی طرح اقبال نامہ میں سید صاحب کے نام ایک خط ۸ دسمبر ۱۹۱۸ء کی تاریخ کا درج ہوا ہے یہی تاریخ طاہر تونسوی اور محمد عبداللہ قریشی نے بھی دی ہے۔ یہ خط لاہور سے بھیجا گیا ہے جیسا کہ اوپر درج ہے۔ اس خط میں دساتیر کے حوالوں کا ذکر ہے جو سید صاحب نے اقبال سے مانگے تھے۔ ان حوالوں کے سلسلے میں اقبال لکھتے ہیں:۔

"دساتیر کے حوالوں کے متعلق آپ نے لکھا تھا، اس وقت اورنیٹل کالج لاہور کا کتب خانہ بند تھا اور اب بھی بند ہے۔ اکتوبر میں کھلے گا۔ اگر کچھ حوالے دستیاب ہو گئے، تو عرض کروں گا۔"

کتب خانہ "اکتوبر میں کھلے گا" اس کا مطلب یہ ہوا کہ خط اکتوبر سے پہلے کا ہے۔ ستمبر قرین قیاس ہے کہ خط نقل کرتے وقت عطاء اللہ صاحب سے غالباً فروگذاشت ہوئی ہے اور ستمبر کو دسمبر لکھ دیا۔ اس طرح کی فروگذاشت کچھ ایسی غیر معمولی بھی نہیں ہے۔ اس لحاظ سے ۸ ستمبر ۱۹۱۸ء ہونا چاہیئے۔ لیکن اس میں ایک اور مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ ۸ ستمبر ۱۹۱۸ء کو اقبال لاہور میں نہیں تھے بلکہ سیالکوٹ میں تھے، ۲۶ جولائی ۱۹۱۸ء کو خان محمد نیاز الدین خاں کو لکھتے ہیں:۔

"میں چند روز تک سیالکوٹ جانے والا ہوں، وہاں کچھ عرصہ قیام کروں گا۔ ستمبر کے آخر میں شاید یہاں آنا ہو گا۔"[۲]

سیالکوٹ سے اقبال ۹ ستمبر کو واپس لاہور آ گئے تھے اس کی اطلاع اکبر الہ آبادی کو ۱۷ ستمبر ۱۹۱۸ء کے خط میں دیتے ہیں:۔ "میں ۹ ستمبر کو لاہور واپس آ گیا تھا۔"[۳]

---

[۱] - اقبال اور سید سلیمان ندوی ۔ طاہر تونسوی ۔ ص ۳۵ ۔

[۲] - مکاتیب اقبال ۔ ص ۱۳ ۔ [۳] - اقبال نامہ ۔ حصہ دوئم ۔ ص ۶۸ ۔

ان شواہد کی بنا پر قرینِ صحت یہی ہے کہ یہ خط ۱۸ ستمبر ۱۹۱۸ء کا ہے۔ اب چونکہ اصل خط یا اس کی فوٹو کاپی میرے پیشِ نظر نہیں ہے لہٰذا یہ کہنا مشکل ہے کہ تاریخ لکھنے میں غلطی اقبال سے سرزد ہوئی ہے یا ناقل سے۔ بہرحال یہ خط نہ ۸ دسمبر کا ہو سکتا ہے اور نہ ۸ ستمبر کا۔ ۱۸ ستمبر قرینِ صحت ہے۔

مولانا شیخ غلام قادر گرامی کے نام اقبال کے نوے خط شائع ہوئے ہیں۔ انہیں محمد عبداللہ قریشی نے مکاتیبِ اقبال بنام گرامی کے نام سے ایک مجموعے کی صورت میں ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔ ان میں سے متعدد خطوط اقبال نامہ اور نقوش میں شائع ہو چکے تھے۔ یہ خطوط شاعرِ اقبال کو سمجھنے کے لیے بے حد اہم اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہیں۔ یہ مکاتیب مولانا گرامی اور اقبال کے تعلقات، ان دونوں کی زندگی، ذاتی اوصاف اور عقلی و ذہنی صلاحیتوں کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں جو ان خطوط کی اشاعت سے پہلے پوری طرح آشکارا نہ تھے۔

شیخ غلام قادر گرامی کی تاریخِ ولادت میں اختلاف ہے۔ بعض تذکرہ نگار ۱۸۵۶ء[۱] سالِ ولادت بتاتے ہیں، اس حساب سے وفات کے وقت (۱۹۲۷ء) ان کی عمر اکہتر برس تھی۔ لیکن گرامی جون ۱۹۲۲ء کے ایک خط میں کسی غزل کی داد دیتے ہوئے اقبال کو لکھتے ہیں:۔

"نظیری نے آپ کو اپنا جانشین انتخاب کیا ہے۔ گرامی ہفتاد سالہ ہو گیا ہے۔ یہ دولت نہ ملی"[۲]

اس اعتبار سے وفات کے وقت ان کی عمر پچہتر برس ہوتی ہے لیکن وفات سے پہلے وہ اپنی عمر اس سے بھی اوپر بتاتے تھے، لگتا ہے وہ اپنی عمر کچھ زیادہ ہی بتاتے تھے۔ تذکرۂ سخنورانِ چشم دیدہ جو ۱۹۱۴ء میں لکھا گیا ہے ترکی نے گرامی کے ذکر میں لکھا ہے۔ "عمرِ شریفش از پنجاہ سال تجاوز کردہ۔"[۳]

اب یہاں یہ مشکل ہے کہ 'از پنجاہ تجاوز کردہ' سے کیا مراد لی جائے، کم از کم ۵۱۔ اور زیادہ سے زیادہ

۱۔ شعرائے پنجاب، ص ۲۹، ماہنامہ مخزن لاہور (گرامی نمبر) اگست ۱۹۲۷ء ص ۶۰
۲۔ مکتوب گرامی بنام اقبال (بحوالہ مقدمہ مکاتیب اقبال بنام گرامی۔ محمد عبداللہ قریشی، ص ۱۴)۔
۳۔ تذکرہ سخنورانِ چشم دیدہ۔ ترک علی شاہ ترکی۔ ص ۱۰۰۔

۵۹ برس ہو سکتے ہیں۔ ۵۱ کے حساب سے گرامی کا سالِ پیدائش ۱۸۶۳ء اور ۵۹ کے اعتبار سے ۱۸۵۵ء بنتا ہے۔ اوّل الذکر اس اعتبار سے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا کہ زیادہ تر لکھنے والوں کی رائے میں گرامی ۱۸۵۶ء[1] میں پیدا ہوئے البتہ مؤخر الذکر زیادہ قرینِ صحت ہے۔ بہر حال یہ بات تو طے کہ گرامی کی ولادت غدر سے پہلے ہوئی ہے۔

تزکِ محبوبیہ[2] میں ان کا نام عبدالقادر اور وطن بگرام لکھا گیا ہے مگر یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں۔ خود گرامی اپنے نام اور تخلص کے بارے میں ایک منقبت میں کہتے ہیں:۔

غلامِ قادرم فرخندہ نامم　　گرامی غوث الاعظم را غلامم

گرامی کے والد کا نام شیخ سکندر بخش تھا جو نیل کی رنگائی کا کام کرتے تھے۔ گرامی کی تعلیم اس وقت کے رواج کے مطابق محلے کی مسجد سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد خلیفہ ابراہیم کے مکتب میں داخل کیا گیا۔ جہاں انہوں نے فارسی کی متداول درسی کتابیں پڑھیں۔ خلیفہ ابراہیم ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے، انہوں نے گرامی کا ذوق و شوق دیکھ کر یہ اندازہ کر لیا تھا کہ آگے چل کر یہ سات آٹھ سال کا لڑکا جو گفتگو میں موزوں فقرے کہہ جاتا ہے، ایک نامی گرامی شاعر بن جائے گا چنانچہ وہ انہیں ملک الشعراء کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ گرامی خود کہتے ہیں:۔

" خلیفہ ابراہیم از اولیاء اللہ و اہلِ راز بودہ و گرامی را کہ ہشت سال بیشتر عمر نداشت بہ لقبِ ملک الشعراء خطاب کردہ مثل این کہ در ہماں ابتداء کار انتہائے مقامِ گرامی را مشاہدہ می کرد۔"[3]

تعلیم کے سلسلے میں گرامی لاہور آئے اور چودہ (۱۴) برس کی عمر میں اورینٹل کالج لاہور میں داخل ہو کر فارسی

۱؎ (ا) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بھی گرامی کا سالِ پیدائش ۱۸۵۶ء بتاتے ہیں۔ ملفوظاتِ اقبال (تعلیقات)
(ب) حفیظ جالندھری اپنے ایک مضمون "استاد گرامی مرحوم" (مشمولہ ماہِ نو کراچی، اگست ۱۹۵۶ء) میں لکھتے ہیں۔
" غدر سے چار سال پیشتر جالندھر میں پیدا ہوئے۔"

۲؎ تزکِ محبوبیہ از غلام صمدانی گوہر، جلد دوئم، ص ۱۴۷۔

۳؎ ماہنامہ ہلال کراچی۔ دسمبر ۱۹۵۸ء مضمون ڈاکٹر محمد جہانگیر خان ص ۲۹ (بحوالہ مکاتیبِ اقبال بنام گرامی)۔

کے امتحانات منشی عالم اور منشی فاضل پاس کئے اور پھر وکالت کا امتحان دیا اور اس میں بھی کامیاب ہو گئے۔

شاعری کا ذوق بچپن ہی سے تھا۔ ادبیاتِ فارسی کے مطالعہ نے اسے اور زیادہ راسخ کر دیا۔

گرامی کی تربیت کے ضمن میں ترک علی شاہ قلندر کا نام لیا جاتا ہے۔ ان کا اصلی نام غلام محمد تھا اور ابتدا میں غلامی تخلص کرتے تھے۔ غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کے مرید ہو گئے تو ترک علی شاہ نام رکھ لیا اور ترکی تخلص کرنے لگے۔ تقریباً ۳ برس حیدر آباد میں گزار کر ۱۹۱۹ء[1] میں وہیں انتقال کیا۔ حیدر آباد میں بڑی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ مہاراجہ کرشن پرشاد سے بھی گہرے مراسم تھے۔ ان کا کلام نظم و نثر بیشتر ان کی زندگی میں ہی شائع ہو گیا تھا۔

تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد گرامی نے معلمی کا پیشہ اختیار کیا اور امرتسر اور کپور تھلہ میں مدرسی کی۔ کچھ دنوں پولیس کی نوکری بھی کر لی۔ معاش کی تلاش میں کبھی لاہور، کبھی پٹیالہ، کبھی رامپور اور کبھی مالیر کوٹلہ پھرتے پھراتے رہے۔ آخر پٹیالہ کے وزیر اعظم خلیفہ محمد حسین نے آپ کو حیدر آباد جانے کا مشورہ دیا۔ میجر سید حسن بلگرامی جو ان دنوں امرتسر میں تھے اور جو نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی اتالیقِ نظام کے چھوٹے بھائی تھے، گرامی کے حیدر آباد جانے کا وسیلہ بن گئے۔ میجر سید حسن بلگرامی نے سفارش کرنے سے پہلے مولوی محمد حسین آزاد سے گرامی کی استعداد کے بارے میں رائے پوچھی۔ محمد حسین آزاد نے یکم دسمبر ۱۸۸۸ء کو اپنے مکتوب میں میجر سید حسن بلگرامی کو لکھا:-

"گرامی کو میں خوب جانتا ہوں۔ یونیورسٹی پنجاب میں پڑھتا رہا ہے۔ وہاں سے نکل کر بھی کئی سال مجھ سے ملتا رہا۔ بارہ برس کا مسلسل مشاق ہے اور جس رنگ میں وہ کہتا ہے اس میں آج وہ اول درجہ کا شاعر ہے۔ اس کی طبیعت خیال پسند ہے۔ جلال اسیر، قاسم مشہدی، ظہوری وغیرہ ہند میں اسی طرز میں کہتے تھے۔ افسوس کہ سخندانِ فارس مشتہر نہیں ہوا۔ جو میرے اس مختصر فقرے کا مفصل مزا آجاتا۔"[2]

---

[1] ماہنامہ سب رس حیدر آباد، اپریل ۱۹۶۸ء، مضمون امیر الشعراء ترکی از علی۔

[2] مکتوبات آزاد۔ مطبوعہ گیلانی پریس (لاہور) ۱۹۲۷ء، ص ۳۶۔

بہرحال گرامی حیدر آباد پہنچے اور ان کی وہاں خوب پذیرائی ہوئی۔ چند ہی برسوں میں ملک الشعرا کا خطاب ملا۔ گرامی نے میر محبوب علی خان اور میر عثمان علی خان دونوں کا زمانہ دیکھا اور ہر دور میں محبوب و مقبول رہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے شادی بھی کر لی۔ ان کی بیوی اقبال بیگم بھی شاعرہ تھیں اور ترک تخلص کرتی تھیں۔ گرامی ۱۷۔۱۹۱۶ء میں دکن سے لوٹے اور ہوشیار پور میں مکان بنوا کر وہیں رہنے لگے اور تقریباً دس سال رہ کر ۱۹۲۷ء میں انتقال کر گئے۔

یہ کہنا تو مشکل ہے کہ گرامی اور اقبال میں شناسائی کا آغاز کب سے ہوا، تاہم قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں میں ملے۔ اقبال کے یہاں سب سے پہلے مولانا گرامی کا ذکر مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے نام ایک خط میں یوں آیا ہے:۔

"مولانا گرامی میرے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں، پوچھتے ہیں کس کو خط لکھ رہے ہو۔ میں کہتا ہوں حبیب کو تو آپ فرماتے ہیں میرا بھی سلام لکھ دو، آخر شاعر ہیں نا۔" [۱]

یہ خط ۱۹۰۳ء کا ہے، گو اس پر تاریخ درج نہیں ہے لیکن ۱۹۰۳ء کے بعد اقبال کا کوئی بھی خط مولانا شروانی کے نام دستیاب نہیں ہوا ہے اور پھر یہ کہ مولانا شروانی کے نام جو تین خط ملتے ہیں ان میں سے دو خطوں پر تاریخ درج ہے اور یہ خط ۱۹۰۳ء میں ہی لکھے گئے ہیں۔ لہٰذا یہ تیسرا خط بھی ۱۹۰۳ء کا ہی ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اقبال اور گرامی ۱۹۰۳ء سے پہلے ہی ایک دوسرے سے واقف تھے اور دونوں میں خاصی بے تکلفی تھی۔ مکاتبت کی ابتداء کب ہوئی اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ مطبوعہ خطوط میں تاریخی اعتبار سے جو خط سب سے پہلا ہے وہ ۱۱ مارچ ۱۹۱۰ء کا ہے لیکن اس سے پہلے بھی اقبال اور گرامی میں مکاتبت رہی ہے۔ خود اس خط میں بھی اقبال نے اپنے پچھلے مکتوب کا حوالہ دیا ہے اور پھر خط کا اسلوب بھی اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ خط و کتابت کا سلسلہ ۱۹۱۰ء سے بہت پہلے شروع ہوا ہے۔

"حیدری صاحب کے متعلق استفسار کیا تھا، جواب ندارد۔ آپ کس عالم غفلت میں

---

[۱] بحوالہ مقدمہ مکاتیب اقبال بنام گرامی۔ ص ۴۴

قیام پذیر یا تشریف فرما ہیں۔ جواب لکھئے اور جلد اشعار کے متعلق جو میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دیجئے۔" ۱؎

یہ انداز تحریر اس بات کی چغلی کھا رہا ہے کہ دونوں میں خاصی بے تکلفی ہے۔

گرامی جب مستقلاً ہوشیار پور میں رہنے لگے تو جب بھی لاہور آئے اقبال ہی کے یہاں قیام کرتے۔ اقبال بھی اُن کی خوب ناز برداریاں کرتے اور مختلف حیلوں سے انہیں روکے رکھتے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ گرامی جانے کی تیاری کر رہے ہیں، سواری کا انتظام بھی ہو گیا ہے، اتنے میں اقبال ان سے مخاطب ہو کر کہتے کہ بھئی ایک رُباعی ہو رہی ہے لیکن چوتھا مصرع نہیں ہو رہا۔ تین مصرعے گرامی کو سناتے ہیں۔ اب مولانا گرامی ان مصرعوں کو دُہرا رہے ہیں اور چوتھا مصرع لگانے کی فکر کر رہے ہیں۔ اور اسی میں جانے کا وقت نکل جاتا ہے اور آپ ایک دن اور قیام کرتے۔ اقبال کا خادم علی بخش بھی ہوشیار پور کا رہنے والا تھا۔ اقبال کبھی کبھی اسے بھیج کر گرامی کو لاہور بلا لیتے اور بڑے اصرار کے ساتھ ہفتوں اپنے ہاں مہمان ٹھہراتے اور ان کے قیام کے زمانے میں ہر طرح ان کی آسائش کا خیال رکھتے اور گرامی کی وقت بے وقت فرمائشوں کو پورا کرتے۔

اقبال کو گرامی سے بڑی عقیدت و محبت تھی۔ اپنے خلوص و محبت کا اظہار انہوں نے خان نیاز الدین خان کے نام ایک خط میں اس طرح کیا ہے:۔

"اگر مولانا گرامی دسمبر میں لاہور آ جائیں تو میرے لئے لاہور کی سرد آب و ہوا میں تھوڑی سی حرارت پیدا ہو جائے۔ ان کی خاطر میں شملہ کی صحبت ترک کر دوں گا۔" ۲؎

اسی طرح کے جذبات کا اظہار ایک اور خط میں بھی ہوا ہے:۔

"گرامی صاحب یہاں کئی روز رہے اور خوب شعر خوانی ہوتی رہی۔ مگر وہ کچھ بیمار ہو گئے جس میں ان کے ہم نے اور بھی اضافہ کر دیا۔ جالندھر اور ہوشیار پور کی نسبت تو ان کے قدر دانوں کی تعداد لاہور میں زیادہ ہے پھر معلوم نہیں وہ

۱؎ مکاتیب اقبال ۔ ص ۹۱؛ ۲؎ مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خان ۔ ص ۲۹؛

کیوں جلد اداس ہو جاتے ہیں۔"[۱]

اقبال کی گرامی سے یہ عقیدت و محبت یک طرفہ نہیں تھی۔ گرامی کو بھی اقبال سے غایت عقیدت تھی، چنانچہ ایک خط میں اقبال کو لکھتے ہیں:۔

"الحمدللہ جوہر فرد (اقبال) کو آرام ہو گیا۔ گرامی عید پہ لاہور آئے گا۔ اوروں کے واسطے ایک عید گرامی کے واسطے دو عیدیں ہیں۔ ایک عید شوال ایک عید صحبت جوہر فعال۔"[۲]

خان نیاز الدین خان کے نام گرامی اپنے ایک خط میں اقبال کے تکلفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"لاہور میں بیمار ہو گیا تھا حضرت ڈاکٹر اقبال کے تکلفات کا درجہ افراط کو پہنچ گیا تھا۔ ناتواں سال خوردہ گرامی ان کی مہربانیوں کی تاب نہ لا سکا اور ہوشیار پور آگیا۔"[۳]

انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک جلسے میں جب گرامی کے نظم پڑھنے کی باری آئی تو اقبال نے تعارف کراتے ہوئے کہا:۔

"اگر عرفی و نظیری کے بعد فارسی زبان کا کوئی شاعر ہے تو گرامی ہے آج گرامی کو سن لو۔ کل فخر کروگے کہ تم نے گرامی کو سنا اور دیکھا ہے۔"[۴]

گرامی کی وفات پر پنڈت ہری چند اختر نے جو ان دنوں مخزن کے نائب مدیر تھے اقبال کا انٹرویو لیا اور گرامی کی شاعری اور ان کے شاعرانہ مرتبے کے متعلق سوالات پوچھے جن کے جواب میں اقبال نے گرامی کے اوصاف گنواتے ہوئے ان کی شخصیت، شاعرانہ کمال اور ناقدانہ نظر کی تعریف کی۔ اقبال کے جواب سے جستہ جستہ اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

"آپ زیادہ تر غزل ہی لکھا کرتے تھے لیکن میرا یہ خیال ہے کہ انہیں غزل اور مثنوی دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ رباعی زیادہ تر انہوں نے آخری عمر میں لکھی۔"[۵]

۱۔ مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خان ص ۳۰۔ ۲، ۳۔ مکاتیب گرامی ہفت روزہ لاہور ۹ مارچ ۱۹۶۴ء ص ۶۰۔

۴۔ ملاحظہ مکاتیب اقبال، ص ۲۲۵۔ ۵۔ بحوالہ مقدمہ مکاتیب اقبال، ص ۳۷۔

"میرے نزدیک اصناف سخن میں ان کو غزل کے ساتھ خاص شغف تھا۔ فارسی لٹریچر میں جو "تازہ گوئی" کا شوق اکبر کے عہد سے شروع ہوا تھا۔ مولانا گرامی کو اس دور کا آخری شاعر سمجھنا چاہیئے۔ ان کا کلام بحیثیت مجموعی بالخصوص غزل میں نظیری کے کلام سے ایک خاص مناسبت رکھتا ہے۔ شعر سے ان کی طبیعت کو فطری مناسبت تھی۔ اس فطری مناسبت کے ساتھ زندگی کے عام حالات نے ان کو "فنانی الشعر" کر دیا تھا۔ گفتگو اور عام روش میں نہایت ہی سیدھے سادے آدمی تھے لیکن حقیقت میں نہایت ذہین آدمی تھے اور شعر کے علاوہ زندگی کے دیگر امور میں عام طور پر دلچسپی نہیں لیتے تھے۔"

"وہ کلاسیکی فارسی ہی میں لکھتے تھے۔ فارسی زبان کے ساتھ ان کو طبعی مناسبت تھی اور تراکیب وضع کرنے میں تو ان کا انداز مجتہدانہ تھا۔"

"ان کے جذبات گہرے اور افکار بلند ہوتے تھے۔"

"حافظہ نہایت قوی تھا۔ فارسی کے ہزاروں اشعار ان کو ازبر تھے۔ اپنا کلام بھی سارے کا سارا یاد تھا۔ میرا عقیدہ ہے کہ وہ ہر پہلو سے اپنے زمانے کے ایک بے نظیر آدمی تھے۔ سادگی، بے پروائی اور بلند پروازی کے ایسے مجموعے کی مثال اس زمانے میں مشکل سے ملے گی۔"

"گرامی کو خان خاناں کے زمانے میں پیدا ہونا چاہیئے تھا۔ قدرت کی ستم ظریفی نے انہیں اس زمانے میں پیدا کر دیا، مگر یہ بات باعث اطمینان ہے کہ میر محبوب علی خان عرش آشیانی نے ایک ایسے زمانے میں ان کی قدر افزائی کی جب کہ فارسی شعر کا چراغ ہندوستان میں گل ہو چکا تھا۔ پنجاب کی ادبی روایات جن کا سلسلہ مسعود سعد سلمان سے شروع ہوتا ہے اصل میں فارسی ہی سے وابستہ تھیں۔ مولانا گرامی ان روایات کے بہترین حامل تھے۔" [۱]

---

[۱] "مخزن" لاہور، جون ۱۹۲۷ء، ص ۲۹-۳۰۔

اقبال نے گرامی کی وفات پر مندرجہ ذیل اشعار میں اپنے درد و غم کا اظہار کیا۔

آہ مولانا گرامی از جہان بر است رخت
آنکہ ز فکر بلندش آسمان را پشت پائی
معنیٔ مستور او در لفظ رنگینش نگر
مثل حوری بے حجاب اندر بہشت دلکشائی
از نوای جان فزای او عجم را زندگی
جام جمشید از شراب ناب او گیتی نمائی
یاد ایامے کہ با او گفتگوہا داشتیم
اے خوشا حرفے کہ گوید آشنا با آشنائی
بر مزارش پست تر کن پردہ ہائی ساز را
تا نہ گردد خواب او آشفتہ از شور نوائی [۱]

مولانا گرامی کے شاگردوں میں حفیظ جالندھری اور مولوی عزیز الدین عظامی مشہور ہیں۔ عظامی فارسی کے شاعر تھے۔ کچھ لوگوں نے عبدالمجید سالک اور اقبال کو بھی گرامی کا شاگرد بنایا ہے۔[۲] لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ سالک تو رسا رامپوری سے تلمذ رکھتے تھے جبکہ اقبال نے خود اس بات کی تردید کی ہے کہ انہیں گرامی سے نسبتِ تلمذ حاصل تھا۔ ۱۹۲۵ء میں رسالہ 'شمع' آگرہ میں گرامی کی ایک غزل شائع ہوئی۔ اور تعارفی نوٹ میں رسالے کے ایڈیٹر حسن عابد جعفری نے یہ لکھا کہ اقبال کو گرامی سے نسبتِ تلمذ حاصل ہے۔ اقبال نے ایڈیٹر کے نام ایک خط میں لکھا کہ وہ گرامی کے شاگرد نہیں ہیں۔ اصل میں گرامی اور اقبال میں اُستادی شاگردی کے تعلقات نہیں تھے بلکہ یہ تعلقات محض دوستانہ تھے۔ ان تعلقات کی یادگار وہ خطوط ہیں جو اقبال نے وقتاً فوقتاً گرامی کو اور گرامی نے اقبال کو لکھے۔ جیسا کہ اس سے قبل بھی ذکر آگیا ہے اقبال کے خطوط جواب تک دستیاب ہو گئے ہیں۔ ان میں گرامی کے نام نوّے (۹۰) خط ہیں۔ بقولِ محمد عبداللہ قریشی اکثر خطوط ضائع ہو گئے ہیں۔[۳] پہلا خط ۱۱ مارچ ۱۹۱۰ء کا اور آخری خط ۳ جنوری ۱۹۲۷ء کا ہے۔ اس طرح سے خط و کتابت کا کل زمانہ سولہ

---

[۱] بحوالہ مکاتیب اقبال، ص ۹۴ [۲] شعرائے پنجاب، نسیم رضوانی، ص ۳۱ [۳] مقدمہ مکاتیب اقبال بنام گرامی

سترہ سال بنتا ہے۔ سب سے زیادہ خط ۱۹۱۷ء کے ہیں اس سال اقبال رموزِ بے خودی لکھ رہے تھے اور اکثر گرامی سے مشورہ کرتے تھے چنانچہ رموز کے پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں جو بعد کے ایڈیشنوں سے حذف کر دیا گیا، مولانا گرامی کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔

"استاذی علامہ میر حسن صاحب اور مولانا شیخ غلام قادر گرامی شاعرِ خاص حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہٗ اجلالہٗ میرے شکریے کے خاص طور پر مستحق ہیں کہ ان دونوں سے بعض اشعار اور طرزِ بیان کے متعلق قابلِ قدر مشورہ ملا۔" [1]

اسی طرح پیامِ مشرق کی تصنیف کے دوران یعنی ۱۹۲۲ء میں پھر خطوں کی تعداد زیادہ ہے اور اسی سال اقبال گرامی کو مختلف ترغیبات دے کر بلاتے ہیں اور یہاں تک لکھتے ہیں کہ یہ صحبتیں کسی زمانے میں تاریخ کے ورق بن جائیں گی۔ ۱۹۱۱ء، ۱۹۱۳ء اور ۱۹۲۵ء میں کسی خط کا نہ ملنا اور بعض برسوں یعنی ۱۹۱۰ء، ۱۹۱۲ء، ۱۹۱۴ء، ۱۹۱۶ء، ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۶ء میں صرف ایک دو خطوں کا دستیاب ہونا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ خط ضرور لکھے گئے ہوں گے اور خاصی تعداد میں لکھے گئے ہوں گے لیکن کسی وجہ سے یہ سارے خط محفوظ نہیں رہ سکے ہیں۔ بہر حال اس مجموعے میں ہر طرح کے خط ہیں نجی بھی ہیں اور ادبی بھی۔ کبھی اقبال اپنا کلام گرامی کو بھیجتے ہیں اور کبھی گرامی کا تازہ کلام دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی اپنے اشعار کے متعلق ان کی رائے دریافت کرتے ہیں تاکہ اس رائے کے پیشِ نظر اپنے اشعار پر نظرِ ثانی کر سکیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"حلیمہ کی روایت آپ نے خوب لکھی اور شعر نے تو مجھ پر ایسا اثر کیا کہ قریباً بے ہوش ہو گیا۔ کئی دن سے طبیعت پر قبض تھی، اس شعر نے ایسی کشائش کی کہ دل کا بخار سیال بن کر آنکھوں کی راہ سے نکل گیا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔ آپ اس کشائش کے محرک ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے اور کلام کی تاثیر میں اضافہ کرے۔ کل رات ایک اُستاد کا شعر سرخوش کے تذکرہ میں نظر آیا:

لہ۔ دیباچہ رموزِ بے خودی۔ پہلا ایڈیشن۔

کشیدہ ام ز جنوں ساغرے کہ ہوش نماند　　　دگر معاملہ با پیرِ مے فروش نماند

گذشتہ رات سینکڑوں دفعہ یہ شعر پڑھا، اس اُمید میں کہ اس کی تاثیر سے دل کی قبض رفع ہو مگر کشایش نہ ہوئی، مگر،

بلکہ عالم یادہ گردد اندرو

نے تیر بہ ہدف کا کام کیا۔" [۱]

گرامی کے نام خطوط سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال نے گرامی کی تنقیدوں سے فائدہ اٹھایا لیکن بہت ساری ترمیموں سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں کا رویہ مختلف تھا۔ گرامی کلاسیکی شاعری میں سند کی حیثیت رکھتے تھے، محاورے اور زبان پر انہیں زبردست قدرت حاصل تھی اور کلام میں زیادہ تر زبان کی صفائی، محاورے کی چستی اور الفاظ کی بندش کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔ اس کے برعکس اقبال کا انداز مختلف اور پیام کی سطح بلند تھی۔ یہ بات نہیں کہ وہ زبان کی طرف سے بالکل بے اعتنائی برتتے تھے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس معاملے میں وہ خاصا اہتمام کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی سید سلیمان ندوی اور کبھی گرامی کی طرف رجوع کرتے اور تنقید کی دعوت دیتے تھے تاکہ زبان و بیان اور اسلوب میں کوئی سقم یا خامی رہ گئی ہو تو اسے دور کیا جائے۔ ایک خط میں گرامی کو لکھتے ہیں:۔

"غزل تنقید کے لیے ہی تو آپ کی خدمت میں ارسال کی تھی۔ اس پر خوب تنقید کیجیے اور مفصل تحریر فرمائیے، پھر میں انشاءاللہ نظرِ ثانی کروں گا۔" [۲]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

"غزل کے تمام اشعار پر اعتراض لکھیے تاکہ میں پورے طور پر مستفید ہو سکوں۔ آپ نے صرف ایک شعر کی تعریف کر دی اور باقی اشعار چھوڑ گئے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان پر اعتراض کیجیے۔ آپ کے کسی شعر میں اگر کوئی بات مجھے کھٹکے تو میں بلاتکلف عرض کر دیا کرتا ہوں۔ آپ کیوں ایسا نہیں کرتے؟ مجھے تعریف سے اس قدر خوشی نہیں

---

[۱] مکتوباتِ اقبال بنام گرامی؛ [۲] مکاتیب اقبال بنام گرامی۔ ص ۱۳۸؛

ہوتی جس قدر اعتراض سے کیونکہ اعتراض کی تنقید سے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔" [۱]

اگرچہ سید سلیمان ندوی، مولوی میر حسن، مولانا حبیب الرحمن خان شروانی اور مولوی اسلم جیراجپوری کی رایوں کو بھی اقبال بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے تاہم گرامی کی رائے سب پر مقدم تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنی فارسی نظموں اور غزلوں کے بارے میں پابندی کے ساتھ گرامی سے مشورے کئے اور گرامی کے اکثر مشوروں کو مان لیا ہے۔ خطوط کے مطالعہ سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ اقبال نے گرامی کے مشورے سے اپنے کئی اشعار میں ترمیم کی اور بعض اشعار کو قلم زد کر دیا۔ 'اسرارِ خودی' میں یونانی حکیم افلاطون کے فلسفۂ اشراق پر بحث کی گئی ہے۔ اس کی ابتداء اس شعر سے ہوتی تھی۔

راہب اوّل فلاطون حکیم از گروہ گوسفندان قدیم

یہ شعر پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں یونہی چھپتا رہا لیکن کسی نے اس پر گرفت نہ کی۔ ۱۹۲۱ء میں گرامی نے اقبال کی توجہ اس شعر کی طرف مبذول کرائی۔

"مثنوی اسرارِ خودی میں فلاطونِ حکیم کی اضافت غلط ہے یوں کیجیے:۔

راہب دیرینہ افلاطون حکیم" [۲]

چنانچہ بعد کے ایڈیشنوں میں اقبال نے گرامی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے مصرعہ یونہی کر دیا۔

یہاں اس بات کا اعادہ کرنا مناسب نہیں ہوگا کہ بعض اوقات اقبال گرامی کے مشوروں سے اختلاف بھی کرتے تھے اور خطوط میں اس اختلاف کے اظہار کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ پیام مشرق میں ایک نظم 'جہانِ عمل' کے عنوان سے ہے۔ ۲۰ نومبر ۱۹۱۸ء کو اس غزل کے چند اشعار اقبال نے گرامی کو بھیجے۔ ان میں ایک شعر یوں تھا:۔

حرف رازے کہ بروں از حد صوت است ہنوز از لب جام چکیدست و کلام است این جا

اس شعر کا پہلا مصرعہ اقبال کو کھٹکتا تھا۔ گرامی نے اسے یوں تبدیل کرنے کا مشورہ دیا:۔

حرف آں راز کہ بیگانہ زصوت است ہنوز

۱؎ مکاتیب اقبال بنام گرامی، ص ۱۶۲۔ ۲؎ مکتوب اقبال بنام گرامی ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۳ء۔ ۳؎ مکاتیب اقبال بنام گرامی ص ۴۷۔

اور لکھا کہ "راز کو حرف اور صوت کا لباس پہناؤ تو وہ کلام ہو جاتا ہے اور کلام کی تعریف بھی یہ ہے کہ وہ حرف اور صوت سے مرکب ہو۔" مگر اقبال اس سے مطمئن نہ ہوئے۔ انہوں نے جواب میں لکھا:

"بیگانۂ صوت است ہنوز خوب ہے، مگر افسوس ہے کہ بے گانۂ صوت راز کی صفت میں واقع ہوا ہے۔ حرف کی صفت میں واقع ہونا چاہیے تھا۔ مجھے اپنا مصرع ابھی تک کھٹکتا ہے۔ طبیعت حاضر ہو تو پھر غور کروں گا۔" [1]

اس طرح کی کئی مثالیں مکاتیب میں مل جاتی ہیں۔ یہاں صرف ایک اور مثال پر اکتفا کی جاتی ہے۔ پیام مشرق میں اقبال نے "بوئے گل" پر چند اشعار لکھے تھے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ جنت کی ایک حور دنیا کا نظارہ کرنے کے لیے پھول کی صورت میں نمودار ہوئی اور آخر پژمردہ ہو گئی۔ جس کو لوگ خوشبو کہتے ہیں وہ دراصل اسی حور کی آہ ہے جس کو اس نے دنیا میں اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ ان میں سے آخری شعر اس طرح تھا۔

زندانی کہ بند زپایش کشادہ اند — آہے گزاشت است بونام دادہ اند

مولوی اسلم جیراجپوری نے اعتراض کیا کہ "گزاشت است" ذوق سلیم کو کھٹکتا ہے۔ اقبال کو بھی ان کے ایراد میں کچھ نہ کچھ صداقت معلوم ہوئی۔ انہوں نے گرامی کو لکھا:

اس شعر پر تنقیدی نظر ڈالیے اور نتیجہ سے آگاہ کیجیے۔ اس شعر کا مطلع ہونا ضروری ہے کہ بند کا آخری شعر ہے۔ یوں بھی ہو سکتا ہے:

زاں نازنیں کہ بند زپایش کشادہ اند — آہے ست یادگار کہ بونام دادہ اند" [2]

گرامی نے کوئی ترمیم تجویز کی جس پر اقبال نے انہیں پھر لکھا:

"آپ کی ترمیم سے زبان کے اعتبار سے شعر بہت ستھرا ہو گیا ہے مگر افسوس ہے کہ اس

---

[1] مکتوبات اقبال بنام گرامی، ۲ دسمبر ۱۹۱۸ء؛ [2] مکتوبات اقبال بنام گرامی، ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۳ء،
(اس ضمن میں اقبال کا مکتوب بنام عبدالماجد دریابادی، ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۳ء بھی ملاحظہ ہو جو اقبال نامہ، حصہ اول ص ۲۳۶ پر درج ہے)۔

سے وہ مطلب ظاہر نہیں ہوتا جو میں ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ نازنین خود تو رخصت ہو گئی ہے مگر دنیا میں اپنی آہ چھوڑ گئی ہے جسکو لوگ خوشبو کہتے ہیں۔ آپ کے شعر سے مترشح ہوتا ہے۔ 'وقت مندکشادن آہے سرداد' لہٰذا معانی کے اعتبار سے میں اپنے ہی مطلع کو ترجیح دیتا ہوں جس کو آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے لیکن 'سردادن آہ' کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"[1]

اقبال کی مشہور نظم 'خضر راہ' کے بارے میں جب خان نیاز الدین خان نے اقبال کو لکھا کہ نظم خضر راہ مولانا گرامی کو پسند نہیں اور ان کی رائے میں اس کے تمام اشعار بے لطف ہیں اور بعض غلط۔ اقبال ظاہر ہے کہ بہت حیران ہوئے کہ اس قسم کا اعتراض گرامی سے منسوب ہو۔ انہوں نے اس نظم کی بعض باتوں کی توضیح کرتے ہوئے گرامی کو لکھا:۔

"آپ کے اعتراض کا پہلا حصہ صحیح ہے مگر یہ اعتراض گرامی کے شایانِ شان نہیں۔ اگر کوئی اور آدمی یہ اعتراض کرتا تو مضایقہ نہ تھا۔ یہ اعتراض شبلی کے لیے منصور کا پھول ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نیاز الدین خان صاحب نے آپکا اعتراض سمجھنے میں مزید غلطی کی ہے۔"[2]

بعد میں یہ بات معلوم ہو گئی کہ یہ اعتراض گرامی کا نہیں تھا، سننے والے نے ہی غلط سمجھا تھا۔ غرض اس قسم کی بہت ساری مثالیں ان خطوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہیں جو اقبال نے گرامی کو لکھے اور پھر یہ بات بھی یہاں قابل ذکر ہے کہ یہ سارا معاملہ یکطرفہ نہیں تھا۔ بلکہ گرامی بھی اقبال کی تنقیدوں سے مستفید ہوتے تھے اس کی شہادت بھی ان ہی خطوط سے ملتی ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ مولانا گرامی نے ایک غزل اقبال کو بھیجدی کہ وہ اسے رسالہ 'ھمایوں' میں شائع کرانے کے لیے بھیجدیں۔ اقبال نے بعض باتوں کی طرف توجہ دلاکر غزل گرامی کو واپس بھیجدی کہ:۔

"مہربانی کرکے بعد از نظر ثانی جلد بھیجدیجیے۔ منیر کی غزل اس زمین میں مشہور ہے

---

[1] مکتوب اقبال بنام گرامی ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۳ء؛ [2] مکتوب اقبال بنام گرامی ۱۶ مئی ۱۹۲۲ء

جیسے قوال عام طور پر گاتے ہیں۔ میں نے نہ چاہا کہ شائع ہونے کے بعد کوئی اس پر اعتراض کرے۔ اس واسطے بعض باتوں کی طرف آپ کی توجہ دلائی۔ اگر آپ کو مجھ سے اتفاق نہ ہو تو اسی طرح رہنے دیجئے کیونکہ آپ کا مذاق ہی زیادہ معتبر ہے۔" [1]

مولانا گرامی نے جواب میں لکھا کہ غزل واپس بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی خود ہی اصلاح کی ہوتی۔ اسی طرح جب گرامی نے خواجہ حافظ کی غزل پر ایک غزل لکھی اور اس کے کچھ اشعار خان نیاز الدین خان کی وساطت سے اقبال تک پہنچے تو اقبال نے اس شعر:-

عصیانِ ما و رحمتِ پروردگارِ ما　　　این را نہایتے است نہ آن را نہایتے

کی بہت تعریف کی۔

"سبحان اللہ! گرامی کے اس شعر پر ایک لاکھ دفعہ اللہ اکبر پڑھنا چاہیئے۔ خواجہ حافظ تو ایک طرف مجھے یقین ہے کہ فارسی لٹریچر میں اس پائے کا شعر کم نکلے گا۔ انسان کی بے نہایتی کا ثبوت دیا ہے مگر اس انداز سے کہ موجد کی روح فدا ہو جائے۔" [2]

آگے چل کر اسی خط میں اس شعر:-

عنوانِ آں نگاہ کہ خوں ریز عالمی　　　تمہید نیم خند تو مرگِ دلاتی

کی نسبت اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ:-

"- اگر یہ شعر مطلع ہوتا تو خواجہ کی پوری غزل کا جواب ہوتا اور اگر

تمہید نیم خند تو مرگ دلاتی

خواجہ کو سوجھتا تو وہ اس پر فخر کرتے۔ البتہ پہلے مصرعہ میں جو لفظ "آں" آیا ہے اس کو کسی نہ کسی طرح نکالنا چاہیئے۔ (عنوان آن نگاہ) اس مشورے کو مولانا کی خدمت میں پیش کیجئے۔" [3]

یہ مشورہ نیاز الدین خان کی وساطت سے جب مولانا گرامی کو ملا۔ تو انہوں نے نیاز الدین خان کو لکھا:

"جنابِ اکبر صاحب کی بالغ نظری عالی دماغی کی دلیل ہے کہ انہوں نے گرامی کے شعر کو

---

[1] مکتوبات اقبال بنام گرامی ۲۵ دسمبر ۱۹۲۱ء [2]، [3]۔ مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خان، ص ۲۲، ۲۳۔

پسند کیے۔ وہ فلاسفر ہیں، حکیم ہیں، گرامی ایک دقیانوسی جہل کا مریض ہے۔ آپ گرامی کی طرف سے ان کی خدمت میں شکریہ ادا کیجیے۔

عنوان یک نگاہ تو آشوب عالمی تمہید نیم خند تو مرگ ولایتی

ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں میری طرف سے لکھ دیجیے کہ اس شعر کو مطلع بنا دیں گے تو وہ مطلع آفتاب ہوگا۔" [1]

اسی ضمن میں خان نیاز الدین خان کے نام گرامی کے خط کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ ہو:۔

"حضرت ڈاکٹر صاحب کا لاجواب شعر ہے اور سنگلاخ زمین میں ہے۔ گرامی کا فکر سال خوردہ اس زمین میں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب مجدد ہیں فلاسفر ہیں ادب آموز ہند ہیں۔ گرامی ان کا سا دماغ کہاں سے لائے دو تین شعر لکھتا ہوں ڈاکٹر صاحب کی خدمت عالی میں بھیج دیجیے، ان کی داد لیجیے۔ دوسروں کی داد عین بے دادی۔" [2]

جیسا کہ مکاتیب سے ظاہر ہے، اقبال اور مولانا گرامی دونوں ایک دوسرے کا ادب و احترام کرتے تھے۔ اس کے باوجود اقبال کے کئی خط گرامی کے نام ایسے بھی ہیں جن میں اقبال ان سے چھیڑ چھاڑ اور نوک جھونک بھی روا رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں خطوط سے چند اقتباس ملاحظہ ہوں:۔

"آپ کا تخلص گرامی کی جگہ نومی ہونا چاہیئے کیونکہ آپ سوتے بہت ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ راون لنکا کے بادشاہ کی طرح آپ چھ ماہ سوتے ہیں اور چھ ماہ جاگتے ہیں ___ حیدر آباد کی شاہی میں تبدیلی ہوئی، وزارت بدل گئی مگر ابھی آپ اونگھ رہے ہیں۔ برائے خدا کبھی اپنی خیریت سے مطلع کیا کرو۔ آپ کے بہت سے لاہوری دوست استفسار حال کرتے ہیں تو مجھے یہی جواب دینا پڑتا ہے کہ مولانا گرامی آرام میں ہیں۔ اکثر تو یہ کہتے ہیں کہ ان کو خط لکھ کے جگائیے گا مگر اس کے لیے شور محشر کی ضرورت

---

[1]، [2] مکاتیب گرامی، ہفت روزہ لاہور ۹ مارچ ۱۹۶۴ء (بحوالہ مقدمہ مکاتیب اقبال بنام گرامی ص ۳۰) ص ۷، ۹

ہے، خطوں سے کیا ہوتا ہے۔ ہمنام اقبال سلام قبول کریں۔ نیز ان سے درخواست ہے کہ مولوی گرامی یعنی شیخ نامی سے جس طرح بن پڑے خط لکھوائیں۔"

(۳ ستمبر ۱۹۱۲ء)۔

"آپ کہاں ہیں؟ حیدر آباد میں یا عدم آباد میں؟ اگر عدم آباد میں ہیں تو مجھے مطلع کیجیے کہ میں آپ کو تعزیت نامہ لکھوں۔ صدیاں گزر گئیں کہیں آپ کا کلام دیکھنے میں نہیں آیا۔ کبھی کبھی چند اشعار بھیج دیا کرو تو کون سی بڑی بات ہے۔ اُمید ہے، بابا گرامی اچھا ہوگا اور نئے نکاح کی فکر میں اپنے آپ کو نہ گھلاتا ہوگا۔"

(۱۳ جنوری ۱۹۱۴ء)۔

"حیدر آباد سے جو مفصل خط آپ کو آیا ہے اس کے مضمون سے مجھے بھی آگاہ کیجیے۔ آپ لکھتے ہیں، لاہور میں آن کر عرض کروں گا۔ مگر اس پیش گوئی کے لیے کہ گرامی لاہور کبھی نہ آئے گا، کسی پیغمبر کی ضرورت نہیں۔ جالندھر اور ہوشیار پور کا ہر شیر خوار بچہ بلا تامل ایسی پیش گوئی کر سکتا ہے۔"

(۳ ستمبر ۱۹۱۷ء)۔

"گرامی سال خوردہ ہے یعنی سالوں اور برسوں کو کھا جاتا ہے۔ پھر بوڑھا کیونکر ہو سکتا ہے؟ بوڑھا تو وہ ہے جس کو سال اور برس کھا جائیں۔"

(۴ نومبر ۱۹۱۸ء)۔

گرامی کے نام اقبال کے خطوط اس وجہ سے بھی اہم ہیں کہ ان میں اقبال کی طبیعت کی شگفتگی اور مزاج کی شادابی جو عام طور پر ان کے خطوط میں مفقود ہے تقریباً ہر جگہ موجود ہے۔ اقبال کے خطوط کے اسلوب کا مطالعہ ایک علاحدہ باب میں کیا جائے گا، لہٰذا یہاں صرف چند اشاروں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱؎ گرامی کی اہلیہ اقبال بیگم۔ ۲؎ مولانا گرامی کو اپنی بیوی بیگم سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ چنانچہ ایک زمانے میں وہ دوسری شادی کی سوچ رہے تھے۔ اقبال نے ہی انہیں اس مخمصے سے نجات دلائی۔

ان خطوط سے اقبال کی بالغ نظری اور اُن کے عزائم کا پتہ بھی چلتا ہے۔ ان کے یہ عزائم اسلام کے بارے میں ہیں۔ اقبال نے اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی کے نام سے دو مثنویاں لکھیں جن کا مرکزی نقطۂ نظر حیات ملی کا استحکام تھا۔ اقبال نے قرآن کریم کے گہرے مطالعہ کے بعد جو روشنی حاصل کی تھی اس کی بنا پر وہ قوم کو ایک نیا پیغام دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ مولانا گرامی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"مثنوی کا دوسرا حصّہ قریب الاختتام ہے مگر اب تیسرا حصّہ ذہن میں آرہا ہے اور مضامین دریا کی طرح اُمڈے آرہے ہیں اور حیران ہو رہا ہوں کہ کس کس کو نوٹ کروں۔ اس حصّے کا مضمون ہوگا "حیات مستقبلۂ اسلامیہ" یعنی قرآن شریف سے مسلمانوں کی آئندہ تاریخ پر کیا روشنی پڑتی ہے اور جماعت اسلامیہ جس کی تاسیس دعوت ابراہیمی سے شروع ہوئی، کیا کیا واقعات و حوادث آئندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے اور بالآخران سب واقعات کا مقصود و غایت کیا ہے۔ یہ مضمون بڑا نازک ہے اور اس کا لکھنا آسان نہیں بہر حال میں نے یہ قصد کر لیا ہے کہ اس کو ایک دفعہ لکھ ڈالوں گا اور اس کی اشاعت میری زندگی کے بعد ہو جائے گی یا جب اس کا وقت آئے گا، اشاعت ہو جائے گی۔" [1]

لیکن اقبال کا ارادہ کسی وجہ سے پورا نہ ہوا اور مثنویات کا یہ حصّہ نہیں لکھا جا سکا۔

خان نیاز الدین خاں بستی دانشمنداں (جالندھر) کے رئیس اور علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے بزرگوں میں سے تھے۔ اور اقبال کے مکتوب الیہم میں اس وجہ سے بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں کہ ان کے نام خطوط کی تعداد سید نذیر نیازی اور مولانا گرامی کے بعد سب سے زیادہ ہے۔ ۹۰ خطوط کا یہ مجموعہ بزم اقبال لاہور نے جسٹس ایس۔ اے رحمان کی تصدیق اور ان ہی کے پیش لفظ کے ساتھ ۱۹۵۴ء میں شائع کیا۔ اس سے قبل اس مجموعے کے صرف دو[2] خط اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ میں شائع ہوئے تھے۔

---

[1] مکتوب اقبال بنام گرامی، یکم جولائی ۱۹۱۷ء۔ [2] اس مجموعے پر تاریخ اشاعت درج نہیں ہے۔ البتہ جسٹس ایس۔ اے رحمان کی تصدیق کی تاریخ ۸ جولائی ۱۹۵۴ء ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجموعہ ۱۹۵۴ء میں ہی شائع ہوا ہوگا۔

اقبال اور خان محمد نیاز الدین خان کے مابین مکاتبت کا سلسلہ اسرارِ خودی کی اشاعت کے بعد ۱۹۱۶ء سے شروع ہوتا ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ سلسلہ اس سے پہلے بھی رہا ہو تاہم دستیاب خطوط میں سب سے پہلا خط ۱۹ جنوری ۱۹۱۶ء کا ہے اور آخری خط ۱۵ جون ۱۹۲۸ء کا ہے۔ سب سے زیادہ خط (یعنی ۱۷) ۱۹۱۹ء میں لکھے گئے ہیں جبکہ ۱۹۲۶ء کا کوئی بھی خط نہیں ملتا۔ ۱۹۲۷ء میں صرف ایک خط اور ۱۹۲۸ء میں دو خط لکھے گئے ہیں۔ میرا یہ اندازہ ہے کہ بہت سے خط ضائع ہو گئے ہیں۔ سبھی خطوط لاہور سے لکھے گئے ہیں سوائے ایک خط کے جو لدھیانہ سے لکھا گیا ہے۔ یہ خط ۲۲ اپریل ۱۹۲۴ء کو لکھا گیا ہے۔ لاہور میں طاعون کی بیماری پھیل گئی تھی۔ اس وجہ سے اقبال کچھ دنوں کے لیے لدھیانہ چلے گئے تھے جہاں ان کی سسرال تھی۔

اس سے پہلے کہ ان خطوط کا تفصیلی جائزہ لیا جائے یہاں اس امر کا اعتراف کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ باوصف اس بات کے کہ خان محمد نیاز الدین خان اقبال کے اہم مکتوب الیہم میں سے ہیں مجھے ان کے حالات کہیں سے بھی دستیاب نہ ہو سکے۔ اس ضمن میں میں نے ہندوستان کے کئی ماہرین اقبالیات سے رجوع کیا اور بیسوں کتابوں کی ورق گردانی کی لیکن سوائے اس کے کہ موصوف جالندھر کے رہنے والے تھے رئیس تھے اور علم دوست تھے اور یہ کہ کبوتر پالنے کا شوق رکھتے تھے جو ان میں اور اقبال میں قدرِ مشترک تھی کچھ اور معلوم نہ ہو سکا۔ نہ تاریخ پیدائش معلوم ہے اور نہ تاریخ وفات، اور نہ یہ معلوم ہے کہ ان کا مشغلہ کیا تھا۔ اقبال کے خطوط سے بھی ان باتوں پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ اگر خان صاحب کے خطوط بھی محفوظ ہوتے جو انہوں نے اقبال کو لکھے تھے تو کچھ باتوں کی غالباً وضاحت ہو جاتی۔ خطوط اقبال بنام نیاز الدین خان کے مطالعے کے بعد البتہ کچھ اندازے لگائے جا سکتے ہیں جن کی صحت کے متعلق وثوق اور تیقن سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اقبال کے انداز مخاطبت سے اندازہ ہوتا ہے کہ خان صاحب اقبال سے عمر میں کچھ برس بڑے رہے ہوں گے کیونکہ بیشتر خطوط میں مخدومی یا مخدومی صاحب جناب خان صاحب کے الفاظ سے تخاطب کیا گیا ہے گو چند خط ایسے بھی ہیں جہاں ڈیئر خان صاحب کا استعمال ہوا ہے۔ جون ۱۹۲۸ء کے بعد کا کوئی خط ان کے نام تاحال نہیں ملا ہے۔ لہٰذا اندازہ یہی ہے کہ موصوف کا انتقال ۱۹۲۸ء کے آس پاس ہی ہوا ہوگا کیونکہ انقطاعِ مکاتبت کی کوئی اور وجہ بھی معلوم نہیں ہو سکی ہے۔

جہاں تک ان کے شغل کا تعلق ہے، اس بارے میں بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اقبال کے خطوط سے البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ نیاز الدین خان ۱۹۲۲ء میں مالیر کوٹلہ میں ججی کے لیے کوشاں تھے۔ بہرحال اتنی بات تو یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ مالیر کوٹلہ میں ججی کے عہدے کے لیے اقبال سے سفارش کے طلب گار رہے۔ اقبال کے خط ۱۹ دسمبر ۱۹۲۲ء سے یہ اقتباس اس معاملے پر خاصا واضح ہے۔

"مالیر کوٹلے کی ججی کے متعلق یہ عرض ہے کہ آپ ایک باقاعدہ عرضی لکھیں۔ نواب مالیر کوٹلہ سے مجھے بھی واقفیت ہے۔ میں اس پر سفارش لکھوں گا اور نواب صاحب سے بھی لکھوا دوں گا۔ اس کے علاوہ میر عبداللہ شاہ صاحب نواب کے پرائیویٹ سکریٹری بھی میرے دوست اور ہم جماعت ہیں۔ ان کی خدمت میں بھی خط لکھوں گا۔ عرضی لکھ کر آپ لاہور لے آئیں۔ ذوالفقار علی خان صاحب سے نواب مالیر کوٹلہ کے مراسم بہت اعلیٰ درجہ کے نہیں ہیں، تاہم مجھے یقین ہے کہ آپ کی عرضی پر سفارش لکھنے سے دریغ نہ کریں گے اور اگر سفارش کے علاوہ پرائیویٹ خط بھی انہوں نے لکھ دیا تو ازیں چہ بہتر۔" [1]

لگتا ہے کہ یہ سلسلہ کچھ جما نہیں کیونکہ اس کے بعد اس کا کسی بھی خط میں تذکرہ نہیں ہے۔ البتہ نیاز الدین خان جنوری ۱۹۲۴ء سے پہلے کنج پورہ میں ملازم وغیرہ ہو گئے تھے اس کی شہادت ۲۰ جنوری ۱۹۲۴ء کے خط میں ملتی ہے:۔

"اُمید ہے کہ آپ کنج پورہ میں کوئی مفید کام کر سکیں گے۔ نواب کنج پورہ نہایت نیک نفس آدمی ہیں۔ ان سے آپ کا نباہ بھی خوب ہو گا۔" [2]

۲۲ اپریل ۱۹۲۴ء کے خط میں لکھتے ہیں:۔

"اُمید ہے کہ آپ کو اپنے نئے ماحول میں کبھی کبھی پرائیویٹ مشاغل کے لیے فراغت مل جاتی ہو گی۔" [3]

اسی طرح ۱۳ جولائی ۱۹۲۴ء کے خط میں نواب صاحب کے لیے سلام لکھا ہے۔ اس کے بعد ۲۹ نومبر ۱۹۲۴ء

---

[1]، [2]، [3]۔ مکاتیب اقبال، ص ۴۳، ۴۹، ۵۰۔

کے خط میں اقبال نے نواب صاحب کی طرف سے میموریل لکھنے اور گورنر کے سامنے اسے پیش کرنے کی رضامندی ظاہر کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواب کنج پورہ انگریزی حکومت سے کسی طرح کے حقوق کے طلب گار تھا۔ اور اس سلسلے میں وہ گورنر کے سامنے ایک میموریل پیش کرنا چاہتے تھے۔ نیاز الدین خان چاہتے تھے کہ میموریل اقبال لکھیں اور پیش کریں۔ اقبال نے اسی پیش کش کے جواب میں ۲۹ نومبر ۱۹۲۴ء کا خط لکھا۔ میموریل سے متعلق مختلف امور کا ذکر ۲۳ دسمبر ۱۹۲۴ء اور ۲۰ جنوری ۱۹۲۵ء کے مکاتیب میں بھی ملتا ہے۔ میموریل کا تذکرہ تو یہاں محض اس لئے آیا کہ اس سے نیاز الدین خان اور نواب کنج پورہ کے تعلقات پر بالواسطہ روشنی پڑتی ہے۔ لگتا ہے خان صاحب نے نواب کنج پورہ کے یہاں اس قدر عمل دخل حاصل کیا تھا کہ وہ اب نواب کے معتمدین میں سے تھے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں ہے کہ خان صاحب کسی اچھے عہدے پر وہاں تعینات تھے۔

خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ خان محمد نیاز الدین خان شعر و شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے۔ شروع شروع میں غالباً اقبال کو یہ بات معلوم نہ تھی لیکن بعد میں خان صاحب نے اپنے کچھ اشعار خطوط کے ساتھ بغرض اصلاح بھیجنے شروع کئے، اقبال نے اپنے خطوط میں ان کے کئی اشعار کی خوبی کو سراہا ہے اور ساتھ ہی جہاں بھی کوئی بات کھٹکتی ہے اس کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔ ایک خط میں اقبال نے ایک شعر[1] لکھا اور ساتھ ہی اس بات کی تاکید کر دی کہ یہ شعر مولانا گرامی کی خدمت میں بھی پیش کیا جائے۔ مولانا گرامی خان صاحب کے ہم وطن تھے اور اقبال کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ خان صاحب اور مولانا گرامی کے مابین اچھے دوستانہ تعلقات تھے کیونکہ اکثر خطوط میں اقبال نے مولانا گرامی کے نام سلام لکھا ہے اور بعض اوقات خان صاحب سے ہی ان کی خیر و خیریت معلوم کی ہے۔ چنانچہ اس خط کے جواب میں غالباً اسی زمین اور بحر میں خان صاحب نے کچھ اشعار لکھے۔ اقبال نے لکھا:-

"آپ کے دوسرے مصرعہ میں ایک بہت بڑے شاعر سے توارد ہو گیا۔ ان کا شعر ہے:-

آن چیز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است   بر دار توان گفت و بہ منبر نتوان گفت"[2]

---

[1]. ضبط از دل من برد و فرو ریخت جانم   آن نکتہ کہ با مومن و کافر نتوان گفت

[2]. مکاتیب اقبال، ص ۱۶۔

ایک اور خط میں خان صاحب کی شعر گوئی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :۔

"آپ کے اشعار سے مجھے تعجب ہوا۔ معلوم نہ تھا کہ آپ چھپے رستم ہیں کیوں نہ ہو آخر مولانا گرامی کے ہم وطن ہیں۔" ؎۱

غرض شعر و سخن کا یہ سلسلہ مراسلت کے ذریعے سے ہی آگے بڑھتا ہے اور اس ضمن میں کئی خطوط میں اقبال نے خان صاحب کے کلام کی تعریف و توصیف کے ساتھ ساتھ ان اسقام کی نشاندہی بھی کی ہے جو ان کے اشعار میں پائے جاتے تھے اور اس سلسلے میں وہ مشورے بھی دیتے رہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"دونوں شعروں کا مضمون لاجواب ہے مگر بندش کھٹکتی ہے۔ پہلے مصرع میں 'ناقہ نشین' کھٹکتا ہے اور 'این جا' حشو معلوم ہوتا ہے۔ اگر پہلا مصرع یوں ہوتا۔ 'قیس می گفت کہ از جام بلوریں رستم' تو غالباً 'این جا' کی حشویت کسی قدر کم ہو جاتی، گو مطلق دور نہ ہوتی۔ دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں 'این جا' حشو معلوم ہوتا ہے بالخصوص جبکہ 'بر در میکدہ' کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ ان پر نظر ثانی فرمائیے۔" ؎۲

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :۔

"مجھے تو یقین ہے اور اس کا اظہار بھی کسی پہلے خط میں کر چکا ہوں کہ مولانا گرامی آپ کو شاعر بنا کے چھوڑیں گے۔ یہ غزل انہیں ضرور دکھائیے۔"

شیخ در عہد جوانی بہ گل و مل می زیست وعظ فرما شدہ آں روز کہ از کار شدہ

خوب شعر ہے۔ تھوڑی مشق کے بعد معمولی نقص جو اب پائے جاتے ہیں دور ہو جائیں گے۔" ؎۳

ایک اور خط میں انہیں مولانا گرامی سے مشورۂ سخن کی ہدایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

تعجب ہے کہ آپ غزل تو مولوی گرامی صاحب کی صحبت میں لکھیں اور اصلاح کے لیے مجھ سے ارشاد ہو۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اصفہان میں رہنا اور سرمہ ہندوستان سے

؎۱، ؎۲، ؎۳۔ مکاتیب اقبال، ص ۱۷، ۱۸، ۱۹

خرید کرنا۔ آپ نیاز ہیں مگر گرامی صاحب کی صحبت ہے تو تمام جہان کے شعرا سے بے نیاز۔"[1]

خان محمد نیاز الدین خان کا کلام مطبوعہ صورت میں کہیں بھی دستیاب نہیں ہے۔ اندازہ یہی ہے کہ مولانا گرامی کی صحبت اور اقبال کے کلام سے متاثر ہو کر وہ کبھی کبھی شعر کہتے تھے۔ باقاعدہ شاعر نہیں تھے۔ کچھ شعر مکاتیب کی وجہ سے یادگار رہ گئے ہیں۔

ان مکاتیب میں اقبال نے کچھ علمی اور سیاسی مسائل کو بھی چھیڑا ہے اور اس سلسلے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کے بارے میں یہ بات معلوم ہے کہ وہ گفتگو اور مراسلت میں مخاطب کی ذہنی استعداد اور دلچسپی کو مد نظر رکھتے تھے اس حقیقت کی روشنی میں مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خان کا سرسری مطالعہ بھی اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ خان صاحب موصوف اچھی خاصی ذہنی استعداد رکھنے کے علاوہ علمی، مذہبی اور اپنے وقت کے سیاسی مسائل سے دلچسپی رکھتے تھے اسی بناء پر ان مکاتیب میں اس قسم کی باتیں آگئی ہیں۔ جس زمانے میں اقبال اپنی دوسری مثنوی "رموز بے خودی" کی تصنیف میں مصروف تھے "اسرار خودی" میں تصوف اور خاص طور پر خواجہ حافظ شیرازی پر زبردست تنقید کے باعث ہندوستان کے مختلف اخبارات اور رسائل میں اقبال پر اعتراضات ہونے لگے، یہاں تک کہ اقبال کے ایک دیرینہ دوست خواجہ حسن نظامی بھی معترضین میں شامل ہو گئے اور اقبال کے خلاف کئی مضامین شائع کئے۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے اقبال نیاز الدین خان کو لکھتے ہیں:۔

"میرا خیال تھا کہ فرصت کا وقت مثنوی کے دوسرے حصے کو دوں گا جو پہلے سے زیادہ ضروری ہے، مگر خواجہ حسن نظامی نے بحث چھیڑ کر توجہ اور طرف منعطف کر دی ہے۔ تصوف کی تاریخ لکھ رہا ہوں۔ دو باب لکھ چکا ہوں یعنی منصور حلاج تک۔ پانچ چار باب اور ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی علامہ ابن جوزی کی کتاب کا وہ حصہ بھی شائع کر دوں گا جو انہوں نے تصوف پر لکھا ہے۔"[2]

فلسفۂ افلاطون جسے PLOTINUS نے مذہب کی صورت میں پیش کیا عیسائیت کی ابتدائی

---

[1]، [2]۔ مکاتیب اقبال، ص ۲۰، ۲۸۔

صدیوں میں نہایت مقبول تھا۔ اور بقولِ اقبال:۔

"مسلمانوں میں یہ مذہب حراں کے عیسائیوں کے تراجم کے ذریعہ سے پھیلا اور رفتہ رفتہ مذہب اسلام کا ایک جزو بن گیا۔ میرے نزدیک یہ تعلیم قطعاً غیر اسلامی ہے اور قرآن کریم کے فلسفے سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ تصوف کی عمارت اسی یونانی بے ہودگی پر تعمیر کی گئی۔"[۱]

اقبال تصوف کے اس حصے کو جس کا تعلق اخلاق و عمل سے ہے قابلِ قدر سمجھتے ہیں لیکن تصوف کا وہ حصہ جو فلسفہ بن گیا ہے اسے تعلیم قرآنی اور اسلام کے منافی گردانتے ہیں۔ نیاز الدین خان کو لکھتے ہیں:

"اسی فلسفے نے متاخرین صوفیہ کی توجہ صورت و اشکال غیبی کے مشاہدہ کی طرف کر دی اور اُن کا نصب العین محض ازدیادِ یقین و استقامت ہے۔"[۲]

اسی خط میں اقبال آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ہر چند متصوفین اسلامیہ کی حکایات و مقولات اور ملفوظات کا مطالعہ مفید ہے تاہم موجودہ زمانے کی ضرورت یہ ہے کہ علمِ دین حاصل کر کے اسلام کے عملی پہلو کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اسی ضمن میں لکھتے ہیں:۔

"حضرات صوفیہ خود کہتے ہیں کہ شریعت ظاہر ہے اور تصوف باطن۔ لیکن اس پُر آشوب زمانے میں وہ ظاہر جس کا باطن تصوف ہے معرضِ خطر میں ہے۔ اگر ظاہر قائم نہ رہا تو اس کا باطن کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔ مسلمانوں کی حالت آج بالکل ویسی ہے جیسے کہ اسلامی فتوحات ہندوستان کے وقت ہندوؤں کی تھی یا ان فتوحات کے اثر سے ہو گئی۔"[۳]

ـــــ یہ اقتباسات ۱۹۱۶ء کے خطوط سے دیئے گئے ہیں۔ اس سال اقبال پر دشمنِ تصوف کا الزام لگا کر اُن کے خلاف مضامین شائع کیے گئے۔ اسی طرح سے اقبال کے ایک دوست سراج الدین پال نے بھی کئی مضامین لکھ کر اقبال کے نقطۂ نظر کی توجیہ پیش کرنے کی کوشش کی۔ اقبال اس زمانے میں اپنے دوستوں کے نام خطوط میں بھی اپنا موقف دہراتے رہے اور ان کی توجہ اپنے مضامین کی طرف مبذول کراتے تھے۔ اس سلسلے میں

---

[۱]، [۲]، [۳]۔ مکاتیب اقبال، ص ۲۰۱، ۲۰۲

ایک خط ۸ جولائی ۱۹۱۶ء کو نیاز الدین خان کو لکھتے ہیں:۔

"معلوم ہوتا ہے کہ میرا مضمون علم ظاہر و علم باطن، جو وکیل[۱] میں شایع ہوا ہے آپ کی نظر سے نہیں گزرا۔ اسے بھی پڑھیے، ایک اور مضمون لکھ رہا ہوں جو بالکل نرالا ہے۔ غالباً آج تک ایسا مضمون نہیں لکھا گیا جن علماء نے تصوف وجودیہ کی مخالفت کی ہے ان کی توجہ کبھی اس طرف نہیں ہوئی، بہر حال آپ دیکھیں گے تو داد دیں گے۔"[۲]

——ان خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خان محمد نیاز الدین خان اپنے طور پر بھی اس موضوع پر کتابیں وغیرہ پڑھتے تھے اور اس میں جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں، کتابوں کی نایابی بڑی پریشانی پیدا کرتی ہے۔ لگتا ہے خان صاحب بھی کتابوں کی نایابی کے شاکی تھے چنانچہ اقبال انہیں لکھتے ہیں:۔

"ہاں کتابیں نہیں ملتیں، بڑی دقت ہے۔ شیخ روزبہان بقلی کی شرح شطحیات ایک عجیب و غریب کتاب ہے۔ اس میں صوفیائے وجودیہ نے جو خلاف شرع باتیں کہی ہیں ان کی شرح ہے۔ اگر یہ رسالہ ہاتھ آجائے تو تصوف کے بہت سے مسائل پر روشنی پڑے گی مگر باوجود تلاش کے دستیاب نہیں ہو سکا۔"[۳]

ایک اور خط میں مذہب کے منصب اور مقصود کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:۔

"مذہب کا مقصود عمل ہے نہ کہ انسان کے عقلی اور دماغی تقاضاؤں کو پورا کرنا، اسی واسطے قرآن شریف کہتا ہے:۔ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔ اگر مذہب کا مقصود عقلی تقاضاؤں کو پورا کرنا ہو بھی (جیسا کہ ہنود کے رشیوں اور فلسفیوں نے خیال کیا ہے) تو زمانۂ حال کی خصوصیات کے اعتبار سے اس کو نظر انداز کرنا چاہیے۔ اس وقت وہی قوم محفوظ رہے گی جو اپنی عملی روایات پر قایم رہ سکے گی۔

اس دور میں سب مٹ جائیں گے ہاں باقی وہ رہ جائے گا
جو اپنی راہ پہ قایم ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے"[۴]

---

[۱] یہ مضمون اخبار وکیل امرتسر ۲۸ جون ۱۹۱۶ء کو شایع ہوا ہے۔ [۲]، [۳]، [۴] مکاتیب اقبال ص ۴۴، ۴۸، ۵۶

'رموزِ بے خودی' کے بارے میں، فروری ۱۹۱۷ء کو لکھتے ہیں:-

"افسوس کہ مثنوی کا دوسرا حصہ ابھی تیار نہیں ہو سکا۔ کل کچھ فرصت مل گئی تھی، فقہ کا وہ مسئلہ نظم کیا جس کی رُو سے مسلمانوں پر اس دشمن پر حملہ کرنا حرام ہے جو صلح کی اُمید میں اپنے حصار وغیرہ گرا دے۔ اس مسئلے کا ذکر کرکے اس کی حقیقت اور فلسفہ لکھا ہے کہ شرع نے کیوں ایسا حکم دیا ہے۔ عجیب عجیب باتیں ذہن میں آتی ہیں، مگر قلب کو یکسوئی میسر نہیں۔" [۱]

۴ نومبر ۱۹۱۷ء کو 'رموزِ بے خودی' کی تکمیل کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں کہ:-

"دوسرا حصہ انشاء اللہ اس سال سے پہلے ختم ہو جائے گا، صرف چند اشعار کی کسر باقی ہے، اگر آج وہ اشعار لکھے جائیں تو ایک ہفتے کے اندر نقل کرکے کتاب مطبع میں دی جا سکتی ہے، مگر میں انتظار میں ہوں کہ وہ اشعار آئیں تو ان کو مثنوی میں داخل کر دوں۔"

اسی خط میں رموز کے بارے میں اپنی رائے بھی قلمبند کی ہے۔ لکھتے ہیں:-

"دوسرے حصے کے مضامین سے پہلے حصہ پر کافی روشنی پڑے گی اور بہت سی تشریحات جو پہلے حصے کے اشعار کی کی جا رہی ہیں خود بخود غلط ہو جائیں گی۔ اسلامی نیشنلزم کی حقیقت اس سے واضح ہو گی اور یہ کہنے میں کوئی مبالغہ یا خودستائی نہیں کہ اس رنگ کی کوئی نظم یا نثر اسلامی لٹریچر میں آج تک نہیں لکھی گئی۔" [۲]

اسلامی نیشنلزم اقبال کا ایک محبوب موضوع ہے اور بالکل آخری وقت تک یعنی بسترِ مرگ پر بھی وہ اس موضوع کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے رہے۔ اقبال کا نظریہ 'قومیت' اس نظریئے کی تشریح اور دیگر تمام تفصیلات اس سے قبل فکرِ اقبال کے باب میں وضاحت سے آچکا ہے۔ یہاں ان باتوں کا اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ اقبال اپنے دوستوں کے ساتھ گفتگو اور خط و کتابت میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے رہتے تھے اور اس طرح سے ان کے نظریات کی نہ صرف توضیح و تعبیر ہوتی

۱؎ مکاتیبِ اقبال، ص ۲۰ ؎ ۲؎ ملاحظہ ہو طالوت کے نام اقبال کے خط (۱۶ فروری ۱۹۳۸ء اور ۱۸ فروری ۱۹۳۸ء) +

ہے بلکہ ان کی فکر کے ارتقائی منازل بھی سامنے آتے ہیں۔

انجمن حمایت اسلام لاہور ایک ایسی انجمن تھی جو اپنی کارکردگی کے باعث شمالی ہندوستان میں خاصی مشہور ہوئی۔ اس کے سالانہ اجلاس بڑے اہتمام سے ہوتے تھے اور اکابر مسلمان ادیب، شاعر اور دانشور اس اجلاس میں شرکت کرتے تھے۔ اقبال ابتدا ہی سے انجمن میں دلچسپی لیتے تھے اور سالانہ اجلاس میں خاص طور پر شریک ہوتے تھے۔ ان کی کئی مشہور نظمیں انہی اجلاسوں میں پڑھی گئی ہیں، جن میں شکوہ، شمع و شاعر، خضر راہ اور طلوع اسلام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اقبال پہلی بار ۱۸۹۹ء (۱۲ نومبر) میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے رکن منتخب ہو گئے اور ۱۹۰۰ء کے آغاز میں انجمن کے پندرہویں سالانہ اجلاس میں اپنی مشہور نظم "نالۂ یتیم" پڑھی۔ اور اس طرح انجمن کے ساتھ اقبال کا تعلق بڑھتا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں انجمن کی مجلس انتظامیہ کے رکن منتخب ہوئے اور ۱۹۱۰ء میں جنرل کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور اسی سال جولائی میں انجمن کی کالج کمیٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۱۹ء کو اقبال انجمن کے سکریٹری جنرل منتخب ہوئے۔ اقبال نے اس کے لیے بطور خاص کوئی کوشش نہیں کی البتہ وہ اس بات پر آمادہ تھے کہ اگر موجودہ سکریٹری مستعفی ہو جائیں تو انجمن کا کام وہ سنبھالنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں خان نیاز الدین خان کے استفسار پر اقبال نے ۹ نومبر ۱۹۱۹ء کو انہیں لکھا:

"سکریٹری شپ انجمن حمایت اسلام کے لیے میں کوئی کوشش نہیں کر رہا ہے، مسلمان پبلک میرے سپرد یہ کام کرنا چاہتی ہے اور میں نے بعض معززین سے وعدہ کیا ہے اگر عبدالعزیز صاحب مستعفی ہو جائیں تو یہ کام اپنے ذمہ لے لوں گا۔ اس سے زیادہ میری اور کوئی کوشش نہیں، اگر عبدالعزیز نے یہ کام چھوڑ دیا تو میں جہاں تک میرے بس میں ہوگا، کام کروں گا۔" [۱]

۱۹۲۲ء تک اقبال انجمن کے جنرل سکریٹری رہے اور اس کے بعد بھی انجمن سے ان کا تعلق برابر رہا۔ ۱۹۲۳ء میں دوبارہ جنرل سکریٹری منتخب ہوئے، ۱۹۲۴ء میں پھر مستعفی ہو کر صدر انجمن منتخب ہوئے لیکن جلد ہی صدارت سے استعفیٰ دیا۔

اسی طرح دسمبر ۱۹۲۶ء میں اقبال پنجاب لیجیسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ اس سے پہلے ۱۹۲۳ء میں

۱۔ مکاتیب اقبال، ص ۲۴ ... ۲

بھی لاہور کے بعض لوگ چاہتے تھے کہ اقبال الیکشن لڑیں لیکن اقبال راضی نہ ہوئے ۲۵ مئی ۱۹۲۳ء کے خط میں نیاز الدین کو لکھتے ہیں :-

"مجھ سے بعض لوگ کہہ رہے ہیں کہ لاہور کی نیابت کونسل میں کرو۔ لیکن اور امیدوار بھی ہیں اور میں یہ بات خلاف انصاف تصور کرتا ہوں کہ ان سے کہوں کہ تم میری خاطر امیدواری سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ وعدۂ امداد کے لیے شکر گزار ہوں مگر غالباً میں کھڑا نہ ہوں گا۔" [1]

اقبال کے انکار کے باوجود مسلمانان لاہور مصر تھے کہ اقبال الیکشن لڑیں اور اس سلسلے میں ان کے کئی وفد اقبال سے ملے اور انہیں آمادہ کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس ضمن میں اقبال ۲۵ جون ۱۹۲۳ء کو خان صاحب کو لکھتے ہیں :-

"آپ نے کسی گذشتہ خط میں مجھ سے کونسل کی امیدواری کے متعلق دریافت کیا تھا سو عرض ہے کہ لاہور کے مسلمانوں نے مجھ سے بہت کہا مگر میں نے انکار کر دیا لیکن اب تک انکار اصرار بدستور جاری ہے۔ قریباً ہر روز ان کا ایک نہ ایک وفد آ جاتا ہے۔" [2]

اصل میں اقبال میاں عبدالعزیز سے جو اس حلقہ انتخاب سے امیدوار تھے۔ مقابلہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اقبال کے ان سے دیرینہ تعلقات تھے۔ چنانچہ ۲۰ جولائی ۱۹۲۳ء کو خان صاحب کے نام خط میں لکھتے ہیں :-

"لاہور کے لوگ مجبور کرتے ہیں اور بہت سے ڈیپوٹیشن ان کے آ چکے ہیں مگر میاں عبدالعزیز سے مقابلہ کرنا میں نہیں چاہتا۔ ان سے دیرینہ تعلقات ہیں، اگرچہ مقابلے کے بعد انتخاب ہو جانا قریباً یقینی ہے تاہم یہ بات میرے نزدیک مروت کے خلاف ہے کہ ایک موہومی دنیوی فائدے کی خاطر دیرینہ تعلقات کو نظر انداز کر دوں۔" [3]

—— جیسا کہ اس سے قبل ذکر آ چکا ہے اقبال نے ۱۹۲۳ء کا الیکشن نہیں لڑا البتہ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے اس وقت الیکشن میں حصہ لیا جب میاں عبدالعزیز ان کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ ۱۹۲۶ء کے انتخاب کے

۱، ۲، ۳۔ مکاتیب اقبال، ص ۴۵، ۴۶، ۴۶

بارے میں نیاز الدین خان کے نام خطوط میں کوئی تذکرہ نہیں ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۳۶ء کا کوئی خط خان صاحب کے نام نہیں ملتا۔

نیاز الدین خان اور اقبال میں ایک قدر مشترک یہ بھی تھی کہ دونوں کبوتروں کے شوقین تھے، کبوتر پالنے کا شوق اقبال کو بچپن ہی سے تھا اور اس سلسلے میں وہ خاصا اہتمام کرتے تھے طرح طرح کے کبوتر پالتے تھے۔ بقول خالد نظیر صوفی "چونکہ اس زمانے میں فراغت زیادہ تھی۔ اس لئے لوگ عجیب عجیب مشاغل رکھتے تھے۔ انہی میں سے ایک مشغلہ کبوتر پالنا بھی تھا اور سیالکوٹ کے محلہ کشمیریاں میں تو یہ شغل ان دنوں انتہا پر تھا۔ آج بھی وہاں اس کے کافی آثار ملتے ہیں۔ چونکہ بچے پرندوں اور جانوروں کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کا اس ماحول میں کبوتروں کی طرف راغب ہو جانا ایک قدرتی امر تھا۔ میاں جی (والد اقبال) نے ان کا شوق دیکھ کر انہیں گھر پر ہی کبوتر رکھنے کی اجازت دے دی تاکہ وہ کبوتروں کے شوق میں غلط صحبت میں نہ پڑ جائیں۔ اب نانا جان (اقبال) کوٹھے پر سے اپنے کبوتر اڑاتے اور گھنٹوں خاموش بیٹھے اُن کی پرواز سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔" [1]

کبوتر پالنے کا یہ شوق انہیں بقول خالد نظیر صوفی جاوید اقبال کی ولادت تک رہا۔ جاوید اقبال کی ولادت ۱۹۲۴ء میں ہوئی اور نیاز الدین خان کے نام جس خط میں آخری بار کبوتروں کا ذکر ہے وہ [2] ۱۹۲۲ء کا ہے۔ اس صورت میں خالد نظیر صوفی کی بات ماننے میں کسی قسم کا تامل نہیں ہو سکتا۔ اصل میں اقبال نہیں چاہتے تھے کہ جاوید اقبال پر اس شوق کے اثرات پڑیں۔ اس ترک شوق کے بعد بھی کبوتروں سے لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی آپ چھت پر یا صحن میں لیٹے ہوتے تو دور فضا میں محو پرواز کبوتروں کو فوراً پہچان لیتے کہ یہ کون سی قسم ہے اور وہ کون سی نسل۔" [3]

نیاز الدین خان جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے، خود بھی کبوتر پالنے کا شوق رکھتے تھے اور اقبال کو انواع و اقسام کبوتر بھیجتے رہتے تھے لہٰذا اُن کے نام متعدد مکتوبات میں اس موضوع پر طرح طرح کی تصریحات کا پایا جانا ایک قدرتی امر ہے۔

---

[1] اقبال درون خانہ۔ خالد نظیر صوفی، ص ۱۰۔۱۱؛ [2] مکاتیب اقبال، ص ۴۰؛ [3] اقبال درون خانہ، خالد نظیر صوفی، ص ۱۱۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

"کبوتروں کے دو جوڑے جو آپ نے بکمالِ عنایت عطا فرمائے تھے۔ ان میں سے ایک جوڑا بچے نہیں دیتا۔ انڈے تو دیتا ہے اور دوسرے کبوتروں کے نیچے بھی اس کے انڈے رکھے جائیں تو بچے نہیں نکلتے، دوسرے جوڑے نے بچے دیئے مگر ان میں سے دو جو بہت اچھا اُڑتے تھے شکاری جانوروں کا شکار ہو گئے، ایک باقی ہے جوڑے میں نر ضعیف اور کمزور ہے اُمید نہیں کہ دیر تک زندہ رہے۔ بہتر یہ ہے کہ چند بچوں کے جوڑے بھجوائیے اگر ممکن ہو تو۔ میں نے لدھیانہ بھی لکھا ہے اور شاہجہانپور سے بھی انشاءاللہ کبوتر آجائیں گے۔" [1]

خط کی ایک ایک سطر سے اقبال کی کبوتروں سے دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ اقبال کے ملنے جلنے والوں میں جن لوگوں کو اس شغل سے دلچسپی تھی، اقبال اس موضوع پر ان سے تبادلہ خیالات کرتے چنانچہ خان صاحب کو متذکرہ بالا خط میں آگے لکھتے ہیں:۔

"آپ کے صاحبزادے نے ذکر کیا تھا کہ فیروز پور میں کوئی شخص ہے جو کبوتروں کو مستقل رنگ دے سکتا ہے جو رنگ اُن کے بچوں میں منتقل ہو سکتا ہے۔ مہربانی کر کے صاحبزادے سے دریافت کیجئے کہ اس آدمی کا پتہ کیا ہے۔ کل کرنل سٹیفنسن صاحب سے کبوتروں کے رنگوں کے متعلق بہت گفتگو ہوئی۔ انہوں نے چند کتابوں کے نام لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔" [2]

ایک اور خط میں کبوتروں کے جوڑے منگواتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ہاں کبوتروں کے متعلق لکھنا بھول گیا۔ دو جوڑے ارسال فرمائے تھے جن میں سے ایک عدم وجود کے برابر تھا کیونکہ وہ اپنے انڈے توڑ دیتا تھا۔ اب مہربانی کر کے دو جوڑے یا اگر دو نہیں تو ایک ارسال فرمائیے۔ یہ نسل کبوتروں کی بہت عمدہ ہے

---

[1]، [2]۔ مکاتیب اقبال، ص ۲۱، ۲۲۔

اس نسل سے ہوں جس سے پہلے وہ کبوتر تھے۔“ [۱]

اپریل ۱۹۲۰ء کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ کیجئے کہ اس سے کبوتروں کے بارے میں اقبال کا شوق بالکل واضح ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی خان صاحب کے بھیجے ہوئے کبوتروں کی تعریف و توصیف بھی کی ہے، لکھتے ہیں کہ:۔

”کبوتروں کے واسطے میں نے ماسٹر رحمت اللہ ڈرائینگ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول جالندھر کو لکھا ہے۔ اگر وہ عنقریب لاہور آنے والے ہوئے تو ان کے ذریعے ارسال فرما دیجئے گا۔ اور اگر مجھے معلوم ہوا کہ وہ عنقریب آنے والے نہیں ہیں تو پھر میں آپ کے بلانے پر اپنا آدمی یہاں سے ارسال کر دوں گا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ آپ کے کبوتروں کے برابر میرے تجربے میں کوئی نسل کبوتروں کی نہیں آئی۔ میں نے لدھیانہ، ملتان، سیالکوٹ، گجرات، شاہجہانپور سے کبوتر منگوائے مگر اتنی تعداد اچھے خوص کی کسی نسل میں جمع نہیں، جتنی کہ آپ کے کبوتروں میں۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ ظاہری شکل خوبصورت اور اس کے ساتھ اڑان اور کھیل۔“ [۲]

انہی کے نام ایک اور خط میں دیکھئے بات کبوتروں سے ہوتی ہوئی کہاں پہنچتی ہے۔ کہاں کبوتر اور کہاں شریف حرم۔ اس خط کا متعلقہ اقتباس ملاحظہ کیجئے اور اقبال کے ذہن رسا کی داد دیجئے۔

”نواب ابراہیم علی خان صاحب نے گنج پورہ سے چند سفید کبوتر بھیجے ہیں، دیکھنے میں وہ بھی نہایت اچھے ہیں۔ کیا عجب کہ اوصاف میں بھی اچھے ہوں۔ چونکہ بھیجنے والا بانی کعبہ کا ہمنام ہے اس واسطے میں نے کبوتروں کو کبوترانِ حرم کا خطاب دیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج کل کے کبوترانِ حرم پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ کسی فارسی استاد کا شعر تھا، میں نے اس پر ایک اور شعر لگا کر شریف حرم کو خطاب کیا ہے:۔

با مرغ حرم از من دل سوختہ فرما ۔۔۔ اے آنکہ بصحرا نفس آزاد برآری

---

[۱]، [۲] مکاتیب اقبال، ص ۲۹، ۳۰ ؛

جویائے گلستانی واز طالع گمراہ ! ترسم کہ سراز خانۂ صیاد برآری"[1]

مولانا شیخ غلام قادر گرامی جو اقبال کے دوست تھے، خان محمد نیاز الدین خان کے ہم وطن تھے، مولانا گرامی اقبال اور خان صاحب کے مشترکہ دوست تھے۔ دو دوستوں کی مراسلت میں مشترک دوست کا ذکر آنا ایک قدرتی امر ہے۔ اور پھر اس وجہ سے بھی کہ تینوں میں شاعری ایک قدرِ مشترک تھی، چنانچہ نیاز الدین خان کے نام مکاتیب میں مولانا گرامی کا ذکر بار بار آیا ہے۔ کبھی اقبال انہیں خان صاحب کی وساطت سے سلام بھیجتے ہیں، کبھی ان کی خیریت معلوم کرتے ہیں، اور کبھی اپنے کسی شعر پر ان کی رائے طلب کرتے ہیں اور کبھی مولانا کے کسی شعر کی داد دیتے ہیں۔

ایک خط میں مولانا گرامی کی طرف سے خط کا جواب نہ آنے کی شکایت کی ہے لیکن شکایت کا انداز دیکھئے:۔

"عرصہ ہوا میں نے انہیں (گرامی) خط لکھا تھا، مگر ان کے لیے خط کا جواب دینا ایسا ہی ناممکن ہے جیسا روس کا موجودہ حالت میں جرمنی سے لڑ سکنا"[2]

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:۔

"گرامی صاحب تو امام غایب ہو گئے، معلوم نہیں اس غیبت صغریٰ کا زمانہ کب ختم ہوگا؟"[3]

ایک خط میں اپنا ایک شعر لکھا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اسے مولانا گرامی کو بھی سنا دیا جائے۔[4] اسی طرح ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"کیا مولوی گرامی لاہور آنے کا بھی قصد رکھتے ہیں یا نہ؟ معلوم ہوتا ہے کہ خوف زدہ ہو گئے، مگر خوف کی کوئی بات نہیں، کل ایک شعر لکھا تھا، مولوی صاحب کی خدمت میں عرض کیجیے:۔

برق را ایں بجگرمی زند آں رام کند عشق از عقل فسوں پیشہ جگردار تر است"[5]

ایک خط میں گرامی کے اس شعر کو بطورِ عنوان درج کر کے اس کی بڑی تعریف کی ہے:۔[6]

---

[1]، [2]، [3]۔ مکاتیب اقبال، ص ۳۰-۳۱، ۸-۱۰؛ [4] مکتوب ۵، فروری ۱۹۱۹ء؛
[5]۔ مکاتیب اقبال، ص ۲۰؛ [6] مکاتیب اقبال، ص ۲۲ (مکتوب ۱۴، اکتوبر ۱۹۱۹ء)۔

عصیان ما و رحمت پروردگار ما　　　　این را نهایتے است نہ آں را نہایتے

اسی خط میں گرامی کے ایک شعر کے الفاظ عنوان "آن نگاہ" میں لفظ "آں" کو نکالنے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ مشورہ مولانا کی خدمت میں پیش کیجئے"۔

غرض نیاز الدین خان کے نام بہت کم خط ایسے ہیں جن میں مولانا گرامی کا ذکر نہ آیا ہو۔

سید نذیر نیازی اقبال کے مکتوب الیہم میں اس لحاظ سے کافی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کے نام مکاتیب کی تعداد سب سے زیادہ یعنی ۱۸۱ ہے۔ ان خطوط کو سید نذیر نیازی نے ایک مجموعے کی صورت میں مکتوبات اقبال کے نام سے ۱۹۵۷ء میں اقبال اکاڈمی لاہور کے ذریعے شائع کرایا۔ اس میں مرتب نے ہر مکتوب کا پس منظر اور وضاحت طلب امور کی تشریح بھی دی ہے اور اس طرح سے یہ مجموعہ دیگر تمام مجموعہ مکاتیب پر فوقیت رکھتا ہے۔ اگرچہ پہلا خط ۱۹۲۹ء کا شامل مجموعہ ہے تاہم ۱۹۳۴ء تک خطوط کی تعداد بہت ہی کم ہے اصل میں ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء میں اقبال خلاف معمول لاہور سے باہر رہے دو دفعہ لندن میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ پہلی موتمر اسلامی کی دعوت پر بیت المقدس بھی گئے اور دوسری بار فرانس سے ہوتے ہوئے سپین گئے۔ لہٰذا قدرتی طور پر سیاحت کے دوران خط و کتابت کا سلسلہ بہت حد تک منقطع رہا۔ ۱۹۳۴ء اور اس کے بعد خطوط کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ اقبال کے معالج حکیم نابینا صاحب دہلی میں قیام کرتے تھے اور نذیر نیازی اس زمانے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اُستاد تھے۔ لہٰذا حکیم صاحب تک ترسیل کا سب سے اچھا وسیلہ نیازی صاحب ہی تھے۔ چنانچہ اقبال کی بیماری کی تفصیلات اور پرہیز کے بارے میں سینکڑوں استفسارات ان خطوط میں جابجا ملتے ہیں۔

سید نذیر نیازی[۱] جامعہ ملیہ اسلامیہ کے گریجویٹ تھے اور بعد میں اسی ادارہ میں وہ اُستاد

۱۔ سید نذیر نیازی کے بارے میں یہ معلومات مجھے جناب پروفیسر مسعود حسین خان صاحب کی وساطت سے حاصل ہوئیں۔ پروفیسر صاحب نے میرے استفسار پر اپنے ایک مکتوب ۱۹ فروری ۱۹۸۳ء میں یہ تفصیلات بہم پہنچائیں۔ پروفیسر موصوف ۳۳-۱۹۲۷ء میں جامعہ مڈل سکول کے طالب علم تھے اور جب نذیر نیازی صاحب خطبات کا ترجمہ کرنے کی غرض سے ۱۹۳۲ء میں کشمیر آئے تو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے مسعود صاحب کو اُن کے ساتھ کر دیا تھا اور اس طرح سے انہیں نیازی صاحب کو قریب سے دیکھنے اور جاننے کا ایک اچھا موقع ملا۔

کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اسلامی تاریخ ان کا خاص مضمون تھا۔ نیازی صاحب کے والد شاہ جی سیالکوٹ کے اسی محلے کے رہنے والے تھے جہاں سے اقبال کا تعلق تھا۔ شاہ جی نے جامعہ کے قریب (جب جامعہ قرول باغ دہلی میں کرایہ کے مکانات میں تھی) ایک مکان بنوالیا تھا۔ دہلی میں سکونت اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم و تعلم کے باعث سید نذیر نیازی کو اردو زبان پر بہت اچھی قدرت حاصل تھی۔ سیماب پا مجرد انسان تھے۔ اپنی ذہانت اور رسائی کی وجہ سے جامعہ میں ایک خاص مقام کے حامل تھے لیکن ذہانت کے باوصف محض اپنی غیر منظم زندگی کی وجہ سے جو بھی علمی کام اپنے سر لیتے تھے اسے مشکل سے کر پاتے تھے چنانچہ جب وہ اقبال کے انگریزی خطبات کا ترجمہ کرنے کی غرض سے طویل رخصت پر کشمیر آئے، تو پروفیسر مسعود حسین خان کی روایت کے مطابق کشمیر میں اپنے اڈھائی ماہ کے قیام میں وہ بمشکل چند صفحات کا ترجمہ کر سکے یہ ترجمہ بعد میں مکمل ہو کر اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوا۔

نذیر نیازی کو اقبال سے بڑی عقیدت تھی۔ اقبال سے ان کا تعلق مراسلت سے بہت پہلے قائم ہو چکا تھا۔ بقول نذیر نیازی "١٩١٨ء کے اواخر ہی سے بالالتزام حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہو رہا تھا۔"[١] تحریک ترک موالات کے سلسلے میں نیازی صاحب ١٩٢٠ء میں علی گڑھ چلے گئے اور جامعہ سے منسلک ہو گئے اور ١٩٢٥ء میں جب جامعہ کو دہلی منتقل کیا گیا تو نیازی صاحب بھی دہلی آئے اور ١٩٣٥ء تک اس سے وابستہ رہے۔ اس سارے عرصے میں وہ سال میں ایک آدھ بار لاہور چلے جاتے اور اقبال سے مل آتے۔ ١٩٣٥ء میں جب وہ جامعہ سے بددل ہو کر لاہور چلے گئے تو پھر تو تقریباً ہر وقت اقبال کے ایک خدمت گزار کی حیثیت سے ان کے ارد گرد رہتے تھے۔

نذیر نیازی سے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے مراسلت کا آغاز ١٩٢٩ء سے ہوا اور پہلا خط جو اقبال کا نیازی صاحب کے مجموعے میں ہے وہ ٢٤ مارچ ١٩٢٩ء کا ہے، گو اس میں پچھلے کسی خط کا بھی تذکرہ ہے جس کے بارے میں نذیر نیازی نے لکھا ہے کہ ضائع ہو گیا ہے۔[٢] ٢٤ مارچ ١٩٢٩ء کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیام مشرق کی طباعت کا سلسلہ جامعہ کے ساتھ چل رہا تھا۔ نذیر نیازی لکھتے ہیں کہ جامعہ پریس کا انتظام جب مجیب صاحب

١، ٢- مکتوبات اقبال۔ سید نذیر نیازی ص ٥، ٩، فٹ نوٹ ٤

نے اپنے ہاتھ میں لیا تو یہ صلاح ٹھہری کہ اقبال کی کوئی کتاب جامعہ پریس میں شائع ہو، چنانچہ نذیر نیازی کی وساطت سے یہ تجویز اقبال تک پہنچائی گئی اور اقبال اس بات پر راضی ہو گئے۔ چنانچہ پیام مشرق کی طباعت کا کام شروع ہو گیا۔ اس ضمن میں اقبال نے جو خطوط لکھے ان سے اقبال کی شخصیت کا یہ پہلو بہت نمایاں طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ معاملات میں اقبال کا طرزِ عمل بہت ہی صاف ستھرا اور اصولی تھا۔ اسی دوران میں سید نذیر نیازی صاحب کا یورپ جا کر مزید تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ انگلستان یا جرمنی میں اسلامی تصوف کا مطالعہ کے موضوع پر تحقیق کریں انہوں نے اقبال سے مشورہ کیا تو اقبال نے انہیں لکھا کہ :-

"تصوف لکھنے پڑھنے کی چیز نہیں کرنے کی چیز ہے۔ کتابوں کے مطالعے اور تاریخی تحقیقات سے کیا ہوتا ہے۔ کسی کو کوئی حقیقی فائدہ نہیں پہنچا۔ نہ کتابوں کے مصنف کو نہ اس کے پڑھنے والوں کو۔ اس کے علاوہ مجھے امید ہے نہیں کہ بمبئی کے تاجر ایسے مضمون پڑھنے والے کسی کو ولایت بھیجیں۔ وہ عملی لوگ ہیں۔ ایسے مضمون ان کو اپیل نہیں کرتے۔ ضرورت بھی اس امر کی مقتضی ہے۔ بہتر ہو کہ آپ کسی اچھے ہنر کی تلاش میں ولایت جائیں۔" [1]

دوسرے خط میں انہیں تاریخ کے موضوع پر کام کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھا کہ اقبال کا خیال تھا کہ

"میں تصوف پر تاریخ کو ترجیح دیتا ہوں۔" [2]

اقبال کا خیال تھا کہ جامعہ سے وہ اپنی اور کتابیں بھی شائع کرا دیں لیکن مجیب صاحب کی علالت کے باعث ایسا ممکن نہ ہو سکا۔

"میرا ارادہ آپ کے مطبع سے اور کتب انگریزی و اردو و فارسی چھپوانے کا تھا مگر افسوس ہے مجیب صاحب بیمار ہو گئے..... کتاب بانگِ درا بھی قریباً تیار ہے۔ اس کی چھپوائی کا انتظام تو شاید ابھی نہ ہو سکے۔ اطلاع دیں کہ اگر آپ چھاپ سکیں تو لاہور ہی میں چھپوانے کا انتظام کیا جائے۔" [3]

مجیب صاحب کی علالت نے طول کھینچا اور جیسا کہ سبھی جانتے ہیں اقبال کی دوسری کتابیں لاہور ہی سے

۱، ۲، ۳۔ مکتوبات اقبال، ص ۱۰، ۱۱، ۱۳۔

چھپتی رہیں۔ اسی طرح سے اقبال نے ایک بار نذیر نیازی سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ڈاکٹر سید عابد حسین ان کے انگریزی لیکچروں RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM کا اُردو ترجمہ کریں۔ لیکن عابد حسین صاحب نے مصروفیت کے باعث معذوری کا اظہار کیا۔ بہر حال اس ضمن میں ۱۴ اپریل ۱۹۳۰ء کے خط میں نیازی صاحب کو لکھتے ہیں کہ :۔

"انگریزی لیکچر قریباً ۱۵ اپریل ۱۹۳۰ء تک چھپ کر تیار ہو جائیں گے۔ آپ اپنے دوست سے پوچھئے کہ آیا وہ اُردو ترجمہ کرنے کے لیے لاہور آسکیں گے یا نہیں؟ اگر وہ نہ آسکتے ہوں تو آپ خود یہ کام کرنے کو تیار ہیں یا نہیں۔

ترجمہ بلا معاوضہ نہ ہوگا۔" [1]

اقبال چاہتے تھے کہ جو صاحب بھی ان لیکچروں کا ترجمہ کریں وہ لاہور میں رہ کر ہی ایسا کریں تاکہ اس طرح سے وہ بذات خود اس ترجمے کی نگرانی کر سکیں۔ چنانچہ ایک اور خط میں نیازی کو لکھتے ہیں :۔

"میرا خیال ہے کہ آپ لاہور تشریف لائیں اور نمونتاً ایک آدھ لیکچر کا ترجمہ کریں۔ پھر فیصلہ ہو سکے گا۔ اس کام میں اور احباب کی مدد بھی آپ کے شامل حال ہوگی۔" [2]

جن مکاتیب کا خطبات کے ترجمے سے تعلق ہے وہ اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ ان میں اقبال نے خطبات کے کسی حصے، کسی مشکل مقام یا لفظ کی وضاحت کی ہے اور اس طرح سے ایسے مقامات اور الفاظ کی تفہیم کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ خطبات کے بارے میں اہل نظر جانتے ہیں کہ اکثر اوقات ان میں اختصار کے باعث سمجھنے میں دقت پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا اب جس قدر بھی ان مکاتیب میں تفصیل آگئی ہے وہ بہر حال غنیمت ہے۔ سید نذیر نیازی جب ترجمہ کر رہے تھے تو اقبال نے انہیں خاص طور پر اس کی ہدایت کر دی تھی کہ ادائے مطلب اور مصطلحات کے بارے میں علماء کا مشورہ ضروری ہے۔ لہٰذا نیازی صاحب ترجمے کی کثر عبارتیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے عربی کے اُستاد مولانا محمد السورتی اور مولانا اسلم جیراجپوری کو پڑھ کر سناتے چنانچہ جیسا کہ نذیر نیازی نے لکھا ہے کہ ایک دن تیسرے خطبے کے سلسلے میں آیہ نور کی بحث آگئی۔ مولانا اسلم نے

---

[1] ، [2] مکتوبات اقبال، ص ۲۲، ۲۳، ۲۴۔

فرمایا ڈاکٹر صاحب نور کو مادی نور کے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں اور پھر ہر چند کہ میں نے مولانا کی غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کی، انہیں اصرار رہا کہ میں ان کا یہ خیال حضرت علامہ تک پہنچا دوں۔ یہ اعتراض جب اقبال تک پہنچا تو انہوں نے اس کے جواب میں لکھا:۔

"مولانا کا ارشاد بجا ہے مگر اس آیت کو تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ اس مضمون کی آیات تقریباً تمام کتب سماوی میں موجود ہیں۔ اس کا مقصود یہ نہیں کہ خدا مادی معنوں میں LIGHT DEALT WITH IN PHYSICAL SCIENCE نور ہے۔ نور محض ایک استعارہ ہے جیسے قدیم کتبِ سماوی میں PANTHEISTIC اغراض کے لیے استعمال کیا گیا تھا یعنی وجودِ باری کو ہمہ گیر PERVASIVE ظاہر کرنے کے لیے۔ قرآن نے میری رائے ناقص میں اس قدیم استعارہ کو وجودِ باری کی ABSOLUTENESS پر اشارہ کرنے کے لیے استعمال کیا ہے کیونکہ عالمِ مادی میں بھی زمانہ حال کی تحقیق کی رُو سے صرف نور ہی ایک ایسی چیز ہے جو RELATIVELY ABSOLUTE ہے۔"[۱]

اقبال کو قرآن سے ایک طرح کا عشق تھا۔ خود انہوں نے اس بات کا ادعا کئی مرتبہ کیا ہے کہ انہوں نے اپنی عمر کا معتدبہ حصہ قرآن کے تفکّر اور تفقّہ میں صرف کیا ہے۔ چنانچہ مولانا اسلم جیراجپوری کے اعتراض کے جواب میں محولہ بالا خط کے تیسرے ہی روز ایک اور خط نذیر نیازی کو لکھا اور اپنا مافی الضمیر وضاحت کے ساتھ بیان کیا:۔

"آیۂ نور کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے اسے تاویل کہنا صحیح نہیں ہے۔ تاویل کا لفظ اس وقت صحیح ہوتا ہے جب کسی آیت کے الفاظ کے عام معنی چھوڑ کر کوئی اور معانی لئے جائیں۔ میں نے لفظ نور کے وہی معنی لئے ہیں جن میں یہ لفظ عام طور پر لیا جاتا ہے اگر آپ کہیں کہ اس آیہ میں نور علیٰ ہذالقیاس زجاج وغیرہ سے کچھ اور مراد ہے تو یہ تاویل ہوگی

---

[۱] مکتوب ۹ دسمبر ۱۹۳۰ء۔ (مکتوبات اقبال، ص ۴۰)

میں نے اپنے لیکچروں سے اس قسم کی تاویل سے پرہیز کی ہے..... باقی رہی دوسری آیت جس کا ذکر آپ نے اپنے آخری خط میں کیا ہے سو عرض یہ ہے کہ ایک اعتبار سے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ تمام حوادث پہلے سے متعین ہیں۔ میرے لیکچروں کا مشکل ترین حصہ غالباً یہی بحث ہے۔ اس کو غور سے پڑھنا چاہیئے۔ میں نے اس حصہ میں TIME ETERNITY کے تناقض کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ TIME کے اعتبار سے حوادث متعین نہیں۔ ETERNITY کے اعتبار سے ان کو متعین تصور کرنا بالکل بجا اور درست ہے۔ اس مسئلہ پر غالباً جدید سائنس مزید روشنی ڈال سکے گی۔ EINSTEIN سے اس بحث کا آغاز سمجھنا چاہیئے۔ علماء کے اعتراضات و تصورات سے زیادہ سروکار نہ رکھنا چاہیئے۔ آپ کو وضع اصطلاحات کا فکر کرنا چاہیئے۔ آخر یہ مباحث فلسفیانہ ہیں اور فلسفہ ایک متحرک شے ہے۔ اس کی کوئی دلیل جیسا کہ میں نے دیباچہ میں لکھ بھی دیا ہے، قطعی اور آخری قرار نہیں دی جا سکتی۔ علمِ انسان کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی تصورات بھی IMPROVE ہوتے جاتے ہیں۔ فلسفہ محض حقائق کو تصور کرنے کی کوشش کا نام ہے۔" لہ

خطبات کے ترجمے کا کام نذیر نیازی کے چھوٹے بھائی شبیر کی علالت اور پھر اس کی وفات کے باعث کچھ التوا میں پڑ گیا تھا۔ نذیر نیازی کے بھائی کا انتقال اگست ۱۹۳۱ء میں ہوا۔ ۷، اگست ۱۹۳۱ء کو اقبال نے خط کے ذریعے ان کی تعزیت کی۔ اس خط میں اطلاع بھی دی کہ اگست کے آخری دنوں میں وہ باہر جانے والے ہیں۔ اصل میں اقبال دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جانے والے تھے لیکن طبیعت کی ناسازی کے باعث اقبال ۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو واردِ لاہور سے روانہ ہوئے۔ اسی اثناء میں نذیر نیازی نے حیاتِ بعد الممات کے بارے میں کچھ استفسارات کئے کہ یہ مسئلہ بھی خطبات میں زیر بحث آیا ہے اور اقبال کا نقطہ نظر اس بارے میں جمہور علماء سے بالکل منفرد ہے۔ اقبال نے ان استفسارات کا جواب دیتے ہوئے ۱۹، اگست ۱۹۳۱ء

لہ۔ مکتوب ۱۱، دسمبر ۱۹۳۰ء، (مکتوبات اقبال، ص ۴۳) ۔

کے خط میں لکھا:

"حیات بعد الممات کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کو دوبارہ غور سے پڑھئے آپ کے سوالوں کا جواب مل جائے گا۔ میرے نزدیک حیات بعد الممات انسانی کوشش اور فضلِ الٰہی پر منحصر ہے۔ بچوں کے لیے بعثت زیادہ آسان ہے کیونکہ بعثت کا مفہوم ہے ایک نئے TIME SYSTEM کے ساتھ ADJUST کرنے کا۔ بچوں کے لیے یہ زیادہ آسان ہے کیونکہ ہمارا TIME SYSTEM ان کی فطرت میں پورے طور پر راسخ نہیں ہوتا۔ EGO کا نہایت گہرا تعلق TIME SYSTEM سے ہے۔ مرنے والوں سے اس زندگی میں اتحاد ممکن ہے بعینہٖ اسی طرح جس طرح ہم آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ مگر یہ اتحاد زیادہ تر کملا یا کامل انسانوں سے ہوتا ہے کیونکہ کی زندگی بعد از موت یقینی ہے۔ اس کے علاوہ وہ گذشتہ تجربات کا اعادہ کر سکتے ہیں۔ عوام سے یہ امر محال ہے خواہ وہ بعد از مرگ زندہ بھی ہوں۔ بعثت ثانیہ BIOLOGICAL PHENOMENON ہے۔ اس میں انسانی کوشش کو بھی ایک حد تک دخل ہے۔ اس کو انسانی ACHIEVEMENT بھی کہہ سکتے ہیں۔ ابدی موت اور زندگی خاص قسم کے اعمال سے متعین ہوتی ہے۔ میرے نزدیک اگر کوئی شخص ابدی موت کا خواہشمند ہو تو وہ اسے حاصل کر سکتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دوزخ اور جنت بھی زندگی کے PHENOMENA ہیں اور ان کے CHARACTER کی تعین اسی مرحلہ پر منحصر ہے جو زندہ شے نے حاصل کیا ہے۔ اس زندہ شے کے لیے دوزخ اور جنت ہے۔ یہاں تک کہ پودوں اور حیوانوں کے لیے۔ مگر اس دوزخ اور جنت کے CHARACTER کی تعین PLANT LIFE اور ANIMAL LIFE کے اسٹیج پر منحصر ہے۔ یہی حال بچوں کی زندگی کا ہے۔ زندگی کے مدارج بے شمار ہیں۔ اس ضمن میں بہت سے امور عقلِ انسانی سے باہر ہیں۔ ان کے متعلق بصیرت وایمان اور ذرائع سے پیدا ہوتا ہے۔ ان ذرائع کا تعلق فلسفہ سے نہیں ہے۔" [1]

---

[1] مکتوبات اقبال۔ ص ۴۶ - ۴۷

غرض اس طرح کی تصریحات سے ان مکاتیب کی اہمیت اور افادیت خاصی بڑھ جاتی ہے اس کے علاوہ نذیر نیازی کے نام ایسے خطوط کی تعداد بھی خاصی ہے جن میں اقبال نے اپنی مصروفیات، اپنے سفر انگلستان اور بعد میں سفر افغانستان، رہوڈز لیکچرس، خطبات کی طباعت، ترجمے کی اشاعت، مسلم کانفرنس کا جلسہ الہ آباد، متحدہ قومیت، اور کچھ اس طرح کی باتیں بھی لکھی ہیں جن کی نوعیت سراسر کاروباری ہے۔ ۱۹۳۴ء سے مکاتیب کی بیشتر تعداد وہ ہے جن میں اقبال نے اپنی بیماری اور اپنے علاج معالجے کی کیفیت لکھی ہے اور ان کی تعداد خاصی ہے ان خطوط سے اقبال کی بیماری سے متعلق تقریباً تمام جزئیات معلوم ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا خط ۱۲ فروری ۱۹۳۴ء کا ہے۔ اس میں اقبال نے ڈاکٹر بہجت وہبی، جو ترکی کے ایک پرجوش اور غیور مسلمان تھے اور ڈاکٹر انصاری کے رفیق درس رہ چکے تھے کے سلسلہ توسیعی خطبات کی صدارت کرنے سے معذوری ظاہر کی ہے۔

"میری طبیعت کئی دنوں سے علیل ہے۔ اس لئے دہلی ڈاکٹر بہجت وہبی کے لیکچر کی صدارت کے لیے نہیں جا سکوں گا۔" [۱]

یہ خط چونکہ اقبال نے اپنے ہاتھ سے نہیں لکھا تھا۔ لہذا سید نذیر نیازی کو تردد ہوا۔ اور انہوں نے استفسار حال کیا۔ اقبال نے دوسرے خط میں انہیں لکھا کہ انہیں انفلوانیزا ہو گیا تھا۔ اور یہ کہ گلے کی خرابی بدستور باقی ہے [۲]۔ تقریباً تین مہینوں کے وقفے کے بعد اقبال نے گلے کی شکایت کا بھرپور ذکر کیا ہے۔ اس خط کے لکھنے کے صرف پانچ روز بعد اقبال نے سید نذیر نیازی کو لکھا کہ وہ حکیم نابینا صاحب سے مل کر ان کی بیماری کے کوائف کہہ دیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ذرا تفصیل سے لکھا ہے:۔

"آپ حکیم نابینا صاحب کی خدمت میں پھر میری طرف سے حاضر ہوں اور بیماری کے کے حالات عرض کر دیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ گلے کے نیچے جو آلۂ صوت LARYNX ہے، اس کا تار ڈھیلا ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے آواز بیٹھ گئی۔ چار ماہ تک علاج ہوا مگر

---

[۱] مکتوبات اقبال۔ ص ۱۲۶ [۲] مکتوب ۲۷ فروری ۱۹۳۴ء

کچھ خاص فائدہ اس سے نہیں ہوا جسم کی کمزوری بڑھ رہی ہے۔ دردِ گردہ اور نقرس کا حال تو حکیم صاحب کو خود ہی معلوم ہے۔ دردِ گردہ کا پھر دورہ نہیں ہوا جب سے ان کا علاج کیا ہے آج چھ برس ہو گئے ہیں اس درد نے پھر تکلیف نہیں دی۔ البتہ نقرس کی شکایت کبھی کبھی ہو جاتی ہے بعض ڈاکٹر کہتے ہیں کہ نقرس کا اثر گلے پر پڑ سکتا ہے۔" ؎۱

اس خط کے تیسرے ہی دن ایک اور خط میں مزید تفصیلات لکھی گئیں ہیں:۔

"ڈاکٹروں نے مزید معائنہ کیا ہے اور چھاتی وغیرہ کی اکس لیے (X-RAY) فوٹو لئے گئے۔ معلوم ہوا ہے کہ دل کی اوپر کی طرف ایک نئی GROWTH ہو رہی ہے جس کے دباؤ سے ووکل کارڈ (VOCAL CHORD) متاثر ہوئی ہے۔ ان کے نزدیک اس بیماری کا علاج الیکٹرک ہے اور بہترین الیکٹرک علاج یورپ میں ہی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی اندیشہ ہے کہ GROWTH کا اثر پھیپھڑوں پر نہ پڑے۔ اس وقت پھیپھڑے اور دل اور دیگر اعضاء اندرون بالکل صحیح اور تندرست حالت میں ہیں۔ ان امور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ظاہر ہے کہ معاملہ پیچیدہ ہے لیکن میں اس سے پہلے مغربی اطباء کا امتحان کر چکا ہوں۔ حکیم صاحب سے مشورہ کئے بغیر یورپ نہ جاؤں گا اور یورپ کے علاج پر روپیہ خرچ بھی نہیں ہو سکتا۔" ؎۲

یہ خط ۲ جون ۱۹۳۴ء کا تھا۔ اس کے بعد بیماری کی دوسری تفصیلات متواتر کچھ خطوط میں ملتی ہیں۔ ۳ جون کو بھی ایک اور خط میں صرف بیماری کا ہی تذکرہ ہے۔ ۵ جون کو دو خط لکھے گئے ہیں اور دونوں میں بیماری، پرہیز اور دوا کا ذکر ہے۔ پھر ۸ جون کے خط میں ڈاکٹروں کے باہمی اختلافِ رائے کا ذکر ہے۔ ۱۱ جون ۱۹۳۴ء کو اقبال حکیم صاحب سے ملنے کے لیے دہلی آئے اسی شام واپس لاہور گئے۔ اور دوسرے روز یعنی ۱۲ جون کو ایک اور خط لکھا جس میں کھانے پینے کی کچھ چیزوں

؎۱، ؎۲۔ مکتوبات اقبال ص ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴؛

کے متعلق حکیم صاحب کے لیے استفسارات ہیں۔ دوسرے ہی دن یعنی ۱۳ جون کو ایک اور خط لکھا جس میں کچھ مزید دریافت طلب امور پوچھے گئے ہیں۔ یہی کیفیت ۱۶، ۱۷، اور ۲۰ جون کے مکاتیب کی ہے۔ ۲۰ جون کو دو خط نیازی صاحب کے نام لکھے گئے ہیں دونوں خطوط میں دوا اور پرہیز سے متعلق استفسارات ہیں۔ البتہ دوسرے خط میں اپنے آیندہ کے پروگرام کے بارے میں ایک خواہش کا اظہار بھی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال کی شہرت ہندوستان سے باہر بھی پھیل چکی تھی اور ایک سربرآوردہ مسلمان شاعر اور مفکر کی حیثیت سے وہ خاص طور پر مسلم ممالک میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ایسی صورت میں ان کی مسلسل علالت اور خاص طور پر ان کی آواز کا بیٹھ جانا ایک زبردست سانحہ تھا۔ اسی سلسلے میں اقبال نذیر نیازی کو لکھتے ہیں:۔

"آواز جلد تبدیل ہو تاکہ آیندہ پروگرام وضع کر سکوں۔ کل جنوبی افریقہ سے دعوت آئی ہے اور وہاں کے مسلمان مصر ہیں کہ یہاں کا دورہ ضروری ہے۔ گذشتہ ہفتہ ایک خط جرمنی سے آیا جس سے معلوم ہوا ہے کہ ترکی کی طرف سے بھی دعوت دی جانے والی ہے۔ بہرحال میری خواہش ہے کہ اس جہان سے رخصت ہونے سے پہلے:۔

برآور ہر چہ اندر سینہ داری سرودے نالۂ آہ و فغانے" [1]

نذیر نیازی کے نام ۱۹۳۴ء کے سبھی مکتوبات جن کی تعداد ۷ تک پہنچتی ہے کم و بیش اقبال کی بیماری اور علاج وغیرہ سے متعلق ہیں۔ حکیم نابینا صاحب کے علاج سے اقبال کی صحت عمومی میں کافی بہتری پیدا ہو گئی، لیکن آواز میں کسی طرح کی کشایش نہ ہوئی۔ اور اس وجہ سے اقبال کا اضطراب بڑھ رہا ہے۔ اس دوران میں شائد ہی کوئی خط ایسا ہو جس میں اس بات کا ذکر نہ ہو۔ اقبال کو حکیم نابینا پر زبردست بھروسہ تھا۔ یوں بھی ایلوپیتھک طریقۂ علاج پر یونانی علاج کو ترجیح دیتے تھے۔ علاوہ اس کے حکیم نابینا صاحب چونکہ گہری مذہبی حمیت کے حامل تھے۔ اس وجہ سے اقبال ان کی روحانیت کے بھی قائل تھے۔ اسی بنا پر اکثر خطوط میں دوا کے ساتھ ساتھ دعا کے بھی طالب ہوتے

---

[1] مکتوبات اقبال، ص ۱۵۲۔

ہیں۔ اسی سال اگست میں ایک اور افتاد یہ آن پڑی کہ اقبال کی ایک آنکھ میں موتیا بند اتر آیا۔ اگست کے اواخر میں پہلی بار اقبال کی بیوی (والدۂ جاوید اقبال) کی بیماری کا تذکرہ بھی ہے خط[۱] کی عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی کافی دنوں سے علیل تھیں۔ لیکن اب ان کی بیماری زیادہ بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ اس خط میں ان کا حال، بیماری کی کیفیت بھی حکیم نابینا صاحب کو سنانے کی غرض سے لکھی ہے۔ دسمبر ۱۹۳۴ء میں اقبال کے عوارض میں دردِ شانہ[۲] کا اضافہ ہوا۔ یہ درد اکثر رات کو اور کبھی کبھی دن کو بھی ہوتا تھا۔ اس کی وجہ سے ان کی نیند میں خلل واقع ہوتا تھا۔ بہر حال اخیر جنوری ۱۹۳۵ء میں اقبال بھوپال چلے گئے، جہاں ان کا ایلوپیتھک علاج ہوتا تھا۔ اور ULTRA VOILET RAYS اور برقی علاج بھی شروع کیا جس سے تھوڑا بہت افاقہ ہوا۔ اور یہ امید بندھی کہ اب وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو جائیں گے۔ اقبال ۱۰ مارچ ۱۹۳۵ء کو لاہور پہنچے اور ۱۱ مارچ کو نذیر نیازی کے نام جو خط لکھا اس میں لاہور بخیریت پہنچنے کی اطلاع کے ساتھ ساتھ والدۂ جاوید اقبال کی علالت کا ذکر اور حکیم صاحب سے ملنے اور ان سے والدۂ جاوید کے لیے دوائیں حاصل کرنے کی تاکید ہے۔ اس کے بعد دوسرا خط بھی ۱۱ مارچ کو ہی لکھا گیا ہے جس میں والدۂ جاوید کی بیماری کا ذکر اور اس بیماری کی مختلف علامات کا تفصیلی ذکر ہوا ہے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال، بیگم صاحبہ کی بیماری کے باعث بہت پریشان تھے ۲۰۔ اور ۲۷ مارچ کے مکاتیب بھی والدۂ جاوید کی بیماری سے متعلق ہیں ان کی اس بیماری نے بھی طول پکڑا اور آخر کار وہ ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو انتقال کر گئیں۔

"کل شام چھ بجے والدۂ جاوید اس جہان فانی سے رخصت ہوئیں۔ ان کے آلام و مصائب کا خاتمہ ہوا اور میرے اطمینان قلب کا۔ اللہ فضل کرے۔

ہر چہ از دوست می رسد نیکو ست"[۳]

اسی سال دوسری مرتبہ اقبال بھوپال گئے اور وہاں برقی علاج ہوتا رہا۔ اسی دوران میں سے

۱۔ مکتوب۔ ۲۸۔ اگست ۱۹۳۴ء؁ ۲۔ مکتوب۔ ۲۷۔ دسمبر ۱۹۳۴ء؁

۳۔ مکاتیب اقبال۔ ص ۲۶۴؁

سید نذیر نیازی صاحب بھی جامعہ سے کچھ لاتعلق ہو گئے تھے اور وہ معاش کی کوئی اور سبیل تلاش کر رہے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں ہی انہوں نے طلوع اسلام کے نام سے ایک مجلہ شائع کیا جس کے اجراء میں اقبال نے بطور خاص دلچسپی لی۔ ۱۹۳۶ء کے مارچ میں اقبال ایک اور مرتبہ بھوپال چلے گئے، اسی مہینے میں سید نذیر نیازی بھی لاہور منتقل ہو گئے۔ اس طرح سے اقبال اور نذیر نیازی کی مکاتبت ختم ہو گئی۔ اب سید نذیر نیازی تقریباً روزانہ اقبال کے یہاں حاضری دیتے تھے اور یہ سلسلہ اقبال کی وفات تک جاری رہا۔

مکاتیبِ اقبال کا اسلوب

اب تک مکاتیبِ اقبال کا مطالعہ ہم نے کئی حیثیتوں سے کیا خطوط کے حوالے سے ہم نے ان کی شخصیت، ان کے افکار و تصورات اور ادب اور شاعری کے بارے میں ان کے نظریات سے بحث کی ہے، لیکن اب تک ہم نے ان کے اسلوبِ نثر اور خاص طور پر ان کے خطوط کے اسلوب کی بات نہیں کی ہے اس باب میں ہم اقبال کے خطوط کا مطالعہ خالص ادبی اور اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے کریں گے۔ یہاں یہ بات مدِ نظر رہنی چاہیئے کہ اس لحاظ سے اقبال کے مکاتیب کی اہمیت غالب، شبلی، مولانا آزاد یا رشید احمد صدیقی کے خطوں کے برابر نہیں، تاہم اس مطالعے سے ان کے اسلوب کا وہ رنگ نمایاں کیا جا سکتا ہے جو ان کے مکاتیب کی ایک بنیادی خصوصیت ہے اور وہ یہ کہ ان میں مدعا کا بے تکلف اظہار ہے۔ اس خصوصیت کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:۔

"علامہ کے خطوط میں اثر آفرینی میں کوئی کشش نہیں، مخاطب کے جذبات کو ابھارنے کا اہتمام نہیں، بات پہنچانے کی پرخلوص سعی ہے۔ اس سلسلے میں شبلی، سید سلیمان بلکہ مولانا ابوالکلام تک کے خطوں سے مقابلہ کیجئے، بڑا فرق یہ نظر آئے گا کہ یہ سب حضرات اپنے نثر

پُردازانہ اور ادیبانہ احساس سے باہر ہی نہیں نکل سکتے، ان کے برعکس اقبال کسی جگہ یہ تاثر نہیں دیتے کہ وہ اپنی انشا پردازی کا شعوری مظاہرہ کر رہے ہیں۔ متین، راست طرزِ نگارش، بے تکلف اور پُرخلوص نثر لکھنے کے معاملے میں اقبال، اقبال ہیں اور کوئی دوسرا ادیب ان کا مثیل و ہمسر نہیں۔"

یہ جو ادیب ہم نے لکھا ہے کہ ادبی نقطۂ نظر سے اقبال کے مکاتیب کی اہمیت غالب یا ابوالکلام کے خطوں کے برابر نہیں ہے تو اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ مثلاً جہاں تک غالب کا تعلق ہے اس کے لیے خط تنگنائے غزل کا نعم البدل تھا۔ خط کو غالب نے اپنے اظہار اور انکشاف کے ایک پیرائے کے طور پر استعمال کیا اور اس طرح سے علاوہ ان کے شعری کلام کے ان کے خطوط بھی تخلیقی جوہر کے نمود کا ایک ذریعہ بن گئے ہیں۔ ابوالکلام نے خاص طور پر غبارِ خاطر کے خطوط میں محض خط کے فارم سے فائدہ اٹھایا ہے یہ خطوط جو احمد نگر کے قلعے میں اسیری کے دوران میں لکھے گئے ہیں مکتوب الیہ کو نہ بھیجے جا سکے تاہم مولانا اپنی طبعِ نازک اور ذوقِ مخاطبت کے ہاتھوں مجبور تھے، اور دیکھا جائے تو یہی مجبوری انہیں خطوط کے زمرے سے نکال کر انشائیے کی سرحد تک لے آتی ہے۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ ان میں مولانا کی انا اس حد تک حاوی ہے کہ ان میں مکتوب الیہ سمیت کسی دوسرے شخص کا گذر ہی نہیں ہو سکتا۔ ان خطوط میں کاتب اور مکتوب الیہ کی نوعیت میگھ دوت کے بادل اور گندھرب کی سی ہے جن کے درمیان کسی طرح کا کوئی رشتہ پیدا نہیں ہو پاتا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مولانا کے دیگر خطوط غبارِ خاطر کے خطوط سے بالکل مختلف ہیں۔ ان میں اظہارِ خیال اور ابلاغ کا طریقہ کار متین اور راست ہے۔

دوسری طرح کے خطوط جن میں کسی مخصوص موضوع پر اظہارِ خیال کے لیے خطوط کا فارم اور اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ ان میں قاضی عبدالغفار کی کتب لیلی کے خطوط اور مجنوں گورکھپوری کے پردیسی کے خطوط کو بڑی اہمیت اور شہرت حاصل ہے۔ اسی سلسلے کی کڑی مکتوباتِ نیاز بھی ہیں۔ اس طرح کے مکاتیب میں محض خط کے فارم کو استعمال کیا گیا ہے ورنہ دیکھا جائے تو یہ خط کے زمرے میں نہیں آتے ان میں سے بعض انشائیے کہلا سکتے ہیں اور بعض مضامین۔

اقبال کے مکاتیب کو اس طرح کے خطوط کے تناظر میں دیکھنا یا جانچنا غلط ہوگا۔ چند ایک خطوط کو چھوڑ کر جن میں اقبال نے شعوری طور پر ادبیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ان کے مکاتیب کا عام اسلوب حالی اور سرسید کے اسلوب سے قریب ہے جس میں اپنے خیالات و افکار کو حد درجہ سنجیدگی اور استدلال کے ساتھ اپنے مخاطب کے دل و دماغ میں اتارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سرسید سے پہلے خطوط کی سب سے بڑی خصوصیت زبان اور اسلوب کے لحاظ سے تھی مگر بعد میں ان کی جگہ واقعات اور حقائق نے لی، اور بقول خواجہ احمد فاروقی "اقبال سرسید کی تحریک کا گل سرسبد ہیں"[له]۔ منجملہ دیگر مماثلتوں کے جو سرسید تحریک اور اقبال میں پائی جاتی ہیں۔ ایک اہم خصوصیت جو اس تحریک اور اقبال میں مشترک ہے، وہ ہے خیالات اور جذبات کا راست اظہار۔ اس معنی میں یقیناً اقبال اپنے نثری سرمائے کے بل بوتے پر جو مقدار اور کیفیت کے اعتبار سے خاصا وقیع ہے تحریک سرسید کا گل سرسبد کہلانے کے مستحق ہیں۔ سرسید نے اردو میں نثر نگاری کی جو روایت شروع کی، اس روایت کو ان کے رفقا نے اپنا کر آگے بڑھایا۔ ان میں حالی، ذکاء اللہ، نذیر احمد، شبلی، محسن الملک، وقار الملک اور چراغ علی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ان سب کی اپنی اپنی انفرادیت بھی ہے لیکن بحیثیت مجموعی یہ سب سرسید کے اسلوب نثر کے ہی پیرو رہے ہیں۔ سرسید کا نثری اسلوب اور انداز بیان سیدھا سادہ ہے، اسے ہم مقصدی اور افادی انداز بیان بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس اسلوب میں علمی رنگ و آہنگ زیادہ نمایاں ہے۔ اور عقلیت اور منطقیت زیادہ ابھری ہوئی ہے۔ نذیر احمد اور شبلی نے اس اسلوب میں ایک طرح کی شگفتگی اور رنگینی بھی پیدا کی، لیکن اس اسلوب کی اساسی خصوصیت یعنی خیالات کے اظہار کا سیدھا اظہار ہر حالت میں برقرار رہی۔ اپنے اسلوب نثر کے بارے میں سرسید نے خود جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ اس اسلوب کا بہترین جائزہ ہے وہ لکھتے ہیں:-

"جہاں تک ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔

له۔ اقبال۔ آئینہ خانے میں۔ مرتبہ آفاق احمد، اردو اکیڈمی۔ بھوپال۔

ہاں تک ہماری کم فہم زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی اور بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینیٔ عبارت سے جو تشبیہات و استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفٰی عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا، سادگیٔ عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل پر پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں پڑے۔"[1]

بیسویں صدی کے اوائل میں یہی اسلوبِ نثر جس کا چلن سرسید کا مرہونِ منت تھا رائج رہا۔ لیکن شبلی اور ابوالکلام آزاد اور بعد میں مہدی افادی نے رومانی اندازِ بیان اختیار کیا جس نے ایک دور میں اردو نثر پر گہرا اثر ڈالا۔ اور آگے چل کر اسی اثر سے اردو ادبِ لطیف کی تحریک چلی اور اسی اندازِ نثر نے نیاز فتحپوری، سجاد انصاری، لطیف الدین احمد، قاضی عبدالغفار، رشید احمد صدیقی، آلِ احمد سرور، مولانا صلاح الدین احمد اور چودھری فضل حق وغیرہ کو خاصا متاثر کیا۔ ان سبھی ادیبوں اور نثاروں نے اردو نثر کی روایت میں اپنے اسالیب سے گراں قدر اضافے کئے ہیں۔

سرسید کی تحریک کے زیرِ اثر علمی، فلسفیانہ، تحقیقی اور تنقیدی موضوعات کو سادہ، رواں شگفتہ شاداب اسلوب کے ساتھ پیش کرنے کی ایک جان دار روایت قائم ہوئی اور اقبال نے اس روایت کا بغور جائزہ لیا۔ وہ اس روایت سے متاثر بھی ہوئے اور اسے آگے بڑھانے میں معاونت بھی کی۔ اقبال کا خاص میدان تو شاعری تھا، لیکن ان کی نثری تحریریں اس بات کی شاہد ہیں کہ وہ اچھی نثر لکھنے پر بھی قادر تھے۔ انہوں نے ادق موضوعات پر لکھا اور موضوعات سے متعلق تمام پہلوؤں کی وضاحت آسان اور سادہ لیکن علمی زبان میں کی۔ معاشیات، عمرانیات، فلسفہ، مذہب، سیاست وغیرہ جیسے موضوعات پر لکھتے ہوئے انشا پردازی سے کام نہیں چل سکتا، نہ خواہ مخواہ ادبیت پیدا کی جا سکتی ہے البتہ اس قسم کے علمی موضوعات

---

[1] مضامین تہذیب الاخلاق۔ ۱۲۹۱ھ۔ سرسید احمد خان۔

کو آسان اور سادہ زبان میں پیش کر دینا ہی بجائے خود ایک کارنامہ ہے اور یہ کارنامہ اقبال نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ اقبال کی نثری تحریروں کا سلسلہ ۱۹۰۲ء سے شروع ہو کر ان کی زندگی کے آخری دنوں تک جاری رہتا ہے۔ ان تحریروں میں مضامین، مقالات، تقریریں، پیغامات، مستقل کتابیں اور مکاتیب شامل ہیں، جن سے مکاتیب کے علاوہ تقریباً سبھی چیزیں اقبال کی زندگی میں ہی شائع ہوئیں۔ ان کی مستقل تصانیف مثلاً علم الاقتصاد، فلسفۂ عجم، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے علاوہ ان کے متفرق مضامین جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے تھے مختلف مجموعوں کی صورت میں مرتب ہو گئے اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوئے ہیں۔ ان مجموعوں کی تفصیل یوں ہے :-

۱۔ مضامین اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج۔ یہ مجموعہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔

۲۔ مقالات اقبال مرتبہ عبدالواحد معینی۔ یہ مجموعہ مضامین ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔

۳۔ خطبات و تقاریر اقبال مرتبہ شاملو۔ یہ مجموعہ اقبال چند خطبوں اور تقریروں پر مشتمل ہے جو انہوں نے انگریزی میں دیئے ہیں۔ یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۴۵ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

۴۔ حرف اقبال مرتبہ لطیف احمد شروانی۔ یہ بھی اقبال کے خطبات اور تقاریر و بیانات کا مجموعہ ہے۔ پہلی بار ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔

۵۔ خطبات اقبال۔ رضیہ فرحت بانو کا ترتیب دیا ہوا یہ مجموعہ تین صدارتی خطبات پر مشتمل ہے۔ یہ علی گڑھ سے ۱۹۴۶ء میں پہلی بار چھپا۔

۶۔ انوار اقبال۔ مرتبہ بشیر احمد ڈار۔ اقبال کی تقاریظ، تبصرے، بیانات، مضامین اور کچھ خطوط پر مشتمل یہ مجموعہ اقبال اکیڈمی کراچی کی طرف سے پہلی بار ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔

۷۔ گفتار اقبال۔ مرتبہ محمد رفیق افضل۔ یہ مجموعہ اقبال کے اُن بیانات و مضامین پر مشتمل ہے جن کا تعلق سیاسی و سماجی زندگی سے ہے۔ یہ مضامین اور بیانات لاہور کے دو اخبارات 'زمیندار' اور 'انقلاب' سے ماخوذ ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں پہلی مرتبہ لاہور سے شائع ہوا۔

۸۔ اقبال کے نثری افکار۔ مرتبہ عبدالغفار شکیل۔ یہ مجموعہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

کے اہتمام سے ۱۹۷۷ء میں چھپا۔ اس میں سے اکثر مضامین اس سے پہلے کئی مجموعوں میں شائع ہوئے ہیں۔

غرض اس فہرست سے یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں کہ اقبال کی نثری تحریرات کا ذخیرہ بھی خاصا ضخیم اور متنوع ہے۔ اس کے علاوہ ان کے خطوط ہیں، جو مختلف مجموعوں کی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ اور جن کی مجموعی تعداد تیرہ سو سے اُوپر ہوتی ہے۔

جہاں تک ان کی نثری کتابوں اور مضامین و مقالات کا تعلق ہے ان کا اسلوب اور انداز بیان ان کے خطوط کے اسلوب اور انداز بیان سے قدرے مختلف ہے۔ کتابوں اور مضامین میں جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے وہ جیسا کہ اس سے قبل عرض کر چکا ہوں سرسید اور مولانا حالی سے گہرا معنوی رشتہ رکھتا ہے کیونکہ جس زمانے میں اقبال نے لکھنا شروع کیا اس وقت حالی کے اثرات اردو نثر کی روایت پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے۔ نثر کا یہ اسلوب اگرچہ ایک لحاظ سے خشک اور بے مزہ تھا لیکن عام فہم ہونے کی خصوصیت بھی اس میں بہر صورت موجود تھی۔ مقصدیت اور افادیت اس اسلوب کا طرۂ امتیاز تھی۔ اقبال اس روایت سے متاثر ہوئے اور علمی موضوعات کو سنجیدہ اسلوب نثر میں پیش کرنے کا تجربہ ان کے ہاں کامیاب رہا۔ اس اسلوب نثر کے متعلق اقبال خود علم الاقتصاد کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"زبان اور طرز عبارت کے متعلق صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہوگا کہ میں اہل زبان نہیں ہوں۔ جہاں تک مجھ سے ممکن ہوا ہے میں نے اقتصادی اصولوں کے حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اردو زبان میں اس متین طرز عبارت کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزی کی علمی کتابوں میں عام ہے۔" [1]

اس سے ظاہر ہے کہ اقبال جس وقت اس موضوع پر قلم اٹھا رہے تھے اس وقت بھی زبان کے استعمال اور طرز عبارت کی تشکیل کا انہیں شعور تھا۔ یہ محض ان کا انکسار ہے کہ وہ اپنے آپ کو اہل زبان

---

[1] علم الاقتصاد۔ ص ۲۵

6009

نہیں سمجھتے حالاں کہ زبان پر جس قدرت کا اظہار انہوں نے عملی طور پر کیا ہے اس پر خود اہلِ زبان بھی رشک کر سکتے ہیں۔ ان کی عبارتوں میں پختگی اور روانی صفائی اور سادگی وضاحت اور صراحت کی وہ خصوصیات ملتی ہیں جو علمی تحریروں کو زندہ اور جاندار بناتی ہیں۔ یہ خصوصیات سرسید تحریک سے متاثر ہونے کی غمازی بھی کرتی ہیں اور ساتھ ہی اقبال کے مغرب کی فلسفیانہ اور فکری تحریروں کے مطالعہ کی طرف اشارہ بھی کرتی ہیں۔

اقبال اپنے علمی اسلوب نثر میں جمالیاتی اقدار کو نمایاں کرنے کا خاص خیال رکھتے ہیں چنانچہ اس ضمن میں وہ کہیں تشبیہوں سے کام لیتے ہیں اور کہیں استعاروں سے۔ کہیں یہ مقصد کچھ تصویریں تخلیق کرنے سے پورا ہوتا ہے اور کہیں لطائف و واقعات کے بیان سے۔ اس اجمال کی تفصیل چند مثالوں کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں:

تشبیہات و استعارات کے استعمال کی دو ایک مثالیں دیکھئے:۔

"برق جس کی مضطربانہ چمک تہذیب کے ابتدائی مراحل میں انسان کے دل میں مذہبی تاثرات کا ایک ہجوم پیدا کر دیا کرتی تھی اب اس کی پیام رسانی کا کام دیتی ہے نسیم اس کی سواری ہے اور اس کے پنکھے جھلا کرتی ہے۔" (قومی زندگی مشمولہ مقالات اقبال ص ۴۴)

"لڑکا خواہ منگنی سے پہلے اپنے سسرال کے گھر میں جاتا ہی ہو منگنی کے بعد تو اس گھر سے ایسا پرہیز کرنا پڑتا ہے جیسے ایک متقی کو مے خانے سے۔" (قومی زندگی)

"مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی انا محض ایک فریب تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتار دینے کا نام نجات ہے"

(دیباچہ مثنوی اسرار خودی)

یہ تشبیہات اور استعارات اچھوتے نہیں لیکن موضوع کی نسبت سے دیکھا جائے تو ان کا استعمال اچھوتا ضرور معلوم ہوگا اور پھر ان کے استعمال کا بنیادی مقصد خیال کی وضاحت ہے۔

تصویر کشی بھی بعض جگہ ان کے نثری اسلوب کو زیادہ پر اثر بنا دیتی ہے مثلاً اپنے ایک مضمون "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور خاص طور پر غریبوں کی بدحالی پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے

ایک ایسی تصویر کھینچی ہے جس سے نہ صرف پورا منظر آئینہ ہو جاتا ہے بلکہ قاری کی طبیعت میں رنج و غم کی ایک لہر بھی دوڑتی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"یقیناً کسی کو اس بات سے انکار نہ ہوگا کہ غریب مسلمان کی اقتصادی حالت نہایت ہی افسوسناک اور قابلِ رحم ہے۔ شہروں میں جہاں کی آبادی کا جزوِ غالب مسلمان ہیں، معمولی درجے کے مسلمانوں کی قلیل اُجرت، غلیظ مکان اور ان کے پیٹ بھر روٹی کو ترستے ہوئے بچوں کا حسرت ناک نظارہ کس نے نہیں دیکھا۔ لاہور کے کسی اسلامی محلے میں جا نکلو ایک تنگ و تاریک کوچے پر ہماری نظر پڑے گی جس کے وحشت زار سکوت کے طلسم کو رہ رہ کر یا تو لاغر، نیم برہنہ بچوں کی چیخ و پکار یا کسی پردہ نشین بڑھیا کی لجاجت آمیز صدا توڑتی ہوگی۔ جس کی سوکھی اور مرجھائی ہوئی انگلیاں برقع میں سے نکل کر خیرات کے لیے پھیلی ہوں گی۔"

(ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر)

اس عبارت سے عام مسلمانوں کی مالی بدحالی اور افلاس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پامالی کی پوری تصویر نہ صرف آنکھوں کے سامنے گھومتی ہے بلکہ حواس پر چھا جاتی ہے۔

اس طرح کی بیسیوں مثالیں دی جا سکتی ہیں جن سے اقبال کے نثری اسلوب کی خصوصیات واضح ہو سکتی ہیں لیکن اس وقت چونکہ ہمارے پیشِ نظر صرف اقبال کے خطوط ہیں لہٰذا مضامین اور مقالات کے اقتباسات سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ چند مثالیں بھی محض اس غرض سے دی گئیں تاکہ یہ بات واضح ہو سکے کہ اقبال سنجیدہ اور علمی موضوعات پر لکھتے ہوئے بھی شگفتگی اور شادابی پیدا کر سکتے تھے۔

لیکن یہ بات ان کے تمام مکاتیب کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ گو کچھ خطوط ایسے ضرور ہیں جن میں شگفتگی اور شادابی بھی پائی جاتی ہے اور رنگینی اور پرکاری بھی۔ اس طرح کے خطوط میں خاص طور پر وہ خط قابلِ ذکر ہیں جو اقبال نے گرامی کے نام لکھے ہیں۔ غلام قادر گرامی اپنے دور میں کلاسیکی فارسی کے ادا شناس ہی نہیں بلکہ خود بھی ایک خوش فکر اور خوش ذوق شاعر تھے۔ اس کے علاوہ انہیں یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ وہ اقبال کے بے تکلف دوست تھے۔ اقبال کے دوستوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا لیکن وہ ہر ایک سے بے تکلف نہیں ہوتے تھے۔ ان کی شخصیت کا وقار، ان کا تبحرِ علم اور فلسفیانہ مزاج ان کے اور ان کے احباب کے

درمیان ایک حجاب بن جاتا تھا لیکن گرامی اور اقبال کے درمیان اس طرح کا کوئی حجاب نہیں تھا۔ اقبال گرامی کو بڑے اصرار سے لاہور بلایا کرتے اور انہیں اپنے ہاں مہمان ٹھہرایا کرتے۔ اس دوران میں وہ گرامی کی نازبرداریاں بھی کرتے اور ان سے شعر و سخن کی پُر لطف باتیں بھی کرتے۔ گرامی جب حیدر آباد یا ہوشیار پور میں ہوتے تو انہیں پُر لطف خط لکھتے۔ یہ خطوط اقبال کے اکثر خطوط سے مختلف ہیں۔ یہ اپنے افکار کی تازگی و ندرتِ بیان کی پُر لطف سادگی اور شخصی خلوص کی کشش کے باعث نثر نگاری کے دلکش نمونے ہیں۔ دو ایک اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

"آپ کا تخلص گرامی کی جگہ نومی ہونا چاہیئے کیونکہ آپ سوتے بہت ہیں معلوم ہوتا ہے کہ راون لنکا بادشاہ کی طرح آپ چھ ماہ سوتے ہیں اور چھ ماہ جاگتے ہیں۔ حیدر آباد کی شاہی میں تبدیلی ہوئی۔ وزارت بدل گئی مگر ابھی آپ اونگھ رہے ہیں۔ برائے خدا کبھی اپنی خیریت سے مطلع کیا کرو۔ آپ کے بہت سے لاہوری دوست استفسار حال کرتے ہیں تو مجھے یہی جواب دینا پڑتا ہے کہ مولانا گرامی آرام میں ہیں۔ اکثر تو یہ کہتے ہیں کہ ان کو خط لکھ کے جگائیے مگر اس کے لیے شورِ محشر کی ضرورت ہے۔ خطوں سے کیا ہوتا ہے۔ ہمنام اقبال سلام قبول کریں۔ نیز ان سے درخواست ہے کہ مولوی گرامی یعنی شیخ نامی سے جس طرح بن پڑے خط لکھوائیں۔"

(۳ ستمبر ۱۹۱۲ء)

"آپ کہاں ہیں؟ حیدر آباد میں یا عدم آباد میں؟ اگر عدم آباد میں ہیں تو مجھے مطلع کیجئے کہ میں آپ کو تعزیت نامہ لکھوں۔"

(۱۳ جنوری ۱۹۱۴ء)

"آپ لکھتے ہیں کہ لاہور میں آن کے عرض کردوں گا۔ مگر اس پیشین گوئی کے لیے کہ گرامی لاہور کبھی نہ آئے گا کسی پیغمبر کی ضرورت نہیں۔ جالندھر اور ہوشیار پور کا شیر خوار بچہ بلا تامل ایسی پیشین گوئی کر سکتا ہے۔"

(۳۱ ستمبر ۱۹۱۷ء)

"گرامی سال خوردہ ہے یعنی سالوں اور برسوں کو کھا جاتا ہے۔ پھر بوڑھا کیونکر ہو سکتا ہے۔ بوڑھا تو وہ ہے جس کو سال اور برس کھا جائیں۔"

(۴ نومبر ۱۹۱۸ء)

مہاراجہ کشن پرشاد شاد کا نام اقبال کے مکاتیب بھی خاصے کی چیز ہیں۔ مہاراجہ صاحب دنیاوی جاہ و ثروت کے ساتھ ساتھ رُوحانی اقدار کے حامل تھے اور اقبال سے انہیں حد درجہ عقیدت و محبت تھی۔ اقبال کو بھی ان سے ایک گونہ تعلقِ خاطر تھا اور وہ شاد کا زبردست احترام کرتے تھے۔ یہ خطوط جن کی مجموعی تعداد اب ۹۹ تک پہنچی ہے، اسی تعلقِ خاطر اور احترام کے جذبے سے مملو ہیں۔ ان خطوط کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال نے یہ خط روا روی یا عجلت میں نہیں لکھے ہیں جیسا کہ عام طور پر ان کا شیوہ تھا بلکہ قلم روک کر لکھے ہیں۔ اسی وجہ سے ان خطوط کے اسلوب اور اقبال کے عام خطوط کے اسلوب میں ایک نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ ان میں کسی حد تک انشأ پردازی بھی ہے اور ان میں اچھی نثر کی دلآویزی اور رنگینی بھی ہے۔ چند اقتباسات دیکھئے:۔

"شاد کا نقش اقبال کے دل سے محو ہو، یہ کیونکر ممکن ہے؟ ایام میں ایک وصف دیرینہ سازی کا ہے یعنی زمانہ ابتدا و انتہا کی قیود سے آزاد ہے۔ اشیا کو اپنے ہاتھ کے لمس سے پرانا کر دیتا ہے۔ بحمد للہ کہ دل اس اثر سے متاثر ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ پھر شاد کی یاد ہمیشہ تازہ کیوں نہ رہے۔ اگرچہ خدا کے فضل و کرم سے ایسا بے نیاز دل رکھتا ہوں کہ خود اللہ میاں بھی اس پر رشک کریں، مگر کبھی کبھی یہ دل بھی افکارِ دنیا سے عاجز آ ہی جاتا ہے اور علائق کی زنجیروں کی جھنکار بیرونی اشیا کی طرف سے اسے عارضی طور پر غافل کر دیتی ہے۔" [1]

"انسان اپنی کمزوری کو چھپانے میں کس قدر طاق ہے، بے بسی کا نام صبر رکھتا ہے اور پھر اس صبر کو اپنی ہمت و استقلال کی طرف منسوب کرتا ہے۔ مگر اس حادثے نے میرے دل و دماغ میں ایک شدید تغیر پیدا کر دیا ہے۔ میرے لئے دنیا کے معاملات میں دلچسپی لینا اور دنیا میں بڑھنے کی خواہش کرنا صرف مرحوم کے دم سے وابستہ تھا۔ اب یہ حالت ہے کہ موت کا انتظار ہے۔ دنیا میں موت سب انسانوں تک پہنچتی ہے

لہ۔ صحیفہ، اقبال نمبر، ص ۱۱۳ (منقول از روح مکاتیب اقبال)

اور کبھی کبھی انسان بھی موت تک جا پہنچتا ہے۔ میرے قلب کی موجودہ کیفیت یہ ہے کہ وہ تو مجھ تک پہنچتی نہیں کسی طرح میں اس تک پہنچ جاؤں۔" لہ

"آپ آزادی کی تلاش میں حیدرآباد سے باہر جاتے ہیں، مگر آپ کو کوئی چھوڑے بھی ہم تو اسی خیال سے اپنے جذب دِل سے بھی کام نہیں لیتے کہ ایسا نہ ہو جذب دل کو شرمسار ہونا پڑے۔ پھول کانٹوں کے علائق سے گریزاں ہے مگر میں تو پھول سے ہمکنار ہوں۔" لہ

یہ خطوط حقائق و معارف کے آئینہ دار ہونے کے باوجود خشکی اور بے کیفی سے خالی ہیں۔ ان میں ایک طرح کے جذب انجذاب کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایسی ہی عبارتوں کو حکیمانہ نثر کا نام دیا ہے۔

اقبال نے خطوط کی صورت میں جو دو سفرنامے لکھے ہیں، ان میں اور بعض دوسرے خطوں میں بھی بیانیہ نثر کے کچھ بہت ہی اچھے نمونے ملتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مکاتیبِ اقبال کا بیشتر حصہ اس طرح کے اسلوب سے عاری ہے۔ ان کے بیشتر خطوط میں یا تو سوالات پوچھے گئے ہیں یا سوالات کے جواب دیئے گئے ہیں۔ ان خطوط کی اہمیت ان کے مندرجات کی وجہ سے ہے نہ کہ طرزِ تحریر کی وجہ سے۔ اور پھر یہ بات بھی ان کے بارے میں مسلّم ہے کہ ان میں سے بیشتر خطوط عجلت میں لکھے گئے ہیں۔ اقبال خود ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

"عدیم الفرصتی تحریر میں ایسا انداز پیدا کر دیتی ہے جسے پرائیویٹ خطوں میں تو معاف کر سکتے ہیں مگر اشاعت ان کی نظرِ ثانی کے بغیر نہ ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ میں پرائیویٹ خطوط کے طرزِ بیان میں خصوصیت کے ساتھ لاپروا ہوں۔" لہ

اقبال نے اپنی زندگی میں بلا مبالغہ ہزاروں کی تعداد میں خطوط لکھے ہوں گے۔ سینکڑوں لوگ انہیں خط لکھتے تھے اور بقول ممتاز حسن مرحوم مجھے کسی ایسے شخص کا علم نہیں جس نے اقبال کو خط

لہ، لہ صحیفہ، اقبال نمبر ص ۱۳۱، ۱۳۲ (منقول از روحِ مکاتیبِ اقبال) لہ مکاتیبِ اقبال ص ۲۳۰، ۲۳۱

لکھا ہو مگر جواب سے محروم رہا۔"[1] جواب دینے کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ اکثر خطوط کا جواب خط پڑھتے ہی دیتے تھے۔ ان کے اکثر خطوں میں اس طرح کے جملے ملتے ہیں۔ "ابھی ایک لمحہ پہلے آپ کا خط پہنچا" "آپ کا نوازش نامہ ابھی ابھی موصول ہوا" "کل آپ کا خط ملا" یہی وجہ ہے کہ اقبال کے خط عام طور پر مختصر ہیں اور بقول رفیع الدین ہاشمی "خط کے جواب میں تعجیل، متعدی اور اختصار کے درمیان گہرا ربط موجود ہے اور اس سے اقبال کا ایک خاص رجحان ظاہر ہوا ہے۔"[2]

عجیب بات یہ ہے کہ زندگی کے معمولات میں اقبال نہ متعد تھے اور نہ باقاعدہ ایسے شخص سے خطوط کے جواب میں متعدی، تعجیل اور باقاعدگی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ لیکن یہ بات واقعی حیرت انگیز ہے کہ اس معاملے میں وہ اپنے عام مزاج سے ہٹے ہوئے تھے خط کا جواب دینا وہ اسی طرح اپنا فریضہ سمجھتے تھے جس طرح سلام کا جواب دینا۔ یہ بات اُن کے مشرقی آداب سے وابستگی کی غماز ہے۔ لیکن ادائیگی فرض کے دوران میں بھی اپنی طبیعت کے ہاتھوں مجبور اور بے بس ہو جاتے ہیں اور اکثر خطوط اس طرح کے فقروں پر ختم کر دیتے تھے کہ "زیادہ کیا عرض کروں"۔ دراصل انسان کے بنیادی اوصاف اور رجحانات اس کے ہر کام پر کسی نہ کسی صورت میں اثرانداز ہوتے ہیں۔ اسی لئے اقبال خط کا جواب ادائیگی فرض سمجھ کر شروع تو کرتے ہیں لیکن طبعی تساہل پسندی، بے نیازی اور سہل انگاری اُن کے آڑے آتی ہے اور وہ جلد از جلد اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے اکثر خطوط اسی کش مکش کی صورت میں لکھے گئے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے بیشتر خطوط مختصر ہیں۔ اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"کئی دفعہ ارادہ کیا کہ آپ کی خدمت میں استدعا کروں کہ خط ذرا لمبا لکھا کیجئے۔ مگر میں خود لمبا خط لکھنے سے گھبراتا ہوں۔ پھر میرا کوئی حق نہیں کہ آپ کو لمبا خط لکھنے کی زحمت دوں۔"[3]

اسی طرح مرکاتیب سے یہ دو اقتباسات ملاحظہ ہوں :۔

۱۔ دیباچہ۔ لیٹرز اینڈ رائٹنگز آف اقبال، ص ۵ ۲۔ خطوط اقبال ص ۲۷ ۳۔ اقبال نامہ حصہ اول، ص ۳۹

"دوسرے سوال کا جواب بہت طویل ہے مگر افسوس کہ طویل خط لکھنے کی نہ ہمت ہے نہ خواہش۔" [1]

"آپ کے خط کا جواب حقیقت میں طویل ہے لیکن افسوس کہ میں طویل خط لکھنا تو درکنار معمولی خط و کتابت سے بھی قاصر ہوں۔" [2]

منشی سراج الدین اقبال کے ارادت مندوں میں سے تھے۔ ان کے ساتھ اقبال کی مراسلت اور مکاتبت کا سلسلہ شروع سے ہی قایم تھا۔ انہیں خط لکھتے ہیں اور غزل کے چند شعر بھی نقل کر دیتے ہیں۔ خط بھی کچھ ایسا طویل نہیں اور غزل بھی چند اشعار کی ہے لیکن خط کے آخر میں لکھتے ہیں:

"کاغذ ختم ہوگیا، دل بھی اکتا گیا۔ میں سمجھتا ہوں میں نے بڑی ہمت کی کہ اتنے اشعار نقل کر لئے اور آپ کو خط بھی لکھ دیا۔ الحمد للہ۔" [3]

واقعہ یہ ہے کہ اقبال طویل اور تفصیلی خط لکھنے سے گھبراتے تھے اور جیسا کہ پہلے بھی ذکر آیا ہے کہ ایک تو وہ خط عجلت میں لکھتے تھے اور خط لکھتے لکھتے جلد از جلد اس سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بعض اوقات ان سے الفاظ چھوٹ گئے ہیں۔ 'نے'، 'کو'، 'کا'، 'کی' جیسے الفاظ تو اکثر ان سے چھوٹ گئے ہیں۔ اسی طرح بہت سے خطوط میں تاریخ لکھنا بھی بھول گئے ہیں۔ کہیں تاریخ لکھ بھی دی ہے لیکن سن ندارد۔ کبھی خط کے شروع میں تاریخ لکھی ہے اور کبھی آخر میں۔

لیکن اس اختصار پسندی کے باعث اقبال کے قلم سے ایسے جملے بھی نکلے ہیں جو بظاہر مختصر ہیں لیکن جامعیت اور گہری معنویت کے اوصاف سے متصف ہیں۔ ان کی حیثیت بلند پایہ اقوال (QUOTABLE QUOTES) کی سی ہوگئی ہے اس طرح کے چند جملے ملاحظہ کیجئے:

"طاقت کا سرچشمہ فراست ہے۔" [4]

"حدود خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔" [5]

---

[1] اقبال نامہ حصہ دوئم ص ۳۲۹ [2]، [3]۔ اقبال نامہ حصہ اول، ص ۳۰۵، ۲۲+

[4]، [5]۔ اقبال نامہ، حصہ اول، ص ۴۴۵، ۲۰۲+

"مخلص مسلمان اپنے مصائب کو بھی خدا تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔" لہ

"اکثر انسانوں کو کنجِ تنہائی میں بیٹھے ہمہ دانی کا دھوکہ ہو جاتا ہے۔ ان کا قصور نہیں فطرت انسانی ہی اس قسم کی ہے۔" لہ

"زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے۔" سہ

"کاغذ کے نقوش بے جان سے الفاظ کی آواز زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ کاغذ جذباتِ انسانی کی حرارت کا کب متحمل ہوتا ہے اور کئی امور ایسے بھی تو ہوتے ہیں جن کا ضبط تحریر میں لانا مناسب نہیں ہوتا۔" سکہ

اقبال کے خطوط جو نسبتاً مفصل ہیں دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو قطعی ذاتی اور خالص پرائیویٹ نوعیت کے ہیں ان میں سے چند ایک عطیہ بیگم فیضی کے نام ہیں، یا پھر وہ خطوط ہیں جن میں اقبال نے بعض علمی نکات و معارف پر بحث کی ہے اپنے افکار اور اپنے کلام کی تشریح کی ہے یا پھر اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ اس طرح کے خطوط سید سلیمان ندوی، حسن نظامی، سراج الدین پال، نیاز الدین خان اور مولانا گرامی کے نام ہیں۔

اقبال کے مکاتیب کا اسلوب ان کی دیگر نثری تحریروں کے اسلوب سے اس لئے بھی مختلف ہے کہ مضامین لکھتے وقت وہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ زبان و بیان میں کہیں کوئی سقم نہ رہنے پائے۔ انہیں اپنے اہلِ زبان نہ ہونے کا بھی احساس تھا، اس وجہ سے وہ اس سلسلے میں زیادہ ہی چوکنے رہتے۔ لیکن گفتگو یا خطوط میں وہ اس طرح کی احتیاط نہیں برتتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ گفتگو اور خطوط میں وہ بے تکلف انگریزی الفاظ بھی استعمال کرتے تھے جبکہ مضامین وغیرہ میں اگر کسی وقت کسی انگریزی لفظ کا استعمال ناگزیر سمجھتے تو اس کے ساتھ ہی قوسین میں اس کا اردو متبادل لفظ بھی لکھتے تھے۔ وہ تحریر اور گفتگو کی زبان کا فرق سمجھتے تھے اور اس فرق کو ہمیشہ ملحوظِ نظر رکھتے تھے لیکن خطوط میں وہ اس طرح کا التزام نہیں برتتے تھے۔ ان کے خطوط ایک طرح سے ان کی گفتگو کا ہی حصہ ہیں۔ چنانچہ اردو میں گفتگو کے بارے میں جب وہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو لکھتے ہیں کہ:۔

لہ۔ انوارِ اقبال، حصہ اول ص ۲، لہ، سہ، ـــ اقبال نامہ، حصہ اول، ص ۱۱، ۵۶، ۲۰
سکہ۔ اقبال نامہ، حصہ دوم۔ ص ۳۴۲۔

"اردو میں گفتگو کرتے ہوئے میں اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا۔"[1]

تو یہ بات ان کے خطوط پر بھی صادق آتی ہے۔ دراصل حقیقت یہی ہے کہ اردو ان کی اکتسابی زبان تھی اور یہی وجہ ہے کہ اردو زبان پر زبردست قدرت اور گرفت رکھنے کے باوصف بھی وہ اردو کے روزمرہ اور محاورہ کا استعمال فطرتاً اور طبعاً نہیں کر سکتے تھے۔ اچھی گفتگو میں ان کا استعمال لازمی ہوتا ہے۔ یہی حال خطوط کا بھی ہے۔ ان میں گفتگو کی طرح روزمرہ اور محاورے کا مناسب استعمال ان کی بنیادی خصوصیات کو جلا بخشتا ہے۔ اقبال کی علمی اور فلسفیانہ تحریریں ان کے مکاتیب کے مقابلے میں زیادہ کامیاب اسلوب کی حامل ہیں کیونکہ اس قسم کی علمی تحریروں میں روزمرے اور محاورے کا استعمال نہ لازمی ہوتا ہے اور نہ مناسب۔

اقبال کی تحریروں میں عام طور پر اور مکاتیب میں خصوصاً ایک بات جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ان کا منطقی اور استدلالی انداز بیان ہے۔ یہ استدلالی انداز بیان جہاں ان کے سلجھے ہوئے ذہن اور فکر کا آئینہ دار ہے وہاں ان کی تعلیم و تربیت کا غماز بھی ہے۔ فلسفے اور قانون کے مطالعہ نے انہیں اپنے خیالات کو ایک خاص ترتیب اور استدلال کے ساتھ پیش کرنے کا سلیقہ بخشا تھا۔ چنانچہ مکاتیب میں بھی یہ استدلالی اسلوب بیان پوری طرح سے جلوہ گر ہے۔ اور اس انداز بیان کی وجہ سے مکتوب الیہ کو اقبال کے نقطۂ نظر کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔

مکاتیب کے اسلوب کا یہ جائزہ میں پروفیسر آل احمد سرور کے ایک اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔ اقبال کے مکاتیب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:-

"ان خطوط کی خالص انشا یا اسلوب کے لحاظ سے بہت بڑی اہمیت نہیں ہے۔ اس لحاظ سے یہ غالب کے خطوط کے برابر نہیں ہیں مگر ان سے غالب کے خطوں سے کم معلومات شاعر کے متعلق نہیں ملتیں۔ اور یہ ان کے صاف واضح اور آئینہ کی طرح روشن ذہن کی اچھی تصویریں ہیں۔ اقبال کے ذہن میں کوئی بات مبہم نہ تھی۔ ان کے ذہن میں دھندلکا یا سایہ کہیں نہیں۔ ان کی علمیت غالباً اردو شاعری میں بے نظیر ہے۔ اردو و فارسی پر انہیں ہر طرح عبور تھا مگر انہوں نے عربی بھی پڑھی تھی اور انگریزی اور جرمنی سے بھی گہرا استفادہ کیا تھا۔ احمد شفیع کے نام جو خط

---

[1] اقبال نامہ، حصہ اول، ص ۷۰۴۔

ہے' اس میں قدیم و جدید فلسفوں سے ان کی واقفیت کا ثبوت ملتا ہے۔ اس علمیت سے بھی ان میں خشکی پیدا نہ ہونے پائی۔ اقبال ان خطوں میں کہیں چیختے چلاتے نہیں' نہ روتے بسورتے ہیں۔ نہ زور سے قہقہے لگاتے ہیں۔ ایک متوازن پرعظمت باوقار دھارا ہے کہ برابر بہتا جاتا ہے۔ ان کی محبت کے اظہار کا طریقہ بھی عام لوگوں سے مختلف اور مدھم ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ اقبال کے یہاں وہ سپردگی' والہانہ کیفیت' وہ جنون' وہ جوش نہیں جو سچے شاعروں میں ہوتا ہے' اس کے جواب کے لیے ان کی شاعری کافی ہے' یہ خط مجنوں کی ڈائری' نہیں ہیں جو کسی لیلیٰ کے خطوط کے جواب میں لکھے گئے ہوں۔ یہ ایک شریف انسان کے آڑے ترچھے نقوش ہیں جو اس نے اپنے خیالات کی وضاحت کے لیے دوسرے شرفا کو لکھے ہیں۔ اقبال کے کلام کی سب سے اچھی شرح ان کی خطوط ہیں۔

ان کی دلچسپی' شوخی' رنگینی' ظرافت' ادب میں نہیں' ان خیالات کی اہمیت اور عظمت میں مضمر ہے۔ ان میں سچے اور پوری طرح محسوس کئے ہوئے خیالوں کا حسن ہے جسے کسی اور حسن کی ضرورت نہیں۔"[1]

---

[1] اقبال کے خطوط۔ پروفیسر آل احمد سرور (مشمولہ اقبال اور اُن کا فلسفہ) ص ۱۱۸ - ۱۱۹ء

ضمیمے

ضمیمہ (ک)

نو دریافت خطوط

اس وقت تک اقبال کے خطوط کے دس مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں خطوط کی مجموعی تعداد ساڑھے بارہ سو (۱۲۵۰) کے لگ بھگ پہنچ چکی ہے اور اس تعداد میں آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اقبال کے خطوط کی تلاش اور دستیابی کا سلسلہ جاری ہے۔ چنانچہ ان مجموعوں کے علاوہ خطوط کی خاصی تعداد متفرق اخبارات اور رسائل میں بھی شائع ہوئی ہے۔ جو ابھی تک کسی علاحدہ مجموعے کی صورت میں جمع نہیں ہوئے ہیں۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے نام اقبال کے پچاس (۵۰) خط "شاد اقبال" مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور میں شامل نہیں ہیں۔ پروفیسر محمد عبد اللہ قریشی نے مرتب کر کے "صحیفہ" لاہور کے اقبال نمبر حصہ اول ۱۹۷۳ء میں شائع کرائے اسی طرح ابھی حال ہی میں مس ویگیناست کے نام اقبال کے ۷ خطوط ماہنامہ "افکار" کراچی مئی ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئے ہیں۔ راغب حسن کے نام اقبال کے تین (۳) خط روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ میں شائع ہوئے ہیں۔ "دہلی الفاظ" علی گڑھ میں بھی اقبال کے دو (۲) ایسے خط شائع ہوئے ہیں جو اس سے قبل کہیں اور شائع نہیں ہوئے ہیں۔ غرض یہ سلسلہ جاری ہے۔

اس ضمیمے میں اقبال کے وہ خط شامل کئے گئے ہیں جو اب تک مجموعے کی صورت میں شائع نہیں ہو سکے

ہیں۔ البتہ ان میں شاد کے نام وہ خطوط شامل نہیں کئے گئے ہیں جو صحیفہ کراچی (۱۹۸۳ء) میں شائع ہوئے ہیں۔ صحیفہ کا یہ شمارہ دستیاب نہیں ہو سکا اور ویسے بھی ان کی تلخیص "روحِ مکاتیبِ اقبال" مرتبہ محمد عبداللہ قریشی میں آچکی ہے۔ نو دریافت خطوط میں خطوط کی کل تعداد ۳۴ ہے۔ ان خطوط کے ساتھ ساتھ ہر خط سے پہلے خط کا پس منظر اور مکتوب الیہ کے کوائف جہاں تک معلوم ہو سکے، درج کئے گئے ہیں۔

۱۹۳۰ء میں جب پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت کی مدت ختم ہوئی اور از سر نو انتخابات کا مرحلہ سامنے آیا تو اس مرتبہ اقبال نے کسی وجہ سے یہ طے کیا کہ انبالہ سے کاغذات نامزدگی داخل کرائیں۔ اس کے لیے انہوں نے میر غلام بھیک نیرنگ سے خط و کتابت کی۔ میر نیرنگ نے مشورہ دیا کہ اس سلسلے میں سید محمد حنیف ایڈوکیٹ سے رابطہ قائم کیا جائے۔ سید محمد حنیف میر نیرنگ کے قابل اعتماد دوستوں میں سے تھے اور انبالہ کے مسلمانوں میں بڑی قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اقبال نے میر نیرنگ کی تجویز پر انہیں خط لکھا۔ یہ خط اپنے تاریخی پس منظر کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ سید محمد حنیف نے جواب میں کیا لکھا یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ خط اقبال ریویو جنوری ۱۹۸۲ء کے شمارے میں رحیم بخش شاہین کی وساطت سے شائع ہوا ہے (ص ۵۴ - ۵۵)۔

۱- لاہور ۲۱ جولائی ۱۹۳۰ء

ڈیر مسٹر محمد حنیف، السلام علیکم!

میر غلام بھیک نیرنگ کو میں نے آپ کے حلقے اور آئندہ انتخابات کے متعلق لکھا تھا۔ ان کا خط چند روز ہوئے مجھے آیا تھا جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ انہوں نے آپ کو اپنے خیالات سے آگاہ کر دیا ہے کہ میں مزید خط و کتابت آپ سے کروں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ آپ کے احباب و معاونین نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ اگر میر صاحب یا آپ کی جماعت میں سے کوئی اور صاحب کھڑے ہوں تو بڑی خوشی کی بات ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو مہربانی کر کے اپنی جماعت کے فیصلے سے مجھے آگاہ فرمائیں کہ صورت حال کیا ہے۔ اور آپ کے حلقے کی طرف سے کون کون سے امیدوار کھڑے ہوں گے۔ امید کہ آپ کا مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ والسلام۔

مخلص۔ محمد اقبال

عبدالرحمٰن بجنوری کے نام اقبال کا کوئی خط آج تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔ گو اقبال اور بجنوری نہ صرف یہ کہ ہم عصر تھے بلکہ دونوں ایک دوسرے کی صلاحیتوں کے قایل بھی تھے۔ بجنوری نے اقبال کی دو مثنویوں اسرار خودی اور رموز بے خودی پر انگریزی میں ایک ریویو لکھا تھا جو رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ میں شائع بھی ہو گیا تھا۔ اقبال نے اس تبصرے کو پسند کیا اور اکبر الہ آبادی اور خان محمد نیاز الدین کے نام اپنے خطوط میں (۴ ستمبر ۱۹۱۸ء اور ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۸ء) اس تبصرے کا ذکر کیا ہے۔

عبدالرحمٰن بجنوری ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے تھے اور صرف تینتیس ۳۳ برس کی عمر میں ۱۹۱۸ء میں انتقال کیا۔ کم عمری کے باوجود بھی اردو ادب میں بقائے دوام کا سروسامان کر گئے۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ وہ مقدمہ ہے جو انہوں نے غالب کے غیر متداول دیوان (نسخہ حمیدیہ) پر لکھا تھا اور بعد کو محاسن کلام غالب کے نام سے شائع ہوا۔

مندرجہ ذیل دو خط جو اقبال نے عبدالرحمٰن بجنوری کی وفات کے بعد لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک خط شعیب قریشی ایڈیٹر کامریڈ کے نام ہے جس میں بجنوری کی وفات پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے دوسرا خط بجنوری کے والد مولوی نورالاسلام صاحب کے نام لکھا ہے جس میں مرحوم کے لوح مزار کے لیے ایک رباعی لکھی ہے۔

یہ خطوط پہلی بار دو ماہی "الفاظ" علی گڑھ کے جنوری، فروری ۱۹۸۰ء کے شمارے میں عبدالرحمٰن بجنوری کے ایک عزیز جناب قاسم صدیقی کی وساطت سے شایع ہوئے۔ ان دونوں خطوط کی عکسی نقول بھی رسالہ مذکور میں شایع ہوئی ہیں۔

۲۔ لاہور۔ ۸ نومبر ۱۹۱۸ء

ڈیئر مسٹر شعیب۔ السلام علیکم!

کل شام آپ کے تار نے خرمن صبر و قرار پر بجلی گرا دی۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ افسوس کہ گذشتہ پچاس ساٹھ سال کی تعلیمی کش مکش کے بعد ایک آدمی ہم میں پیدا ہوا تھا جو دل و دماغ اور بصیرت کے اعتبار سے قدیم حکماء اسلام کے نمونہ تھا۔ مگر مشیت ایزدی نے اسے ہم سے چھین لیا۔ اس

پیدا ہ یا عجیب کہ اس کی سخت ضرورت تھی۔ شاید مرحوم اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوا تھا یا جس سوسائٹی میں اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا تھا وہ اس کی قدر نہ پہچان سکتی تھی۔ ہندوستان کے اسلامی دنیا میں بہت کم ایسے آدمی ہوں گے جن کی جینیس کی پوشیدہ قوتوں کا احساس ہوگا اور کیا عجب کہ مرحوم کو خود بھی ان قوتوں کا احساس نہ ہو لیکن اگر وہ دس سال ہم میں اور رہتا تو آنکھیں اس کے کمالات کی آب و تاب سے تیرہ ہو جاتیں۔ ہم مسلمان ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر سر تسلیم خم کرنے والے ہیں لیکن وہ ہمیں میں سے ایک تھا جس نے یہ کہا تھا کہ اِنَّمَا اَشکُو بَثّیِ وَحُزنِی اِلَی اللّٰہ۔ پس ہم بھی اپنی بربادی کا رونا اسی کے سامنے پیش کریں گے۔ اس کی تقدیر سے کس کو مفر ہے؟ پھر کیوں ہم اپنے مصائب و آلام کو اس کے قرب کا ذریعہ نہ بنائیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اور اپنے حبیب پاک ؐ کے دربار کی حاضری نصیب کرے۔

آہ! ملت اسلامیہ بدنصیب ہے! ہر طرف بربادی و تباہی کے آثار ہیں مگر کیا یہ ویرانی کسی تازہ تعمیر کا پیش خیمہ ہے۔

ہر بنائے کہنہ کآبادان کنند ... نے کہ اول کہنہ را ویران کنند[1]

مرحوم کے اعزا اقربا کی خدمت میں میری طرف سے دلی ہمدردی کا پیغام بھیجئے اور مجھے ان کا پتہ تحریر فرمائیے کہ میں خود بھی انہیں لکھوں۔

مخلص
محمد اقبال۔ لاہور

۲۔ مخدومی، السلام علیکم!

میری رائے میں ڈاکٹر عبد الرحمٰن مرحوم کے مزار پر مندرجہ رباعی بطور کتبے کی لکھنی چاہیئے۔

دل من راز دان جسم و جان است ... نہ پنداری اجل بر من گران است
چہ غم گر یک جہان گم شد ز چشمم ... ہنوز اندر ضمیرم صد جہان است

مخلص۔ محمد اقبال، لاہور، ۲ ستمبر ۱۹۲۰ء

---

[1] رومی کے اس شعر کا دوسرا مصرعہ اس طرح ہے۔ اول آن بنیاد را ویران کنند۔

جناب راغب احسن صاحب کے نام اقبال نامہ جلد دوم (ص ۲۵۱-۲۵۲) میں ایک خط ۲۸ مئی ۱۹۳۱ء کا چھپ چکا تھا۔ یہی ایک خط ان کے نام کا ابھی تک دستیاب ہو سکا تھا۔ گو یہ بات معلوم تھی کہ اُن کے تعلقات اقبال کے ساتھ خاصے استوار تھے اس بات کی شہادت سید نذیر نیازی کے نام بھوپال سے لکھے گئے ۴ مارچ ۱۹۳۵ء سے بھی ملتی تھی تاہم ان کے نام صرف ایک ہی خط ملا تھا۔ جس کا ذکر آ گیا ہے۔ اب اخبار قومی آواز، لکھنؤ (۴ مئی ۱۹۸۲ء) میں جناب محمد فرید الحق کے شکریے کے ساتھ تین اور خط شائع ہو چکے ہیں اور ساتھ میں اصل خطوط کی عکسی نقول بھی چھپ گئے ہیں۔ ان میں سے ایک خط ۱۹۳۳ء کا ہے اور دو خطوط ۱۹۳۴ء کے ہیں۔ ان خطوط سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ راغب احسن کے نام اقبال نے کچھ اور خطوط بھی لکھے ہوں گے جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آ سکے ہیں[1]۔

راغب احسن صاحب کلکتہ کے ایک جرنلسٹ تھے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاست سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اقبال کے معتقدین میں ان کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ نو دریافت خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال ان کی قابلیت اور صلاحیت سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان کی قدر بھی کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۔ اگست ۱۹۳۴ء کے خط میں اقبال نے انہیں انجمن حمایت اسلام لاہور کی طرف سے نکلنے والے ایک اردو اخبار کی ادارت کی پیش کش بھی کی تھی۔ خطوط کی نقل درج ذیل ہے:۔

۴۔ ۸، اپریل ۱۹۳۳ء

ڈیر راغب احسن صاحب، السلام علیکم!

آپ کا خط ابھی ملا ہے جس میں محمد عثمان خان صاحب کا خط بھی ملفوف تھا۔ سرٹیفکیٹ مطلوبہ مرسل ہے، مگر محمد عثمان خان صاحب کے متعلق مجھے کچھ حالات معلوم نہیں۔ نہ اُن کی کوئی تحریر میری نظر سے گذری ہے۔ آپ ان سے کہیں کہ وہ خود کوئی سرٹیفکیٹ لکھ کر بھیجدیں۔ میں اس پر دستخط کر کے بھیجدوں گا یا آپ ان کے لیے لکھ دیں۔ میں آپ کے لکھے ہوئے پر دستخط کر دوں گا۔ کوائف ان کی تعلیم وغیرہ کے متعلق جانتے ہیں۔

محمد اقبال

[1] جہان دیگر، کے نام سے محمد فرید الحق نے راغب احسن کے نام یہ سارے خط اب شائع کر دیئے ہیں۔

میں آج صبح دہلی سے واپس آیا۔ آپ کا خط مجھے نہیں ملا یعنی وہ خط جو آپ نے دہلی کے پتہ پر لکھا تھا۔

۵۔ لاہور ۱۹ اگست ۱۹۳۴ء

ڈیر راغب صاحب، السلام علیکم!

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ میں ابھی تک علیل ہوں اگرچہ عام صحت رو بہ ترقی ہے تاہم آواز میں ابھی کشائش نہیں ہوئی۔ حکیم نابینا صاحب کا علاج ہے، وہ صحتِ آواز کا یقین دلاتے ہیں مگر چوں کہ بیماری پرانی ہے۔ اس واسطے کچھ مدت بعد کامل صحت ہوگی۔ مرتضیٰ صاحب اور آپ کے خیال بالکل درست ہیں مگر میں ایک تو بولنے سے قاصر دوسرا آپ خود سمجھتے ہیں کہ اس بات کو خواہ اس کے تہہ میں کتنی ہی دردمندی کیوں نہ ہو ذاتیات پر محمول سمجھا جائے گا۔ میں اس بات میں بڑا حساس ہوں اور اس قسم کا الزام میرے لئے دوزخ کی آگ کے برابر ہے۔ مرتضیٰ صاحب کی خدمت میں میری طرف سے سلام کہیئے اور ان کو میرا یہ خط دکھا دیجئے۔ اگرچہ اس وقت تک ان کا کوئی خط میرے پاس نہیں آیا تاہم جو خط دو لکھنے والے ہیں اس خط کو اس کا جواب تصور فرما کر ان کو پڑھا دیجئے۔ میں خود ان سیاسی مسلمانوں کے ہاتھ سے بہت نالاں ہوں اس واسطے نہیں کہ ہر موقعہ پر انہوں نے میری مخالفت کی ہے بلکہ اس واسطے کہ اس کیرکٹر اور بصیرت کے لوگ مسلمانوں میں کیوں پیدا ہوئے۔ زیادہ کیا لکھوں سوائے اس کے کہ آپ میرے لئے دعا کریں۔ اُمید نہیں کہ شملہ آسکوں۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ مولوی شفیع داؤدی شملہ میں ہیں یا کہیں اور، نیز یہ کہ وہ مجھ سے ملنے کے لیے (اگر میں شملہ نہ آیا تو) لاہور میں آسکیں گے یا نہیں۔

معلوم نہیں آپ کا شملہ میں کیا شغل ہے۔ کیا آپ انجمن حمایت اسلام لاہور کے ہفتہ وار اخبار کی جو اردو میں نکلتا ہے ادارت اپنے ذمے لے سکیں گے۔ ممکن ہے انجمن کوئی مزید ڈیوٹی آپ کو دے کر تنخواہ تقریباً ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے آپ کو دے سکے۔ اگر ایسا ہو سکتا ہو تو مجھے مطلع کیجئے۔ آپ کی ادارت سے اخبار کو بہت فائدہ پہنچنے کی اُمید ہے۔ بہت سے امور ہیں جو خطوط میں نہیں لکھے جا سکتے۔

محمد اقبال

۶۔ لاہور، ۱۱ دسمبر ۱۹۳۴ء

ڈیر راغب صاحب! السلام علیکم!

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ اس سے پہلے میں آپ کے جواب میں ایک خط لکھ چکا ہوں۔ اس بحث میں جو کچھ میرے خیالات ہیں ان کا اظہار میں جاوید نامہ میں کر چکا ہوں، اس کو غور سے پڑھئے۔ آپ کے خیالات اجمالاً درست ہیں مفصل گفتگو جب آپ سے ملاقات ہوگی تو ان شاء اللہ اس وقت ہوگی۔ مولوی صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے بالکل درست ہے۔ قرآن میں تو ارض کے متعلق کئی جگہ آیا ہے۔ الارض للہ۔ اور حضرت آدمؑ سے بھی یہی کہا گیا کہ ہمارے لئے ارض مستقر اور متاع یعنی فائدے کی چیز ہے۔ اسلام کے نزدیک ملکیت صرف اللہ کی ہے۔ مسلمان صرف اس چیز کا امین ہے جو اس کے سپرد کی گئی ہے۔ میری رائے میں اگر کوئی مسلمان اپنی پرائیویٹ زمین وغیرہ کا غلط استعمال کرے تو حاکمیت اسلامیہ کا حق ہے کہ وہ اس سے باز پرس کرے۔ یہی وہ نکتہ ہے اسلام کا جس کو یورپ میں مسولینی نے خوب سمجھا ہے۔

غالباً امام محمد یا ابو یوسف سے خلفائے عباسیہ میں سے کسی نے فتویٰ زمین کی ملکیت کے متعلق طلب کیا تھا تو انہوں نے یہ فرمایا تھا کہ زمین اس کی ملکیت ہے جو اس کو زندہ رکھ سکے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ زمین کا مالک امام کے نزدیک وہی ہے جو حقیقت میں اپنی محنت سے اسے کاشت کرتا ہے۔ نہ وہ شخص کہ گھر میں میٹھا بنائی لیتا ہے۔ حضور رسالتمآبؐ نے حیوانوں پر بھی شفقت کی ہے اور حکم دیا ہے۔ المرعیٰ للہ و رسولہ یعنی چراگاہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی ملکیت ہیں کسی شخص کی پرائیویٹ ملکیت نہیں ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس بعض احادیث میں دو منزلہ مکان بنانے سے بھی منع فرمایا ہے۔ غرضیکہ اس معاملے میں مفصل بحث اور ریسرچ کی بھی ضرورت ہے۔ اس پر آج تک کسی نے نہیں لکھا۔ مسلمان علماء اپنی غفلت سے اسلامی عقائد پر بحث و مباحثے کرتے رہے اور اسلام کے معاشرتی نظام کی طرف کسی نے (شاید سوائے شاہ ولی اللہ کے) توجہ نہیں کی۔ اب اس زمانے میں معاشرتی نظام اسلام کی تفصیلات کی ضرورت ہے کیونکہ لوگ موجودہ زمانے کے اقتصادی سوالات کی وجہ سے عقائد مابعد الطبعیین میں دلچسپی نہیں لیتے۔ بحیثیت مذہب کے اسلام کی کامیابی کا دارومدار اس پر ہے کہ اس کے معاشرتی نظام کی افضلیت زمانہ حال کے نظاموں پر ثابت کی جائے۔ یورپ اور اسلام کی رقابت

ہمیشہ رہی ہے مگر اس سے پہلے اس کا انتہائی نقطہ حروب صلیبیہ تھا۔ اب یورپ اور اسلام کی جنگ تلوار وں کی نہیں بلکہ معاشرت کے تقاضوں کی ہوگی۔ یعنی فسطائیت، بولشویزم اور اسلام دماغی PLANE پر معرکہ آرا ہوں گے۔ مسلمانوں میں تو اس وقت اس مطلب کے آدمی تو موجود نہیں۔ کیا عجب کہ یورپ کے مفکر خود اس نظام کا اکتشاف کرلیں کہ یہ امر مشکل بہت ہے کیونکہ مذہب اسلام پر قرون اول سے ہی مجوسیت اور یہودیت غالب آگئی یعنی اسلام کے اصلی افکار کو یہودی اور مجوسی افکار نے عوام کی نگاہوں سے چھپالیا۔ میری رائے ناقص میں اسلام آج تک بے نقاب نہیں ہوا۔ افسوس کہ علالت کی وجہ سے میں آپ کو طویل خط نہیں لکھ سکتا۔ جو کچھ میں نے لکھا ہے بعض اشارات ہیں۔ ان کی تفصیل اگر آپ سامنے ہوتے تو زبانی عرض کرتا۔ جاوید نامہ کے متعدد مقامات پر اس مسئلے کے مختلف پہلو آئے ہیں۔ اس کو شروع سے آخر تک پھر پڑھئے ہر طرح آپ کی آگاہی کے لیے یہ بھی لکھ دیتا ہوں کہ قرآن نے تقسیم جائیداد کے متعلق جو قاعدہ دیا ہے اس کا اطلاق (میری رائے ناقص میں) زمین پر نہیں ہوتا۔ یہ قاعدہ صرف جائیداد منقولہ کے لیے ہے مگر علماء کی رائے مختلف ہے اور مسلمانوں کی پریکٹس بھی جیسا کہ آپ کو معلوم ہے مختلف ہے۔

محمد اقبال

سید خلیل احمد صاحب دہلی کے ایک رئیس زادے ہیں جو کسی زمانے میں اینگلو عربک کالج اور ڈیبیٹنگ سوسائٹی کے وائس پریذیڈنٹ تھے۔ اس سوسائٹی کی طرف سے ۱۹۳۵ء میں غالب ڈے منایا گیا تھا جس میں سر آغا خان نے غالب کی تصویر کی نقاب کشائی کی تھی۔ سید خلیل احمد صاحب نے اس تقریب پر ہونے والے مشاعرے کی صدارت کے لیے اقبال کو دعوت دی تھی لیکن علالت کے باعث اقبال نے معذرت کا خط لکھا۔ جو سید خلیل احمد صاحب کے پاس موجود ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خان نے ان سے اس خط کی فوٹو کاپی حاصل کرکے اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی کے مجلہ اقبال نمبر ۲ میں اپنے تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع کرایا۔ سید خلیل احمد صاحب نے اس سلسلے میں جو خط پروفیسر مسعود حسین خان صاحب کو لکھا، اس میں وہ فرماتے ہیں کہ اس خط کے آنے کے بعد بھی ان کی اقبال سے خط و کتابت جاری رہی اور کچھ اور خط بھی ان کے پاس ہیں لیکن جس فائل میں یہ خط ہیں، وہ فائل انہیں ابھی تک نہیں مل سکی ہے۔ اقبال کا خط اس طرح ہے:۔

۷۔ لاہور ۲۹ اکتوبر ۱۹۳۵ء

جنابِ من - آپ کا نوازش نامہ مجھے آج ہی ملا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں - میں قریباً دو سال سے علیل ہوں گلے کی بیماری ہے جس کی وجہ سے میں کسی قسم کی تقریر نہیں کرسکتا - میں اس رسم کو ادا کرنا اپنے لیئے سرمایہ افتخار جانتا ہوں مگر افسوس کہ علالت کی وجہ سے ایسا کرنا میرے لئے ناممکن ہے - میں آپ کی سوسائٹی کو غالب کی قدر شناسی پر مبارکباد کہتا ہوں۔

محمد اقبال

ڈاکٹر سعید اختر درانی کے توسط سے مس ویگناسیت کے نام اقبال کے ستائیس ۲۷ خطوط پہلی بار ماہنامہ افکار کراچی (شمارہ ۱۵۸ بابت مئی ۱۹۸۳ء) میں شائع ہوئے - ان خطوط کی کھوج ممتاز حسن مرحوم اور امان اللہ ہوبوہم (سفارت خانہ المانیہ لندن) نے ۱۹۵۹ء میں نکالا تھا - مس ویگناسیت نے یہ خطوط ۱۹۶۰ء کی دہائی کے اوائل میں امان اللہ ہوبوہم کے سپرد کئے تھے - ان خطوط کی مکتوب الیہا، ہائیڈل برگ جرمنی میں اقبال کے مختصر قیام (جولائی ۱۹۰۷ء تا اکتوبر ۱۹۰۷ء) کے دوران میں ان کی جرمن زبان کی اتالیق مس ایما ویگناسٹ (FRAULEIN EMMA WEGENAST) تھیں جن کا ذکر عطیہ بیگم فیضی نے اپنی کتاب 'IQBAL'S LETTERS TO ATTIYA BEGUM' میں کیا ہے۔

ان ستائیس ۲۷ خطوط میں پہلے سترہ ۱۷ خط جرمن زبان میں ہیں اور آخری دس خط انگریزی میں ہیں۔ اردو میں ان کا ترجمہ ڈاکٹر سعید اختر درانی نے کیا ہے - ان خطوط میں سے صرف ایک خط (۱۶ نومبر ۱۹۰۷ء) درج مکاتیبِ اقبال مرتبہ محمد عبداللہ قریشی میں شامل ہے - باقی چھبیس ۲۶ خط پہلی بار شائع ہوئے ہیں - ان خطوط پر ہم نے اس مقالے کے دوسرے باب کے آخر میں مفصل بحث کی ہے۔

۸۔ اقامت خانہ تھرمز
ام شلینگ سٹراسے میونخ
۱۶۔ اکتوبر ۱۹۰۷ء

عزیزہ من فرائیلائین ویگناسٹ۔

مجھے آپ کا کارڈ مل گیا ہے۔ یہ بات قابل افسوس ہے کہ جرمن زبان سے میری محدود واقفیت ہمارے درمیان ایک دیوار کی طرح ایستادہ ہے۔

اگر میرے خطوط مختصر ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ میرے پاس لکھنے کو کچھ نہیں ہے بلکہ یہ کہ میرا ذریعہ اظہار ناقص ہے۔ مزید برآں میں نہیں چاہتا کہ اپنی ٹوٹی پھوٹی جرمن سے آپ کی طبیعت خراب کروں لیکن یہ رکاوٹ آپ کے لیے موجود نہیں۔ چنانچہ مجھے آپ سے مکمل اظہار کی امید ہے۔

میں نے اخبار میں ایک اشتہار دے دیا ہے کہ مجھے ایک اچھی اُستانی کی ضرورت ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ ہائیڈل برگ کے قیام کے دَوران میں نے جرمن لکھنے کی مشق نہ کی۔ یہ وہ پہلی تحریر ہے جو میں اس زبان میں لکھ رہا ہوں۔

خزاں کی دھیمی اور نرم آگ دہوا بڑی خوشگوار ہے۔ موسم بڑا خوبصورت ہے لیکن افسوس کہ ہر حسین چیز کی طرح اس کو بھی دوام نہیں۔

براہِ کرم جلد خط لکھیے۔

خدا حافظ

آپ کا دوست

ایس۔ ایم اقبال (جرمن سے)

۹۔ اقامت خانہ تھرفر
اہم شیلنگ سٹراسے میونخ
۲۳ اکتوبر ۱۹۰۷ء

عزیزہ من فرائیلائین ویگیناست۔

یہ آپ کا بڑا کرم تھا کہ آپ نے (خط[1]) لکھا لیکن بہت مختصر میں اس وقت تک آپ کو نہیں لکھوں گا جب تک آپ مجھے وہ خط نہیں بھیجیں جو آپ نے پھاڑ ڈالا ہے۔ یہ بڑی بے رحمی ہے۔ آپ ہائیڈل برگ میں تو ایسی نہیں تھی۔ شاید ہائیل برون (HEIL BRON) کی آب و ہوا نے آپ کو بے مہر بنا دیا ہے۔

---

[1]۔ اقبال ان خطوط میں عموماً اسی طرح تحریر کرتے ہیں میں نے ترجمے میں خط کا اظہار کیا ہے (سعید اختر درانی)

میں زیادہ لکھنا چاہتا تھا مگر...... وہ خط۔ آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میرا خط پھاڑ ڈالیں۔[1]

آپ کا بہت مخلص[2]

ایس۔ ایم اقبال

نوٹ:۔ لفافے پر یہ پتا لکھا ہے:۔

ٹکٹ پر میونخ کی مہر ہے۔

(جرمن سے)

۱۰۔ اقامت خانہ شیرر
۴۱ شلینگ سٹراسے میونخ
۲۷۔ اکتوبر ۱۹۰۷ء

عزیزمن مس ویگیناست

میں آپ کے خط کے لیے شکر گذار ہوں۔ مجھے میونخ بڑا پسند آیا ہے۔ جناب ایز نے یہاں اپنی ایک جاننے والی کو لکھا تھا اور انہوں نے میرے لئے ایک استانی ڈھونڈ لی ہے۔ اگرچہ اس مکان میں جرمن زبان بولنے کا کوئی موقع میسر نہیں آتا، تاہم میں اپنی دونوں استانیوں کے ساتھ کافی گفتگو کر لیتا ہوں۔ کل ہم لوگ ایک آرٹ کی نمائش[3] دیکھنے کے لیے گئے۔ وہاں اتنی بہت سی خوبصورت تصویریں ہیں کہ انسان خود کو ایک دنیائے خواب میں محسوس کرتا ہے۔ ہم نے وہاں دو گھنٹے گزارے اور میری استانی جو آرٹ کی سمجھ رکھتی ہیں، میرے لئے ایسی باتوں کی وضاحت کرتی ہیں جن سے میں اس سے پہلے بے خبر تھا۔

کل مجھے محترمہ پروفیسر صاحبہ کا خط موصول ہوا۔ انہیں جناب ایز سے اطلاع ملی تھی کہ میں اس اقامت خانہ سے خوش نہیں ہوں۔ میں نے انہیں لکھا ہے کہ جو شخص اقامت خانہ شیرر[4] میں رہ چکا ہو اسے

---

[1] غالباً اس سے مراد وہ خط ہے جو اقبال کے نام لکھا گیا تھا۔

[2] یہاں اقبال نے انگریزی میں Yours very sincerely لکھا ہے۔

[3] Kunst Ausstellung (Art Exhibition) شاید یہ میونخ کی مشہور آرٹ گیلری Alte Pinakothek ہے۔

[4] Pension Scherer -

اور کوئی اقامت گاہ پسند نہیں آسکتی۔

آج میں باہر نہیں نکل سکتی موسم خوش گوار نہیں ہے۔ براہ کرم میری بھدی جرمن زبان کا بُرا مت مانیئے اور نہ اس کا جو میں نے اپنے پہلے خط میں لکھا تھا۔ اُمید ہے کہ آپ بالکل بخیریت ہوں گی مجھ میں سوچنے اور صحیح جرمن زبان لکھنے کا یارا نہیں ہے۔

آپ کا دوست

ایس۔ ایم اقبال

۱۱۔ لندن

۱۶ر نومبر ۱۹۰۷ء

عزیزۂ من مس ویگیناست[1]

مجھے آپ کا خط مل گیا ہے لیکن میں ابھی تک جم کر نہیں بیٹھ سکا ہوں۔ ٹھہر کر لکھوں گا۔

دلی نیک تمنائیں

اقبال

۱۲۔ معرفت طامس کک اینڈ سنز

لڈ گیٹ سرکس۔ لندن

۲ر دسمبر ۱۹۰۷ء

عزیزۂ من فراٸیلائن ایما

مجھے آپ کا خط موصول ہو گیا ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ میں اپنی جرمن بھول گیا ہوں۔ میں بہت مصروف تھا۔ اور زیادہ نہ سیکھ سکا۔ آپ انگریزی کیوں نہیں سیکھ[2] لیتیں۔ میرے لئے آپ کو لکھنا اور اپنے دل کی بات کہنا بہت آسان ہو جائے گا۔

---

[1] اس پوسٹ کارڈ کا عکس فقیر وحید الدین کی کتاب اقبال ان یورپ میں موجود ہے۔

[2] یہ لفظ پڑھا نہیں جا سکا۔ یہ PERNEN (سیکھنا ہے) یا PERSEN (پڑھنا) ہے۔

میرا خیال تھا کہ میں ہائیل برون (HEIL BRONN) کے راستے (میونخ سے) سفر کروں یہ ممکن نہ ہوا میرے لئے یہ قطعی لازم تھا کہ میں پانچ نومبر کو لندن میں ہوں۔ پروفیسر آرنلڈ مصر گئے ہیں کا پروفیسر مقرر ہوا ہوں۔ میرے ذمے ہفتے میں دو لکچر ہیں۔

میں زیادہ لکھ یا کہہ نہیں سکتا۔ آپ تصور کر سکتی ہیں کہ میری روح میں کیا ہے۔ میری بہت بڑی خواہش یہ ہے کہ میں دوبارہ آپ سے بات کر سکوں اور آپ کو دیکھ سکوں لیکن میں نہیں جانتا کہ کیا کروں جو شخص آپ سے دوستی کر چکا ہو اس کے لیے ممکن نہیں کہ آپ کے بغیر وہ جی سکے۔ براہ کرم میں نے جو لکھا ہے اس کے لیے مجھے معاف فرمائیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس قسم کے اظہار جذبات کو پسند نہیں کرتیں۔

براہ کرم جلد لکھیے اور سب کچھ۔ یہ اچھا نہیں ہے کہ کسی شخص کا کچھ بگاڑا جائے جو آپ کا کچھ نہیں بگاڑتا۔

آپ کا مخلص [1]

ایس۔ ایم اقبال (جرمن سے)

۱۳۔ معرفت طامس کک اینڈ سن
لڈگیٹ سرکس۔ لندن ای سی
۲۰ جنوری ۱۹۰۸ء۔

عزیزہ من مس ویگیناسٹ

میں آپ کی تصاویر کے لیے ہزار گونہ شکریہ ادا کرتا ہوں جو کل شام مجھے موصول ہوئیں۔ یہ آپ کی بڑی کرم فرمائی ہے۔ دونوں تصویریں بڑی خوبصورت ہیں اور وہ ہمیشہ میرے مطالعے کے کمرے میں میری میز پر رہیں گی لیکن یہ مت باور کیجئے کہ وہ صرف کاغذ ہی پر نقش ہیں بلکہ وہ میرے دل میں بھی محفوظ ہیں اور تا حیات وہیں رہیں گی۔

شاید میرے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ میں دوبارہ آپ کو دیکھ پاؤں ..... لیکن میں بہ ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ

---

[1] یہاں انگریزی میں Yours sincerely لکھا ہے۔

آپ میری زندگی میں ایک حقیقی قوت بن چکی ہیں۔ میں آپ کو کبھی فراموش نہ کروں گا اور ہمیشہ آپ کے لطف و کرم کو یاد رکھوں گا۔

میں اپنی جرمن زبان بالکل بھول چکا ہوں۔ آپ ہی کیوں انگریزی نہیں سیکھ لیتیں؟ یوں ہم ایک دوسرے کی بات بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔ براہِ کرم جلد خط لکھئے جونہی میری فوٹو گراف بنتی ہے میں آپ کو اپنی تصویر بھیج دوں گا۔

خدا حافظ میری عزیزہ مس ایما اور ہمیشہ مجھے یاد رکھئے۔

آپ کا

ایس۔ ایم اقبال (جرمن سے)

لفافے پر پس تحریر۔ میں دونوں تصویریں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔

۱۴۔ معرفت ٹامس کک اینڈ سن

لڈگیٹ سرکس لندن ای سی

۲۱ جنوری ۱۹۰۸ء

میری عزیزہ مس ایما۔

کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں تغافل شعار ہوں؟ یہ بالکل ناممکن ہے۔۔۔۔ جب آپ کا پچھلا خط پہنچا تو میں بہت بیمار تھا اور اس نے مجھے اور بھی بیمار کر ڈالا کیونکہ آپ نے لکھا تھا کہ آپ نے بڑے طوفانوں میں سے گذرنے کے بعد اپنی آزادی دوبارہ حاصل کر لی۔ میں نے یہ سمجھا کہ آپ میرے ساتھ مزید خط و کتابت نہیں کرنا چاہتیں اور اس بات سے مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اب مجھے پھر آپ کا خط موصول ہوا ہے اور اس سے مجھے بڑی مسرت ہوئی ہے۔ میں ہمیشہ آپ کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں اور میرا دل ہمیشہ بڑے خوبصورت خیالوں سے معمور رہتا ہے۔

ایک شرارے سے ایک شعلہ اٹھتا ہے اور ایک شعلے سے بڑا الاؤ روشن ہو جاتا ہے لیکن آپ تغافل کیش ہیں، غفلت شعار ہیں۔ آپ جو جی میں آئے کیجئے۔ میں بالکل کچھ نہیں کہوں گا اور ہمیشہ صابر و شاکر رہوں گا۔

شاید جب میں ہندوستان کو روانہ ہوں گا تو آپ سے ملاقات کر سکوں گا۔ میں اپنی جرمن تمام تر بھول چکا ہوں۔ آپ انگریزی کیوں نہیں سیکھ لیتیں؟

آپ کا

اقبال (جرمن سے)

۱۵۔ معرفت ٹامس کُک اینڈ سن

لڈگیٹ سرکس لندن ای سی

۲۶ فروری ۱۹۰۸ء

عزیزہ من مس ویگیناسٹ!

میں ہر چیز کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے اس قدر مصروفیت رہی کہ میں آپ کو خط نہیں لکھ پایا ہوں۔ آپ ایسی فرشتہ خصلت ہیں کہ میں اُمید رکھتا ہوں کہ آپ مجھے معاف کر دیں گی۔ آج شام بھی مجھے ایک لیکچر دینا ہے۔ تصوف۔ چند روز ہوئے مجھے محترمہ پروفیسر صاحبہ کا خط موصول ہوا۔ ان کا ایک فرانسیسی طالب علم لندن میں تھا۔ اور ہم دونوں نے مل کر پروفیسر صاحبہ کو ایک خط لکھا۔ آپ انگریزی کیوں نہیں سیکھ لیتیں؟ مجھے آپ کے کانوں کو اپنی بھونڈی جرمن سے گراں بار کرنے پر شرم آتی ہے۔ بہر حال میں اس خط و کتابت کو جرمن زبان کے سبق لینے کا ایک بہانہ سمجھتا ہوں۔ سو آپ مجھے اب تک درس دے رہی ہیں۔

میں جولائی کے اوائل میں ہندوستان لوٹ رہا ہوں اور تمنا ہے کہ اپنے اس سفر سے پیشتر مجھے آپ سے ملنے کا موقعہ حاصل ہو سکے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ چند روز کے لیے ہائیڈل برگ آ سکوں لیکن اگر ممکن ہو تو کیا پیرس میں مجھ سے مل سکتی ہیں؟ آپ ہائیڈل برگ کب آئیں گی۔ جناب رائنر (HERR REINER) کہاں ہیں؟ وہ مجھے بالکل خط نہیں لکھتے۔ میں دو مرتبہ انہیں لکھ چکا ہوں۔ شاید وہ بے حد مصروف ہیں۔ آپ تمام دن کیا کرتی ہیں؟ کیا آپ مطالعہ کرتی ہیں یا سہیلیوں کے ساتھ وقت گزارتی ہیں؟

آپ کی تصویر میری میز پر رکھی ہے اور ہمیشہ مجھے ان سہانے دنوں کی یاد دلاتی ہے جو میں نے آپ کے ساتھ گزارے تھے۔

ایک تسبیح خیالاتِ خوش آئند کے ساتھ

آپ کا

ایس۔ ایم اقبال (جرمن سے)

۱۶۔ معرفت طامس کک اینڈ کمپنی
لڈگیٹ سرکس لندن ای۔ سی
۳؍جون ۱۹۰۸ء

عزیزۂ من مس ویگیناسٹ۔

مجھے آپ کا خط ملا اور میں فوراً جواب لکھ رہا ہوں۔ شاید آپ کو میرا جواب موصول نہیں ہوا ہے آپ کے پوسٹ کارڈ کے لیے بے حد شکریہ!

براہ کرم جلد لکھیے اور مجھے بتائیے کہ آپ کیا کر رہی اور سوچ رہی ہیں؟ آپ میرے خط کا انتظار کیوں کرتی ہیں؟ میں ہر روز آپ سے اطلاع پانے کی آرزو رکھتا ہوں۔ مس فیضی[1] اپنی بہن اور برادر نسبتی کے ساتھ یہاں ہیں جو کہ ایک ہندوستانی نواب[2] ہیں۔ میں چند روز ہوئے ان سے ملنے گیا تھا وہ بخیریت اور بڑی خوش و خرم ہیں۔ شاید وہ جرمنی جائیں گی۔

میں بہت مصروف ہوں۔ جلد انگلستان سے رخصت ہو رہا ہوں۔ آغاز جولائی میں۔ مجھے معلوم نہیں کہ آیا میرا جرمنی کے رستے سفر کرنا ممکن ہوگا۔ یہ میری بہت بڑی تمنا ہے کہ میں ہندوستان لوٹنے سے پہلے آپ سے ملاقات کر سکوں۔ بے رحم نہ بنیے۔ پلیز جلد خط لکھیے اور تمام احوال بتائیے۔ میرا جسم یہاں ہے۔ میرے خیالات جرمنی میں ہیں۔ آج کل بہار کا موسم ہے۔ سورج مسکرا رہا ہے لیکن میرا دل غمگین ہے۔ مجھے چند سطریں لکھیے اور آپ کا خط میری بہار ہوگا۔ میرے دلِ غمگین میں آپ کے لیے بڑی خوبصورت سوچیں ہیں اور یہ خاموشی سے ایک کے بعد ایک آپ کی طرف روانہ ہوتی ہیں۔ یہ ہیں آپ کے لیے میری تمنائیں۔ آپ کا۔ اقبال

۱۔ مس عطیہ فیضی۔ ۲۔ اقبال نے ہندوستانی شہزادہ لکھا ہے۔ مس فیضی اپنے بھائی ڈاکٹر فیضی کے ہمراہ اگست ۱۹۰۷ء کے اواخر میں اقبال سے ملنے ہائیڈل برگ گئی تھیں جہاں وہ مس ویگیناسٹ سے متعارف ہوئیں۔ ملاحظہ ہو "اقبال از عطیہ بیگم" مترجمہ عبدالعزیز خالد۔

۱۷۔ معرفت ٹامس کک اینڈ سن

لڈگیٹ سرکس لندن ای سی

۱۰ (دہم) جون ۱۹۰۸ء

عزیزہ من مس ویگیناسٹ

میں آپ کو پہلے لکھ چکا ہوں اور آپ کے خط کا منتظر ہوں۔ خط کے ساتھ میں اپنی ایک تصویر ملفوف کر رہا ہوں۔ شائد میں ایک اور تصویر آپ کو بھیجوں۔

آپ کا

ایس۔ ایم اقبال

پس تحریر۔ میں ۲ر جولائی کو ہندوستان روانہ ہو رہا ہوں اور وہاں سے خط لکھوں گا۔ (جرمن سے)۔

۱۸۔ ۹ ۴ ایلشم روڈ

کینگسٹن غرب، لندن

۲۰ر جون ۱۹۰۸ء

عزیزہ من مس ایما!

میں نے اپنی سی کوشش کی ہے کہ جرمنی کے رستے سفر کر سکوں... لیکن یہ ممکن نہیں ہے میں تین ۳ جولائی کو انگلستان سے روانہ ہوں گا اور چند روز پیرس میں رکوں گا جہاں مجھے کچھ کام ہے براہ کرم فوراً لکھیئے میں ہندوستان روانہ ہونے سے پہلے آپ کا خط پانے کا متمنی ہوں۔ میں اگلے سال یورپ واپس آنے اور آپ سے ملنے کی اُمید رکھتا ہوں۔ مت بھولیئے کہ اگرچہ کئی ملک اور سمندر ہمیں ایک دوسرے سے جُدا کریں گے، پھر بھی ہمارے درمیان ایک غیر معمولی رشتہ قائم رہے گا۔ میرے خیالات ایک مقناطیسی قوت کے ساتھ آپ کی طرف دوڑیں گے اور اس بندھن کو مضبوط بنائیں گے۔ ہمیشہ مجھے لکھتی رہیئے گا اور یاد رکھیئے گا کہ آپ کا ایک سچا دوست ہے، اگرچہ وہ فاصلہ دراز پر ہے جب دل ایک دوسرے کے قریب ہوں تو فاصلہ کچھ معنی نہیں رکھتا۔ براہ کرم

فی الفور لکھیے۔

آپ کا

ایس۔ ایم اقبال

پس تحریر۔ مجھے جناب غضنفر کی بیماری کا سُن کر بڑا افسوس ہوا ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ صحت کا خاص خیال رکھیں۔

(جرمن سے)

۱۹۔ سیالکوٹ شہر۔ ہندوستان

۳ ستمبر ۱۹۰۸ء

عزیزہ من مس ویگیناست!

میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔ یہ بہت ہی افسوس کی بات ہے کہ میں انگلستان سے رخصت ہونے سے پہلے آپ سے مل نہ سکا۔ براہ کرم جلد لکھیے کہ آپ ان دنوں کیا کر رہی ہیں؟ میں نے لاہور میں اپنے پیشے کے آغاز کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ ایک وکیل کے لیے اچھی جگہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ہائیڈل برگ میں ہوں گی۔ براہ کرم جناب اور محترمہ پروفیسر صاحبان کو میرا سلام دیجیے اور جب آپ لوگ ایک ساتھ ہوں تو مجھے یاد کیجیے گا۔

یہاں بڑی بارش ہوئی ہے ہر طرف پانی ہی پانی ہے اور مزید کی توقع ہے۔

میں اپنی ساری جرمن زبان بھول گیا ہوں لیکن مجھے صرف ایک لفظ یاد ہے۔۔۔ اتیما۔

آپ کا

ایس۔ ایم اقبال (جرمن سے)

۲۰۔ لاہور۔ ہندوستان

۱۱ جنوری ۱۹۰۹ء

عزیزہ من مس اتیما۔

آپ کے پُرلطف خط کے لیے بے حد شکریہ!

یہ آپ کا بڑا کرم ہے کہ آپ نے مجھے لکھا اور مجھے یاد رکھا جب کہ میں جرمنی سے اس قدر دور ہوں۔ مجھے ہائیڈل برگ سے آپ کا کوئی خط موصول نہیں ہوا۔ شاید آپ کا خط گم ہو گیا ہے اور مجھے یہ جان کر بڑا افسوس ہوا ہے کہ میرا خط بھی رستے ہیں گم ہو گیا ہے۔

جب میں ہندوستان پہنچا تو میرے ہموطنوں نے مجھے بہت بڑا اعزاز بخشا۔ میرے لئے اس کا لفظوں میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ ملک کے ہر گوشے سے مجھے چالیس کے قریب نظمیں بھیجی گئیں۔ ۔ ۔ دوستوں اور دوسرے لوگوں کی طرف سے خوش آمدید کے طور پر۔ جب میں لاہور پہنچا تو لوگوں نے مجھے سونے کا ہار پہنایا بمبئی سے لے کر لاہور اور سیالکوٹ تک ہر سٹیشن پر ہزارہا لوگ جمع تھے جہاں میں نے دیکھا کہ بہت سے نوجوان اور بزرگ راستے کے سٹیشنوں پر میری نظمیں گا رہے تھے۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ جب میں گھر پہنچا تو میرے والدین بالکل صحت مند تھے۔ میری بہنیں اور والدہ بڑی مسرور ہیں کہ اب میں ان کے پاس ہوں۔

میں اب لاہور میں ہوں اور یہاں ایڈووکیٹ کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ یہ میرے لئے ممکن نہیں کہ میں کبھی آپ کے خوبصورت وطن کو بھول سکوں جہاں میں نے بہت کچھ سیکھا۔ اور براہ کرم ہمیشہ مجھے لکھتی رہیے گا۔ شاید ہم دوبارہ جرمنی یا ہندوستان میں ایک دوسرے سے مل سکیں۔ کچھ عرصے بعد جب میرے پاس کچھ پیسے جمع ہو جائیں گے تو میں یورپ میں اپنا گھر بناؤں گا۔ یہ میرا تصور ہے اور میری تمنا ہے کہ یہ سب پورا ہو۔

جناب خاؤ بال کے انتقال کی خبر سن کر بڑا افسوس ہوا۔ شاید آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے ان کی صحت کے بارے میں ان سے کئی بار تذکرہ کیا تھا۔ براہ کرم اپنے اس دوست کو مت بھولیے جو آپ کو ہمیشہ اپنے دل میں رکھتا ہے اور جو آپ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ہائیڈل برگ میں میرا قیام مجھے ایک خوبصورت خواب سا لگتا ہے اور میں اس خواب کو دہرانا چاہتا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے؟ آپ خوب جانتی ہیں۔

نیک خواہشات کے ساتھ آپ کا

ایس۔ ایم اقبال بار ایٹ لا۔ لاہور (ہندوستان) (جرمن سے)

۲۱۔ لاہور ہندوستان)

۷ جولائی ۱۹۰۹ء

عزیزۂ من فرائیلین ایما!

یہ آپ کی بڑی نوازش ہے کہ آپ نے مجھے یاد کیا تھا۔ مجھے آپ کا خط پاکر (ہمیشہ) بہت ہی مسرت ہوتی ہے۔ اور میں بے تابی سے اس وقت کا منتظر ہوں جب میں دوبارہ آپ کے وطن میں آپ سے مل سکوں گا۔ براہ کرم مجھے ہمیشہ ہمیشہ لکھتی رہیئے۔ مجھے جرمنی پسند ہے۔ اس نے میرے آدرشوں پر بہت اثر کیا ہے اور میں جرمنی میں اپنا قیام کبھی فراموش نہ کروں گا۔ میں یہاں بالکل اکیلا رہتا ہوں اور خود کو بڑا غمگین پاتا ہوں۔ ہماری تقدیر ہمارے اپنے ہاتھوں میں نہیں ہے ایک ایسی قوت ہے جو ہماری زندگیوں کو منظم کرتی ہے۔ محترمہ پروفیسر صاحبہ پروفیسر صاحب اور تمام خواتین حضرات کو میں ہمیشہ اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ آہ! وہ دن جب میں جرمنی میں تھا!

مس فیضی بمبئی میں ہیں۔ ان کی والدہ انتقال کر گئی ہیں اور وہ بہت غمزدہ ہیں۔ اب وہ کچھ بہتر ہیں۔ بعض اوقات میں خود کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہوں اور دل میں یورپ اور بالخصوص جرمنی کو دوبارہ دیکھنے کی بڑی آرزو پیدا ہو جاتی ہے۔ براہ کرم مجھے اپنے دل اور یادوں میں ایک چھوٹی سی جگہ دیجئے۔

آپ کا دوست

ایس۔ ایم اقبال۔ بار ایٹ لاء (جرمن سے)

۲۲۔ لاہور (ہندوستان)

۲۲ ستمبر ۱۹۱۰ء

عزیزۂ من مس ویگیناست!

مجھے آپ کا نوازش نامہ موصول ہو گیا ہے جس کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آج ڈاک کا دن ہے لیکن بدقسمتی سے میں بہت مصروف ہوں۔

اگلے ہفتے میں آپ کو ایک طویل تر خط لکھوں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ممکن ہو گا۔

یہ پوستین ایک تبتی بھیڑ کی ہے یہ دراصل ایک اور کوٹ کے کالر اور بازؤں کے لیے ہے۔

دلی تمناؤں کے ساتھ

محمد اقبال بار ایٹ لاء (جرمن سے)

۲۳۔ لاہور (ہندوستان)

عزیزہ من فرائیلائین وِگیناست!

آپ کا خوبصورت پوسٹ کارڈ مجھے مل گیا ہے اور اس کے لیے میں آپ کو اپنے دلی شکریہ بھیجتا ہوں۔ میری بڑی تمنا ہے کہ جرمنی کا دوبارہ سفر کروں تاکہ آپ سے مل سکوں اور (مگر) میں نہیں جانتا کہ یہ کس دن ممکن ہو سکے گا لیکن میرے خطوط آپ کو اس ظالم جرمن زبان کی وجہ سے جو میں لکھتا ہوں کافی دل لگی کا سامان بہم پہنچاتے ہوں گے۔

وہ خوبصورت ٹاپیاں مجھے مل گئی تھیں۔ میں بے حد شرمندہ ہوں کہ میں اس قدر مصروف تھا کہ آپ کو لکھ نہ سکا اور اپنا شکریہ نہ بھیج سکا۔ جب آدمی کوئی زبان نہیں لکھ سکتا تو اس کا قلم بہت دل شکستہ ہوتا ہے اور ایسے انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا ہے کہ ایسے شکریے کا پورا اظہار کر سکے میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے کہ اپنی جرمن صحیح کر سکوں۔ براہ کرم میری غلطیوں کو معاف فرمائیے لیکن مہربانی کر کے ایک طویل خط لکھیے۔ مجھے اُمید ہے کہ محترم پروفیسر صاحبہ بخیریت ہوں گی۔

آپ کا دوست

محمد اقبال (جرمن سے)

۲۴۔

آپ کے خط کے لیے بہت شکریہ۔ براہ کرم مجھے لکھیے کہ آپ کیسی ہیں؟ ان دنوں لاہور میں بے حد گرمی ہے۔ ہم ایک دوزخ میں رہ رہے ہیں۔ میں جرمنی کو کبھی نہ بھول سکوں گا۔

اقبال

۴ جولائی ۱۹۱۲ء

محترمہ پروفیسر صاحبہ کا کیا حال ہے؟ میرے خیال میں گھر بھرا ہوا ہوگا۔ یہ دِلّی کی جامع مسجد ہے

(جرمن سے)

۲۵۔ لاہور

۳۰ رجولائی ۱۹۱۳ء

ڈیر مِس ویگیناسٹ!

مجھے آپ کے والد صاحب کی وفات کی خبر سن کر بے انتہا صدمہ ہوا ہے اور اگرچہ میرا خط اس افسوسناک سانحے کے بہت دنوں بعد آپ تک پہنچے گا، تاہم اس اندوہناک نقصان پر آپ کے ساتھ مجھے جو ہمدردی ہے اس کی شدت کو نہ وقت کم کر سکتا ہے نہ فاصلہ۔ اس خبر سے مجھے حقیقتاً بے حد دکھ ہوا ہے اور میں خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس بزرگ اور قابلِ احترام ہستی پر اپنے انعام و اکرام کی بارش کرے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ یہ وہ آیت مقدسہ ہے جو ہم کسی کی وفات کی خبر سن کر پڑھتے ہیں اور آپ کا غمناک خط پڑھ کر میں نے یہ آیت دہرائی۔ ایسے سانحات ہر شخص کی زندگی میں ضرور رونما ہوتے ہیں اور یہ لازم ہے کہ ہم اپنے مصائب کا مقابلہ اسی پامردی سے کریں جیسا کہ ان لوگوں نے کیا جن کی زندگیاں ہمارے لیے شمع ہدایت ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ گوئٹے نے اپنے لمحہ موت پر کیا کہا تھا "مزید روشنی" موت مزید روشنی کی طرف ایک نئی راہ وا کرتی ہے اور ہمیں ان مقامات تک لے جاتی ہے۔ جہاں ہم ابدی حسن و صداقت کے روبرو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے وہ وقت بخوبی یاد ہے جب میں نے گوئٹے کی شاعری آپ کے ساتھ پڑھی اور مجھے امید ہے کہ آپ کو بھی وہ اچھے دن یاد ہوں گے جب ہم روحانی طور سے ایک دوسرے کے اس قدر قریب تھے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم اب بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ یہاں تک کہ میں روحانی لحاظ سے آپ کا شریک غم ہوں۔

جب آپ کی طبیعت خط لکھنے کو چاہے تو براہ کرم مجھے ضرور لکھیے۔ کاش میں جرمنی میں ہوتا تاکہ اپنی ہمدردی میں ذاتی طور سے آپ تک پہنچ سکتا۔ فی امان اللہ!

ہمیشہ آپ کا محمد اقبال

ایڈووکیٹ۔ لاہور۔ (انگریزی سے)

۲۶۔ لاہور۔ (ہندوستان)

۷ر جون ۱۹۱۴ء

عزیزہ من فرائیلائین ویگیناست!

مجھے کچھ عرصہ ہوا آپ کا خط ملا تھا جسے پاکر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے علالت کی وجہ سے میں اس سے پہلے اس کے جواب سے عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ میں آپ کی خوبصورت زبان جرمن میں نہیں لکھ سکتا ہوں۔ اگلے روز میں ہائینے کا مطالعہ کر رہا تھا اور مجھے وہ پرمسرت دن یاد آ گئے جب ہائیڈل برگ میں محترمہ پروفیسر صاحبہ کے یہاں ہم دونوں اس کو ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے وہ کیا اچھی بزرگ خاتون تھیں! امید ہے کہ وہ بخیریت ہوں گی اگر آپ کی ان سے کہیں ملاقات ہو تو میرا سلام انہیں دیجئے گا۔

میں یہ جاننے کے لیے مضطرب ہوں کہ آپ ان دنوں کیا کر رہی ہیں اور آپ کے کیا ارادے ہیں۔ (اگر ہیں تو) ہو سکتا ہے میں اگلے سال یورپ آؤں لیکن اس کا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ یہ سب حالات پر منحصر ہے اگر میں واقعی یورپ آیا تو یقیناً اس دیارِ قدیم جرمنی کا بھی پھر سفر کروں گا اور آپ سے دوبارہ ہائیڈل برگ یا ہائیل برون میں ملاقات کر آؤں گا جہاں سے ہم دونوں ایک ساتھ اس عظیم دانشور گوئٹے کے مزارِ مقدس کی زیارت کو جائیں گے۔

اگرچہ مجھے آپ کے بھائی اور بہنوں کے ساتھ ملاقات کا شرف کبھی حاصل نہ ہوا تھا پھر بھی بالضرور ان کو میرا سلام پہنچایئے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

۲۷۔

لاہور۔ (ہندوستان)

۱۰ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

عزیزہ من فرائیلائین ویگیناست!

آخرکار وہ ہولناک جنگ اب ختم ہو گئی ہے اور چار سال کی طویل خاموشی کے بعد مجھے دوبارہ آپ کو خط لکھنے کا موقع حاصل ہوا ہے۔ آپ کا ملک ایک عظیم آزمائش سے گذر رہا ہے اور میں اُمید کرتا ہوں کہ جلد ہی وہ اپنے ان نقصانات کو پورا کر سکے گا جو اس جنگ سے اسے پہنچے ہیں۔ اس تمام عرصے میں میں آپ کی اور آپ کے عزیزوں اور بالخصوص آپ کے بھائیوں کی سلامتی کے متعلق بہت تشویش میں رہا ہوں۔ براہِ کرم جلد از جلد مجھے اپنے اور اپنے بھائیوں کے حالات کے بارے میں تفصیل سے لکھئے۔ جرمن قوم کو واقعی بہت بڑی قربانیاں دینی پڑی ہیں۔

میں یہ خط انگریزی میں لکھنے کے لیے بڑا معذرت خواہ ہوں لیکن میں اس بات کو ترجیح دیتا ہوں کہ آپ کو اس خط کا ترجمہ کروانے کی زحمت اُٹھانی پڑے بہ نسبت اس کے کہ میں اپنی غلط سلط اور بھونڈی جرمن سے آپ کے سامعہ کو گراں بار کروں۔

براہِ کرم ہائیڈل برگ والی محترمہ پروفیسر صاحبہ کے بارے میں بھی اطلاع دیجئے کیا آپ کو جناب رائنر (HERR REINER) کی طرف سے بھی کوئی خبر وغیرہ ملتی رہی ہے؟ وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟

آپ کا مخلص

محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا۔ (انگریزی سے)

۲۸۔

۱۱۳۔ اے، سینٹ جیمز کورٹ

بکنگھم گیٹ۔ ایس ڈبلیو

۱۵، اکتوبر ۱۹۳۱ء

عزیزہ من فرائیلائین ویگیناست!

یہ جناب مٹزروتھ (HERR METZROTH) کی بڑی کرم فرمائی تھی کہ انہوں نے مجھے آپ کا موجودہ پتا بہم پہنچایا۔ جو مجھے آج صبح موصول ہوا اور یوں میں آپ کو خط لکھنے کے قابل ہوا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ خط آپ کو اُن پُر مسرت دنوں کی یاد دلائے گا جو ہم نے ہائیڈل برگ

سکول یعنی تیسری منزل میں ایک ساتھ بسر کئے تھے، براہ کرم مجھے خط لکھیے اور ان سارے برسوں کے دوران اپنی مصروفیات اور حالات سے مطلع کیجئے۔ مجھے آپ کا جواب پا کر بہت مسرت ہوگی۔ فی الحال ہیں کافی عرصہ لندن میں رکنا پڑے گا اور جب لندن کی گول میز کانفرنس ختم ہو جائے گی تو اس کے بعد میرا ارادہ برلن کے رستے روم جانے کا ہے جہاں مجھے کچھ روز ٹھہرنے اور چند پرانے دوستوں سے ملاقات کرنے کا موقعہ ملے گا۔ سالہا سال کے بعد آپ سے مل کر مجھے بے اندازہ خوشی ہوگی۔ مجھے اطلاع دیجئے کہ کیا ابھی کچھ عرصہ آپ ہائیڈل برگ ہی میں قیام رکھیں گی۔

آپ کے خط کا منتظر

محمد اقبال (انگریزی سے)

۲۹۔

۱۱۳۔ اے۔ سینٹ جیمز کورٹ
بکنگھم گیٹ۔ ایس ڈبلیو ۱،
۳۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء

عزیزہ من فرائیلائین ویگیناست!

یہ آپ کا نہایت درجہ تلطف تھا کہ آپ نے مجھے خط لکھا۔ مجھے آپ کا خط آج صبح سویرے اس وقت ملا جب میں ابھی بستر ہی میں تھا۔ میں نے اسے ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ میں اسے پا کر بہت خوش ہوا تھا اور کچھ اس لیے کہ میں اسے پوری طرح سمجھ سکوں۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ باوجود ان تمام آلام و مصائب کے جن سے آپ کو دوچار ہونا پڑا ہے۔ آپ زندگی سے خندہ پیشانی کے ساتھ عہدہ برآ ہو رہی ہیں۔ ہائیڈل برگ کے وہ ایام کبھی فراموش نہ کر سکوں گا جب آپ نے مجھے گوئٹے کا فاؤسٹ پڑھایا اور دیگر کئی طرح سے میری مدد کی تھی۔ وہ کیا ہی بہجت افزا دن تھے۔ مجھے آپ کے خط سے معلوم ہوا ہے کہ آپ اپنے وقت کی مختار نہیں ہیں۔ چنانچہ میں پوری کوشش کروں گا کہ میں ہائیڈل برگ آؤں اور آپ سے اس پرانے مقام پر ملاقات کروں۔ مجھے اب تک

دریائے نیکر یاد ہے جس کے کنارے پر ہم دونوں ایک ساتھ گھوما کرتے تھے لیکن فی الحال کوئی بات پختہ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ جلد ہی میں آپ کو یہ اطلاع دے سکوں گا کہ آیا میں روم جاتے ہوئے رستے میں جرمنی سے گذر سکتا ہوں۔ مجھے روم سے ایک دعوت موصول ہوئی ہے اور میں بالآخر ہندوستان کی واپسی سے پہلے وہاں جانا چاہتا ہوں۔

مجھے یہ کہنے کی بالکل ضرورت نہیں کہ میری یہ بڑی ہی آرزو ہے کہ میں پھر آپ سے ملوں اور اُن پُر مسرت دنوں کی یادیں تازہ کروں جو افسوس کہ اب ہمیشہ کے لیے گذر چکے ہیں۔ دریں اثنا مجھے تاکید سے خط لکھیئے گا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال (انگریزی سے)

پس تحریر — میں اب پروفیسر نہیں ہوں۔

۳۰۔

۱۱۳۔ اے، سینٹ جیمز زکورٹ

بکنگھم گیٹ۔ این (کذا) ڈبلیو

۱۹ نومبر ۱۹۳۱ء۔

مائی ڈیرمس ویگیناسٹ!

یہ آپ کی بڑی کرم فرمائی تھی کہ آپ نے خط لکھا اور میں آپ سے ہائیڈل برگ میں ملنے کے لیے محو انتظار تھا لیکن مجھے بڑے افسوس کے ساتھ آپ کو اطلاع دینی پڑتی ہے کہ میرے پروگرام میں بعض ایسے ضروری تغیرات یکایک رونما ہو گئے ہیں کہ جن کے پیش نظر اب میرے لئے جرمنی کے راستے سفر کرنا ممکن نہیں رہا۔ میں سیدھا روم جا رہا ہوں جہاں جناب مارکونی نے (SIGNOR MARCONI) مجھے مدعو کیا ہے اور وہاں سے میں ۷، دسمبر کو منعقد ہونے والی مؤتمر عالم اسلامی میں شرکت کرنے کے لیے یروشلم روانہ ہو رہا ہوں۔ اس امر سے مجھے بے اندازہ خوشی حاصل ہوتی کہ میں زندگی میں ایک مرتبہ پھر آپ سے مل سکتا اور پرانی صحبتوں کو پھر زندہ کر سکتا۔ لیکن یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ یہ بات ناممکن ہو گئی ہے

ہاں یہ ممکن ہے کہ میں شاید اگلے سال پھر یورپ آؤں۔ اگر ایسا ہوا تو میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ سے ملنے کے لیے ہائیڈل برگ آنے کی پوری کوشش کروں گا۔ براہ کرم میرا صمیم قلب سے بھیجا ہوا سلام قبول کیجئے اور یہ اپنی ان سہیلیوں کو بھی پہنچا دیجئے جن سے آپ نے ہائیڈل برگ میں میرا تعارف کرایا تھا۔ گاہے بگاہے تاکید سے مجھے میرے لاہور۔ ہندوستان کے پتے پر خط لکھا کیجئے۔ جیسا کہ فارسی کی ایک ضرب المثال ہے۔ خط نصف ملاقات ہے۔

اُمید کہ آپ ہر طرح سے بخیریت ہیں۔ آپ کا مخلص

محمد اقبال (انگریزی سے)

۳۱۔ لاہور۔ ہندوستان

۱۷ر جنوری ۱۹۳۲ء

عزیزہ من فرائیلائین ویگیناست!

مجھے آپ کا خط کل موصول ہوا اور میں نے اس کے مندرجات بڑی مسرت کے ساتھ پڑھے مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں جرمنی نہ آسکا اور ان سہانے دنوں کی یادیں تازہ نہ کر سکا جو میں نے آپ کی اور کچھ دیگر احباب کی معیت میں ہائیڈل برگ میں بسر کئے تھے۔ میرے یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں ہے کہ ان تمام برسوں میں میں نے آپ کو کبھی فراموش نہیں کیا اور میرے دل میں ہمیشہ یہ تمنا زندہ رہی ہے کہ میں دوبارہ آپ سے ملوں گا لیکن جیسا کہ بخت تیرہ کو منظور تھا۔ ع

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

ان دنوں کی یاد جب ہم گوئٹے کا فاؤسٹ ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے ہمیشہ ایک غم انگیز مسرت کے ساتھ میرے دل میں آتی رہتی ہے۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو بتاؤں کہ ان تمام برسوں کے دوران میں کیا کرتا اور سوچتا رہا ہوں تو سنیئے۔ میں نے بہت کچھ لکھا ہے اور وہ تمام چیزیں جو میں نے بطور شاعری اور فلسفے کے لکھی ہیں وہ میں نے شایع کر دی ہیں تاہم میرے ذہن نے ہمیشہ ایک کمی سے محسوس کی ہے اور خود کو اپنے ان ہندی گرد و نواح میں تنہا سا پایا ہے جوں جوں میری عمر بڑھ رہی ہے

اس تنہائی کا احساس بھی فزوں تر ہوتا جاتا ہے لیکن سوائے تسلیم و رضا کے ہمارے لئے اور کوئی چارہ نہیں اور میں نے بھی پوری تسکین دل کے ساتھ اپنی قسمت کو قبول کیا ہے۔

یہ بات باعثِ تاسف ہے کہ میں جرمن زبان کے ساتھ اپنا رابطہ قایم نہیں رکھ سکا ہوں، لیکن میں ہمیشہ آپ کے خطوط کو جرمن لغت کی مدد سے پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہوں، بجائے اس کے کہ کسی اور سے ان کا ترجمہ کرواؤں۔ اپنے خطوط کسی اور کو دکھانا اچھا نہیں ہوتا۔ مجھے چاہے آپ کا خط ختم کرنے میں تین دن لگیں، پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں کہ اسے بطور خود ایک لغت کی مدد سے سمجھ پاؤں لیکن میں نہیں چاہتا کہ یہ کسی اور کو دکھاؤں اور میں نے ہمیشہ یہی طریق کار اختیار کیا ہے۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ آپ اپنی بہن کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ان کی تصویر دیکھی تھی جو آپ نے مجھے دکھائی تھی۔ براہِ کرم انہیں اور اپنے ان دوسرے دوستوں کو میرا سلام کہیئے جن سے میں ضرور جرمنی میں ملا ہوں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں دوبارہ یورپ آؤں گا اور اگر میں آیا تو میں بالالتزام آپ سے اور آپ کی ہمشیرہ سے ہائیڈل برگ ملنے آؤں گا۔ جرمنی میرے لئے ایک طرح سے دوسرا روحانی وطن تھا۔ میں نے اس ملک میں بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ سوچا تھا۔ گوئٹے کے وطن نے میری روح کے اندر ایک دائمی گھر حاصل کر لیا ہے۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گی۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

(انگریزی سے)

۳۲۔

۱۲ دسمبر ۱۹۳۲ء

کوئین اینز منیشنز، سینٹ جیمز پارک لندن۔ ایس ڈبلیو ۱

عزیزہ من فرائیلائین ویگیناسٹ!

میں ایک مختصر عرصے کے لیے دوبارہ انگلستان میں ہوں اور یہ خط یہ دریافت کرنے کے لیے

لکھ رہا ہوں کہ آیا آپ تاحال ہائیڈل برگ اشتادین سٹرا سے نمبر ۱۴۵ ہی میں مقیم ہیں۔ اُمید ہے آپ ہر طرح بخیریت ہوں گی۔ از راہِ کرم جلد خط کا جواب دیجیے گا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال (انگریزی سے)

۳۳۔

۲۹ دسمبر ۱۹۳۲ء

کوئین این میشنز۔ سینٹ جیمز پارک لندن۔ ایس ڈبلیو ۱

عزیزہ من فرائیلائین ویگیناست!

آپ کے خط کے لیے شکریہ۔ میں لندن سے ۳۰ دسمبر کو روانہ ہوں گا۔ میرے موجودہ پروگرام کے مطابق میں ہائیڈل برگ ۱۸ جنوری ۱۹۳۳ء کو رات کے دس بجکر تیس منٹ پر (۳۳۔ ۱۰ شب) پہنچوں گا۔ اور بائرشر ہوف ہوٹل میں ٹھہروں گا۔ ہائیڈل برگ میں میرے قیام کا واحد مقصد آپ سے اتنے سال گزرنے کے بعد دوبارہ ملنا ہے۔

میں آپ سے ملاقات کا بڑے اشتیاق کے ساتھ منتظر ہوں۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال (انگریزی سے)

۳۴۔

میڈرڈ۔ ۲۱ جنوری ۱۹۳۳ء

میں جنوبی ہسپانیہ کے دورے کے بعد آج میڈرڈ واپس پہنچا ہوں۔ افسوس کہ میرے لیے اس مرتبہ ہائیڈل برگ آنا ناممکن ہوگا۔ مجھے وہ سارے ٹکٹ منسوخ کرنے پڑے جو میں نے لندن میں خریدے تھے کیونکہ میرے لئے لازمی ہے کہ میں وینس سے دس فروری ۱۹۳۳ء کو روانہ ہونے والے جہاز (کونتے روسو) سے سفر کروں۔

ہو سکتا ہے کہ میں اپریل میں پھر انگلستان آؤں۔

آپ کا

محمد اقبال (انگریزی سے)

ضمیمہ (ب)

اردو شعراء میں اقبال بلاشبہ سب سے زیادہ پڑھے لکھے شاعر تھے۔ کتب بینی ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ آخری عمر میں ضعفِ بصارت کے باعث ڈاکٹروں نے انہیں لکھنے پڑھنے سے منع کیا تھا چنانچہ قرآن مجید اور مثنوی مولانا روم کے علاوہ انہوں نے مطالعہ کتب ترک کر دیا تھا۔ ۱۹ مارچ ۱۹۳۵ء کو حکیم محمد حسن قریشی کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"میں ایک مدت سے مطالعہ کتب ترک کر چکا ہوں اگر کبھی کبھی پڑھتا ہوں تو قرآن یا مثنوی روم۔"

(اقبال نامہ ۔ جلد اول ۔ ص ۲۸)

یہ بتانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کہ اپنی زندگی میں اقبال نے کون کون سی کتابیں پڑھی تھیں تاہم درجِ ذیل فہرست سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال کا مطالعہ کس قدر وسیع اور متنوع تھا۔ ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ کس طرح کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن کا ذکر کسی نہ کسی وجہ سے خود اقبال نے اپنے مکاتیب میں کیا ہے۔ ان کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو تک پہنچتی ہے اور جرائد و رسائل اس کے علاوہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ اقبال نے ان کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں پڑھی ہوں گی جن کا ذکر خطوط میں نہیں آیا ہے، خطوط میں جن کتابوں کا ذکر آیا ہے وہ کسی خاص وجہ سے آیا ہے لہٰذا ہر کتاب کا ذکر خطوط میں نہیں آ سکتا۔ بہرحال جن کتابوں کا تذکرہ کسی نہ کسی سبب سے ان کے مکاتیب میں آیا ہے ان کے نام ہیں :۔ (الف)

۱۔ تفسیر بیان اللناس[1]۔

۲۔ تحفۃ العراقین ــــ خاقانی

۳۔ دیوان حافظ

۴۔ لٹریری ہسٹری آف پرشیا ــــ براؤن

---

[1] اقبال نے اسے تفسیر بیان القرآن لکھا ہے۔

۵۔ لطایفِ غیبی ـــــ مرزا محمد داراب
۶۔ دیوان حافظ ۔ (انگریزی ترجمہ) ۔ کلارک
۷۔ آتش کدہ۔
۸۔ نفحات الانس ـــــ جامی
۹۔ ملفوظات شاہ جہانگیر اشرف
۱۰۔ حیات حافظ ۔ مولانا محمد اسلم جیراجپوری
۱۱۔ شعر العجم ـــــ مولانا شبلی
۱۲۔ دکن میں اردو ـــــ نصیر الدین ہاشمی
۱۳۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات۔
۱۴۔ غزالی ـــــ محمد عمر الدین
۱۵۔ ابن ارلی مسٹک آف بغداد ۔ مارگیر ڈسمتھ
۱۶۔ تذکرہ ـــــ ابو الکلام آزاد
۱۷۔ تحفۃ الاحرار ـــــ مولانا جامی
۱۸۔ سیرتِ عائشہ ـــــ سید سلیمان ندوی
۱۹۔ سیرت النبیؐ ـــــ سید سلیمان ندوی
۲۰۔ دیوان مشرقی ـــــ گوئٹے
۲۱۔ رسالہ اتفاق العرفان فی ماہیتہ الزمان۔
ـــــ حکیم برکات احمد ٹونکی۔
۲۲۔ طبقات ـــــ شاہ اسمٰعیل شہید

۲۳۔ جواہر الفرد ـــــ محب اللہ۔
۲۴۔ حافظ امان اللہ بنارسی کی تصانیف۔
۲۵۔ شرحِ مواقف ـــــ امام رازی
۲۶۔ فتوحات ـــــ شیخ محی الدین ابن عربی
۲۷۔ فصوص الحکم ـــــ شیخ محی الدین ابن عربی
۲۸۔ ابنِ رشد کی بعض تصانیف[۱]
۲۹۔ محمڈن تھیوریز آف فنانس ۔ نکولس پی اگنائڈز
۳۰۔ ارشاد الفحول ـــــ قاضی شوکانی
۳۱۔ تذکرہ ـــــ مولانا عنایت اللہ مشرقی
۳۲۔ فقہ اسلامی پر ایک مصری کتاب[۲]
۳۳۔ ترکی شاعر ضیا بک کی بعض تحریریں۔
۳۴۔ طرق الحکمیہ ـــــ حافظ ابن قیم
۳۵۔ المقابلات ـــــ حافظ ابن قیم
۳۶۔ شفاء العلیل فی مسائل القضاء والقدر والحکمۃ والتعلیل ـــــ حافظ ابن قیم
۳۷۔ صحیح بخاری۔
۳۸۔ شمس بازغہ ـــــ مُلا محمود جونپوری
۳۹۔ الکلام ـــــ مولانا شبلی نعمانی
۴۰۔ حجۃ البالغہ ـــــ شاہ ولی اللہ

[۱] تصانیف کے نام نہیں دیئے ہیں۔ [۲] کتاب یا مصنف کا نام نہیں لکھا ہے۔

[۳] اس کتاب کا نام اقبال نے کتاب المقتدیہ اور مصنف کا نام ابن تیمیہ لکھا ہے۔

۴۱۔ مباحث مشرقیہ ——— امام رازی

۴۲۔ مُلا محمود جونپوری کی کُتب۔ ———

۴۳۔ تسویلات فلسفہ۔ ———

۴۴۔ شرح موقف ——— حافظ امان اللہ بناری

۴۵۔ نور الاسلام کا عربی رسالہ فی تحقیق المکان۔

۴۶۔ سفر نامہ کابل ——— سید سلیمان ندوی

۴۷۔ تفہیمات الٰہیہ ——— شاہ عاشق حسین

۴۸۔ تکملۃ الجمع البحار۔ ———

۴۹۔ درِ نشدر۔ ———

۵۰۔ حج الکرامہ فی آثار القیامہ ——— نواب صدیق حسن خان

۵۱۔ بدر البازغہ ——— شاہ ولی اللہ دہلوی

۵۲۔ عقائد شیعہ ——— موسیٰ جار اللہ (مصر)

۵۳۔ راٹیس آف دی مین ——— (انگریزی)۔

۵۴۔ عالمگیر انسانی برادری ——— کلیفورڈ مانسر ڈوٹ

۵۵۔ ارمغان عزیز ——— عزیز یار جنگ

۵۶۔ دیوان غالب ——— اسد اللہ خان

۵۷۔ اے نیو ورلڈ ان میکنگ ———

——— سید فضل الرحمان انصاری

۵۸۔ اعلام الموقعین ——— ابن قیم

۵۹۔ تاریخ عالم ——— مسعود عالم ندوی (عربی)

۶۰۔ کتاب الشرق ——— محمد لطفی جمعہ

۶۱۔ علم المعیشت ——— الیاس برنی

۶۲۔ قادیانی مذہب ——— الیاس برنی

۶۳۔ رسالہ فی درایتہ الزمان ——— عراقی

۶۴۔ فاؤسٹ ——— گوئٹے (جرمن) [1]

۶۵۔ رسالہ تعلیم القرآن ——— انیس احمد

۶۶۔ زرتشت نے کہا ——— نطشے (انگریزی)

۶۷۔ کتاب الطواسین ——— منصور حلاج

۶۸۔ علامہ ابن جوزی کی کتب۔ ———

۶۹۔ گولڈزی کی تصانیف۔ ———

۷۰۔ اسرار الحکم ——— ہادی سبزواری

۷۱۔ اے کریٹیکل ہسٹری آف گریک فلاسفی۔

——— ڈبلیو ٹی سٹیس

۷۲۔ مُلا صدرا۔ ———

۷۳۔ تفسیر القرآن ——— مُلا صدر الدین شیرازی [2]

۷۴۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کی کُتب۔ ———

۷۵۔ حریت اسلام ——— محمد دین فوق۔

۷۶۔ جدید دنیائے اسلام ——— سٹوڈرڈ

۷۷۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ ———

۷۸۔ نجات دہندہ گاندھی۔ ———

---

[1] مس ویگیناسیت کے نام اقبال کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے گوئٹے کو جرمن زبان میں ہی پڑھا تھا۔

[2] اس بارے اقبال لکھتے ہیں: "بعض مقامات تو خوب ہیں مگر مجموعی حیثیت سے اس کا پایہ تفاسیر میں بہت کم ہے"۔
- (اقبال نامہ حصہ دوئم۔ ص ۱۶۴) -

۷۹۔ اے۔ این فیلڈ کی کتابیں ——
کتابوں کا نام نہیں لکھا ہے)۔

۸۰۔ اعجاز حق —— شاطر مدراسی

۸۱۔ ڈیوائن کامیڈی اینڈ اسلام ——
—— پروفیسر آسین

۸۲۔ غالب نامہ —— شیخ محمد اکرم

۸۳۔ مفردات —— راغب اصفہانی

۸۴۔ آرٹ اینڈ کانشینس ——

۸۵۔ مرقعہ چغتائی —— عبدالرحمن چغتائی

۸۶۔ احیاء العلوم —— غزالی

۸۷۔ میتھڈ —— ڈیکارٹ

۸۸۔ ڈیوائن کامیڈی —— دانتے

۸۹ بیکن کی کتابیں۔ ——

۹۰۔ جان سٹوارٹ مل کی کتابیں۔ ——

۹۱۔ نصیر الدین طوسی کی کتابیں۔ ——

۹۲۔ کانٹ کی کتابیں۔ ——

۹۳۔ حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری کا رسالہ

۹۴۔ سر السما —— عبد العزیز۔

۹۵۔ تاریخ الحکما —— بیہقی۔

۹۶۔ شرح انواریہ —— محمد اشرف ہراتی

۹۷۔ حکمت العین —— الکاتبی

۹۸۔ شرح حکمت العین ۔ محمد ابن مبارک البخاری

۹۹۔ شرح حکمت العین —— حسینی۔

۱۰۰۔ عوارف المعارف —— شہاب الدین۔

۱۰۱۔ مشکوٰۃ الانوار —— غزالی۔

۱۰۲۔ کشف المحجوب —— سید علی ہجویری۔

۱۰۳۔ رسالہ النفس از ارسطو (ترجمہ افضل کاشی)۔

۱۰۴۔ رسالہ میر سید شریف ——

۱۰۵۔ خاتمہ —— سید محمد گیسو دراز

۱۰۶۔ منازل السائرین عبداللہ اسمٰعیل ہراتی

۱۰۷۔ جاودان نامہ —— افضل کاشی۔

۱۰۸۔ تاریخ الحکما —— شہر زوری

۱۰۹۔ مجموعہ تصانیف ابن سینا۔ ——

۱۱۰۔ رسالہ فی الوجود —— میر جرجانی۔

۱۱۱۔ جاودان کبیر ——

۱۱۲۔ جام جہان نما ——

۱۱۳۔ مجموعہ فارسی (دو رسالے) —— از النسفی

۱۱۴۔ شہرستانی —— مرتبہ کیورٹن۔

۱۱۵۔ کتاب الملل والنحل —— ابن حزم

۱۱۶۔ امریکن جرنل آف فلاسفی۔ ——

۱۱۷۔ تاریخ مسائل فلسفہ —— پال جانٹ

۱۱۸۔ اخلاقیات کے جدید میلانات ——

۱۹۔ مقالات ـــــ ڈاکٹر ہاگ

۱۲۰۔ حلول ـــــ اینی بیسنٹ

۱۲۱۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا ـــــ

۱۲۲۔ محمد ابن اسحاق کی کتابیں مرتبہ فلوگل۔

۱۲۳۔ مُلر کی کتاب۔ ـــــ

۱۲۴۔ سیاست نامہ نظام الملک طوسی ـــــ

۱۲۵۔ الیعقوبی مرتبہ ہوٹسما ـــــ

۱۲۶۔ فلسفہ اسلام ـــــ ڈاکٹر بوئیر

۱۲۷۔ علم الکلام ـــــ شبلی نعمانی

۱۲۸۔ مسلمانوں کا علم الکلام ـــــ میکڈونلڈ

۱۲۹۔ المعتزلہ ـــــ ٹی، ڈبلیو آرنلڈ

۱۳۰۔ ابن عساکر کے اقتباسات مرتبہ مہرین

۱۳۱۔ ابن حزم ـــــ مطبوعہ قاہرہ

۱۳۲۔ فان کریمر کی کتاب۔ ـــــ

۱۳۳۔ ہوفڈنگ۔ ـــــ

۱۳۴۔ تاریخ فلسفہ ـــــ لیوس۔

۱۳۵۔ جرنل آف دی امریکن اورنٹیل سوسائٹی۔

۱۳۶۔ الغزالی ـــ مطبوعہ آگرہ، شبلی نعمانی۔

۱۳۷۔ نصف گھنٹہ صوفیا کے ساتھ ـــ ادوگھان

۱۳۸۔ نوفلاطونیت ـــــ وِکٹر

۱۳۹۔ تاریخ ادبیات ہند۔ ـــــ

۱۴۰۔ شرح النواریہ ـــــ الہروی

۱۴۱۔ انسان کامل ـــــ الجیلی

۱۴۲۔ ایڈنز ٹو جرمن تھیالوجی ـــــ میتھن

۱۴۳۔ عباس آفندی ـــــ فلپ

۱۴۴۔ DIE MUTA ZILITEN

(ب) رسائل واخبارات۔

۱۔ معارف ـــــ (اعظم گڑھ)

۲۔ وکیل ـــــ (امرتسر)

۳۔ زمیندار ـــــ (لاہور)

۴۔ بلاغ ـــــ (امرتسر)

۵۔ اشاعت القرآن۔ ـــــ

۶۔ العلم۔ ـــــ

۷۔ سبحان ـــــ (گورکھپور)

۸۔ رسالہ ذخیرۃ الدینیہ۔ ـــــ جاذا

۹۔ جامعہ ملیہ ـــــ (علی گڑھ)

۱۰۔ ہمدم ـــــ (لکھنؤ)

۱۱۔ اسلامیکا ـــــ (جرمن)

۱۲۔ رسالہ ضیاء ـــــ (لکھنؤ)

۱۳۔ رسالہ النساء۔ ـــــ

۱۴۔ ہزار داستان۔ ـــــ

۱۵۔ رسالہ نور جہاں ـــــ

١٦۔ انڈین انٹی کیوری ۔۔ (انگریزی)
١٧۔ رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ ۔ (انگریزی)
١٨۔ زمانہ، ۔۔ ١٩۔ آبزرور (لاہور)
٢٠۔ ادیب، ۔۔ ٢١۔ تزک عثمانیہ۔ (حیدرآباد)
٢٢۔ کارامروز۔ (لکھنؤ) ٢٣۔ مسلم ورلڈ

٢٤۔ ڈیلی ایکسپریس۔ ——
٢٥۔ ایسٹرن ٹائمز (لاہور) ٢٦۔ الاحسان،
٢٧۔ نظام المشائخ —— (دہلی)
٢٨۔ مسلم آؤٹ لک —— (اخبار)
٢٩۔ علی گڑھ منتھلی، ٣٠۔ پیشوا —— (دہلی)

کتابیات

(الف) کتبِ اردو

نمبر شمار	کتاب	مصنف	ناشر	سنِ اشاعت
۱۔	آثارِ اقبال	غلام دستگیر رشید	حیدر آباد دکن	۱۹۴۶ء
۲۔	اقبالیاتِ مہدی	بیگم مہدی (مرتب)		
۳۔	اقبال (عطیہ بیگم فیضی)	ضیاء الدین احمد برنی (ترجمہ)	اقبال اکادمی کراچی	
۴۔	اقبال اور اس کا عہد	جگن ناتھ آزاد	ادارہ انیس الہ آباد	۱۹۶۰ء
۵۔	اقبال اور ان کا فلسفہ	آل احمد سرور	مکتبہ عالیہ لاہور	۱۹۷۷ء
۶۔	اقبال اور تحریکِ پاکستان	عاشق حسین بٹالوی	پنجاب یونیورسٹی لاہور	۱۹۶۷ء
۷۔	اقبال اور تصوف	محمد فرمان	بزم اقبال لاہور	
۸۔	اقبال اور سوشلزم	حنیف رامے (مرتب)	'البیان' لاہور	
۹۔	اقبال اور سوشلزم	ایس۔اے رحمٰن (مرتب)		
۱۰۔	اقبال اور سید سلیمان ندوی	طاہر تونسوی	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس	۱۹۷۹ء